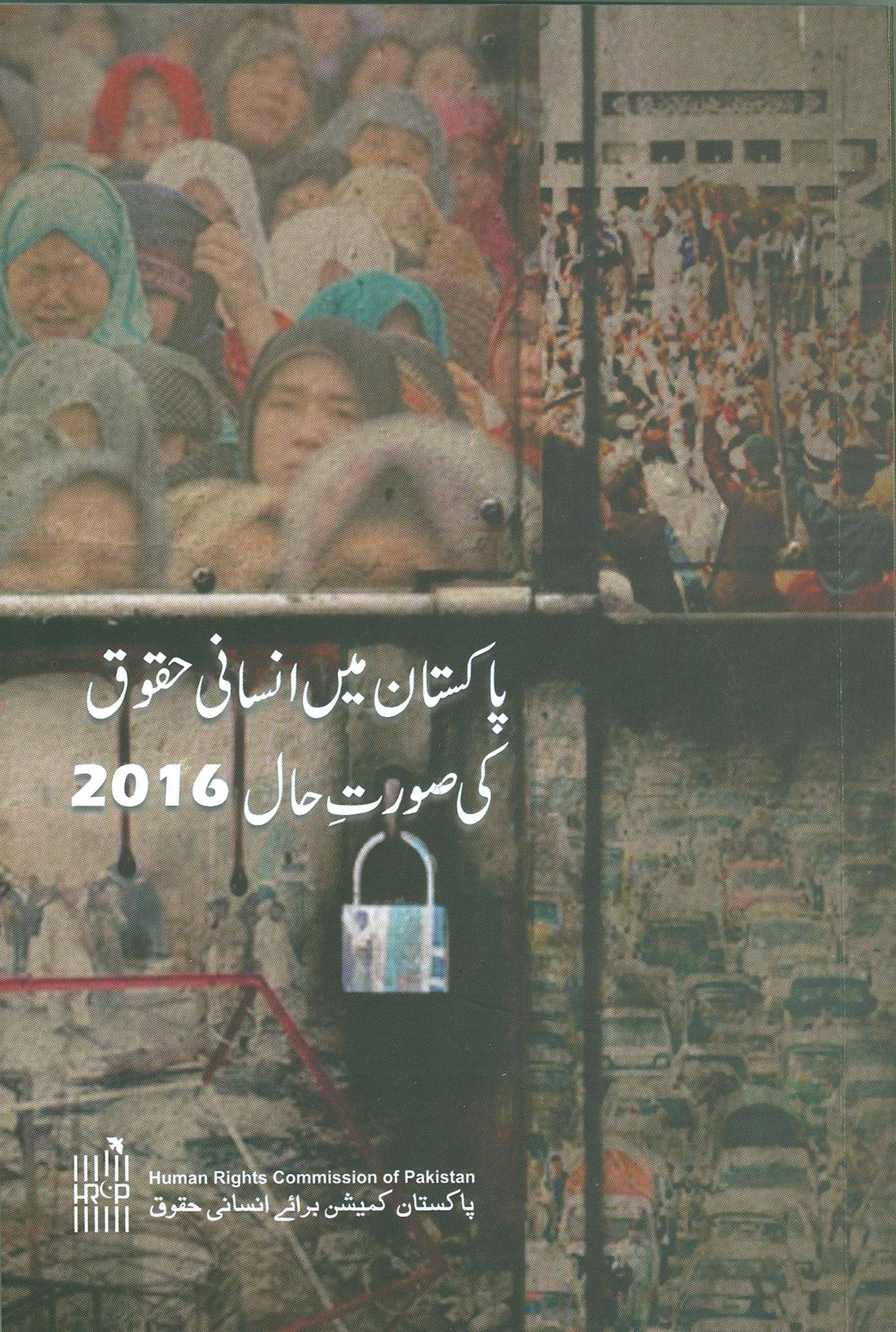

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتِ حال 2016

Human Rights Commission of Pakistan

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

2016

پاکستان میں
انسانی حقوق
کی صورتحال

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

ذرائع معلومات

ذرائع، جہاں متن یا حاشیہ میں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، ایچ آر سی پی کے جائزے پرمبنی رپورٹس، نامہ نگاروں اور عام شہریوں کے ساتھ خط و کتابت، سرکاری گزٹ، اقتصادی اور قانونی دستاویزات اور دیگر سرکاری اطلاعات اور بیانات، قومی اور علاقائی پریس میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور یواین ڈی پی، آئی ایل او، ڈبلیو ایچ او، یونیسف اور ورلڈ بنک جیسے عالمی اداروں کی مطبوعات پرمبنی ہیں۔ سرکاری رپورٹوں، پریس کے جائزوں اور این جی اوز کی نمونے کی سروے رپورٹوں کو ان کے محدود وسائل کے پیش نظر صورت حال کی مکمل یا حتمی تصویر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صرف سال کے دوران سامنے آنے والے رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔

ناشر

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور - 54600

فون : 92-042-35838341-35864994-35865969 فیکس : 92-042-35883582

ای میل : hrcp@hrcp-web.org

ویب سائٹ: www.hrcp-web.org

طابع

یوبی پرنٹرز

مشن روڈ، لاہور

اگست 2017

قیمت : = / 400 روپے

9 ڈالرز

6 پاؤنڈ

(علاوہ ڈاک خرچ)

ISBN No.978-969-8324-84-1

سرورق ڈیزائن: وژنریز ڈویژن، لاہور

متن کمپوزنگ: جمال احمد/سید رضا شاہ

فہرست

اختصارات ... i

تعارف ... 1

اہم نکات ... 3

1- قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی ... 15

عدل و انصاف کا انتظام و انصرام ... 33

2- قانون کا نفاذ

امن و امان کی صورت حال ... 55

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں ... 76

3- بنیادی آزادیاں

نقل و حرکت کی آزادی ... 97

فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی ... 108

اظہار رائے کی آزادی ... 130

اجتماع کی آزادی ... 153

انجمن سازی کی آزادی ... 168

4- فروغ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت ... 181

5- محروم طبقوں کے حقوق

خواتین ... 193

بچے ... 211

محنت کش ... 233

6- سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم ... 259

صحت ... 284

رہائشی سہولیات ... 305

ماحولیات ... 319

مہاجرین ... 329

ضمیمے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں ... 351

اہم مسائل پر کمیشن کا موقف ... 372

تعارف

2016ء میں پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال ملک کے آئین اور عالمی اقدار سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ 2016ء میں، جسمانی تشدد، جنسی تشدد، غیرت کے نام پر قتل، بچوں کی مشقت اوران کے ساتھ جنسی بدسلوکی کے خلاف قانون سازی کی گئی اور خواتین وبچوں کے تحفظ کی جانب کچھ پیش رفت ضرور ہوئی مگران کی ایک بڑی تعداد ابھی بھی تشدد اور بدسلوکی کا شکار تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آبادی کے ان غیر محفوظ حلقوں اور بے یارومددگار خواجہ سراء برادری کے تحفظ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ جب ان کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے بعد کوئی کارروائی کرلی جائے، بلکہ اس سوچ سے آگے بڑھ کر حقیقی معنوں میں مثبت اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

سویلین عدالتیں 30 لاکھ تصفیہ طلب مقدمات کے انبار کے چیلنج سے نبرد آزما رہیں۔ فوجداری نظام انصاف میں بہتری لانے کی بجائے، بعض جرائم سے نبٹنے کی خاطر، انصاف کا ایک متوازی نظام متعارف کروایا گیا اور ملزموں کے حقوق سے سمجھوتا کیا گیا۔ نظام انصاف سے مایوسی اور معاشرے کی بربریت کے باعث قانون ہاتھ میں لینے کے بیشتر واقعات پیش آئے۔ 87 افراد کو تختہ دار پر لٹکا کر پاکستان نے ان ممالک کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل کیا جو سزائے موت پر عملدرآمد میں سرفہرست ہیں۔ انصاف کی فراہمی کی صورتحال اس وقت بے نقاب ہوگئی جب عدالت عظمٰی نے دو افراد کو بری کیا جنہیں برسوں قبل پھانسی دی جا چکی تھی اور جس تیسرے فرد کی رہائی کا فیصلہ سنایا وہ 24 برس جیل میں گزار چکا تھا۔ قانون نافذ کرنے والوں کو زیر حراست ایذا رسانی، ماورائے عدالت قتل اور انسانی حقوق کی دیگر سنگین خلاف ورزیوں کے لیے بہت کم جوابدہ ٹھہرایا گیا۔

چار بنیادی آزادیاں: اظہار، معلومات، اجتماع اور انجمن کی آزادی بہت زیادہ زیرعتاب رہیں۔ حکومت نے سول سوسائٹی کی تنظیموں (سی ایس اوز) پر دباؤ ڈالنے، ان کا تشخص خراب کرنے اوران کی زبان بندی کرنے کے لیے سی ایس اوز کی ازسرنو رجسٹریشن اور ہر قسم کی سرگرمی کے لیے این او سی کے حصول جیسی شرائط کا اطلاق کیا۔ مسلح گروہوں نے ذرائع ابلاغ کے اداروں اور صحافیوں کو ان کے کام کی بدولت دھمکانے اور نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک مبہم اور انتہائی وسیع سائبر کرائم قانون نے اظہار کی آزادی پر پابندیاں عائد کیں اور حکام کو یہ اختیار دیا کہ وہ عدالتی نظر ثانی یا نگرانی سے بالاتر ہو کر انٹرنیٹ صارفین کے کوائف تک رسائی کرسکتے ہیں۔

مذہبی اقلیتوں کو حملوں، عدم تحفظ اور امتیازی سلوک کا سامنا رہا جبکہ حکومت انہیں تحفظ فراہم کرنے یا مجرموں کو جوابدہ ٹھہرانے میں ناکام رہی۔ صوبائی حکومتوں نے مقامی حکومتوں کو اختیارات کی منتقلی سے انکار کا سلسلہ جاری رکھا۔ متعلقہ فریقین نے انتخابی اصلاحات میں بہت کم دلچسپی دکھائی۔

صحت اور تعلیم کی دستیابی پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جو ناخواندگی میں سرفہرست ہیں، خاص طور پر خواتین اور لڑکیوں کی ناخواندگی کے حوالے سے۔ ملک شیر خوار اور نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات کے حوالے سے بھی انتہائی نچلے درجے پر پہنچ چکا ہے اور تقریباً 44 فیصد بچے ناقص نشوونما کا شکار تھے۔ معذور افراد کو انتہائی کم سہولیات میسر تھیں۔ پولیو کے کیسز میں اگرچہ کمی آئی۔ 2015ء میں 54 پولیو کیسز کے مقابلے میں 2016ء میں 20 کیسز سامنے آئے مگر پاکستان پولیو سے پاک قوم بننے کا ہدف حاصل نہ کر سکا۔

حکام نے مزدوروں کے مفادات اور فلاح و بہبود سے بھی چشم پوشی کی اور اس حقیقت کی نشاندہی گڈانی شپ بریکنگ یارڈ میں پیش آنے والے حادثے میں متعدد مزدوروں کی ہلاکت اور کانوں میں مرنے والے مزدوروں سے حکومت کی لاتعلقی سے بھی ہوئی ہے۔ اوکاڑہ، پنجاب کے کسانوں کو اراضی کے حقوق کے لیے احتجاج سے روکنے کے لیے حکام نے انسداد دہشت گردی قوانین اور سخت ہتھکنڈوں کا استعمال کیا۔ انسانی حقوق کے قومی ادارے کے حوالے سے کسی قسم کی کارکردگی کا مظاہرہ اور مشاورت بھی نظر نہ آئی جس کی توقع کی جارہی تھی۔

2016ء میں شدت پسندی کے پرتشدد واقعات میں گزشتہ برس کی نسبت کمی آئی مگر مزارات اور مساجد میں جانے والوں، وکلاء، سکیورٹی اہلکاروں، ہیلتھ ورکرز، طالبعلموں اور صحافیوں کو خاص طور پر نشانہ بنانے کے واقعات میں اضافہ ہوا جس سے حکام کی استعداد پر سوالات کھڑے ہونا شروع ہوئے کہ وہ شدت پسندوں کے خلاف کئی آپریشنوں کے باوجود ان پر قابو پانے میں ناکام کیوں ہیں، چنانچہ دہشت گردی کے خلاف اہم کامیابیوں کے دعووں کے باوجود لوگوں کا یہ خواب ہی رہا کہ وہ خوف کے بغیر زندگی بسر کریں۔

ملک میں 90 لاکھ سے زائد رہائشی یونٹوں کی قلت کے باعث رہائشی سہولیات کے فقدان کا بحران اور زیادہ سنگین صورت اختیار کر گیا جبکہ سستی رہائشی سہولیات کے منصوبے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ملک پر موسمیاتی تبدیلی کے شدید اثرات مرتب ہوئے مگر صورتحال سے نپٹنے اور نقصانات سے کمی لانے کی کوئی سعی نہیں کی گئی۔ سال 2016ء کو نقل مکانی کرنے والے لوگوں کی وطن واپسی کا سال قرار دیا گیا مگر ان کی پائیدار وطن واپسی کا خواب حقیقت نہ بن سکا۔ وہ تباہ شدہ گھروں، انفراسٹرکچر، روزگار اور معیشت کی طرف واپس لوٹے۔ پولیس کے دباؤ، بدسلوکی، اور مسئلے کے پائیدار حل کے فقدان نے پاکستان میں پناہ گزین لاکھوں افغان مہاجرین کو افغانستان واپس لوٹنے یا کسی اور ملک جانے پر مجبور کیا۔

قانون کی حکمرانی کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور منصفانہ قانونی کارروائی سے انحراف کی موجودہ فضا میں انسانی حقوق کے کارکنوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو انسانی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے نئے راستے تلاش کرنا ہوں گے۔

وقار مصطفٰی

مدیر

اهم نکات

قوانین اور قانون سازی

- وفاقی پارلیمنٹ نے 2016ء میں 51 قوانین بنائے۔ یہ تعداد گزشتہ سال کے 20 قوانین کے مقابلے میں دگنی سے بھی زیادہ تھی۔
- صدر کی جانب سے جاری کیے گئے آرڈیننس کی تعداد جو 2015ء میں 12 تھی، 2016ء میں کم ہو کر چھ رہ گئی۔
- خیبر پختونخوا نے سب سے زیادہ 30 قوانین وضع کیے جبکہ اس کے بعد سندھ، پنجاب اور بلوچستان کا نمبر آتا ہے۔

انصاف کا انتظام وانصرام

- 2016ء میں ملک بھر کی عدالتوں میں تقریباً تیس لاکھ مقدمات زیر التوا تھے۔
- ججوں اور وکلاء کے خلاف تشدد کے واقعات کے باعث شعبہ قانون سے وابستہ افراد میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا۔
- توہین مذہب کے الزام میں 15 افراد کے خلاف مقدمات درج کیے گئے جن میں 10 مسلمان اور پانچ غیر مسلم شامل تھے۔ دو مسلمانوں اور دو مسیحیوں کو توہین مذہب کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی۔ لاہور ہائی کورٹ نے توہین مذہب کے ایک ملزم کو رہا کر دیا جو چار سال سے جیل میں تھا۔
- دو افراد جنہیں ایک سال پہلے پھانسی دی جا چکی تھی، انہیں سپریم کورٹ نے اکتوبر میں بے گناہ قرار دیا۔ اکتوبر ہی میں سپریم کورٹ نے 19 سال بعد قتل کے ایک ملزم کی رہائی کا حکم دیا جو دو سال پہلے وفات پا چکا تھا۔

امن وامان

- 2016ء میں پاکستان میں دہشت گردی کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں میں 2015ء کے مقابلے میں 45 فیصد کمی واقع ہوئی۔
- 2016ء میں ہونے والے حملوں میں سے 48 فیصد میں، یعنی 211 حملوں میں سکیورٹی فورسز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو نشانہ بنایا گیا۔ بلوچستان اور سندھ میں ہونے والے متعدد بم دھماکوں اور فائرنگ کے زیادہ تر واقعات کی ذمہ داری آئی ایس آئی ایس نے قبول کی۔
- گلگت بلتستان میں، 2016ء میں درج کیے گئے قتل کے 23 مقدمات میں سے 13 کا تعلق غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم سے تھا۔ خیبر پختونخوا میں 2016ء کے پہلے 10 ماہ میں کم از کم 187 خواتین قتل ہوئیں جن میں سے 40 کو غیرت کے نام پر مارا گیا۔ پنجاب میں جنسی زیادتی، اجتماعی جنسی زیادتی اور اغوا کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ کراچی میں 2016ء میں بینک ڈکیتیوں، چوری اور موٹر سائیکل اور موبائل فون چھیننے کے واقعات میں اچانک اضافہ دیکھنے میں آیا۔
- انسانی حقوق کے تین کارکنوں کو قتل کیا گیا۔ پنجاب پولیس کا کہنا تھا کہ انہوں نے کم از کم 291 ''پولیس مقابلوں'' میں مختلف جرائم میں ملوث 340 افراد کو ہلاک کیا۔ سندھ پولیس کا کہنا تھا کہ سندھ میں ہونے والے پولیس مقابلوں میں 248 ڈاکو اور جرائم میں ملوث دیگر افراد، 96 دہشت گرد اور 11 اغواء کار مارے گئے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مختلف چھاپوں کے دوران بلوچستان میں 229، فاٹا میں 60، خیبر پختونخوا میں 40 اور گلگت بلتستان میں چار مبینہ دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔

جیلیں، قیدی اور جبری گمشدگیاں

- پاکستان کی جیلوں میں 84,315 قیدی تھے۔ پنجاب کی جیلوں میں 23,617 قیدیوں کی گنجائش کے مقابلے میں 49,603 قیدی، سندھ میں 12,245 کی گنجائش کے برعکس 20,308 قیدی، اور خیبر پختونخوا میں 7,547 کی گنجائش کے

مقابلے میں 11,200 قیدی تھے۔

- جیلوں میں قید 1,497 خواتین میں سے 920 پنجاب، 249 سندھ، 309 خیبر پختونخوا، 18 بلوچستان اور ایک گلگت بلتستان کی جیل میں قید تھیں۔
- 2016ء میں 487 افراد کو موت کی سزا سنائی گئی جبکہ 87 کو پھانسی دی گئی۔
- جبری گمشدگیوں سے متعلق کمیشن کے مطابق 2016ء میں مزید 728 پاکستانی لاپتہ افراد کی فہرست میں شامل ہوئے۔ یہ تعداد کم از کم چھ سالوں میں سب سے زیادہ ہے۔

نقل و حرکت کی آزادی

- 2016ء میں نقل و حرکت کی آزادی کو رکاوٹوں کا سامنا رہا جس کی سب سے بڑی وجہ امن و امان کی خراب صورتحال، شدت پسندی اور شورش کے خاتمے کے لیے کیے گئے اقدامات اور قدرتی آفات تھیں۔
- خواتین، خواجہ سراؤں اور چند مذہبی اقلیتی برادریوں کو سفر کے دوران خطرات کا سامنا رہا۔
- عدالت عظمیٰ نے اندرون اور بیرون ملک سفر پر عائد پابندیوں سے متعلق متعدد مقدمات کی سماعت کی۔ ایسے ہی ایک مقدمے میں عدالت عظمیٰ نے اس بات پر زور دیا کہ نقل و حرکت کی آزادی ایک بنیادی آئینی حق ہے جس کی ہر شہری کو ضمانت دی گئی ہے، جسے پسند اور ناپسند کی بنیاد پر محدود یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔

سوچ، ضمیر اور مذہب کی آزادی

- 2016ء میں چار احمدیوں کو قتل کیا گیا جن میں سے تین ڈاکٹر تھے۔ ملک میں مسیحیوں کے خلاف تشدد کے کئی واقعات دیکھنے میں آئے۔ ہندو برادری کی جانب سے زمینوں پر قبضے، حملوں، اغواء، جبری تبدیلیٔ مذہب، مندروں کی بے حرمتی، جنسی زیادتی اور قتل کی شکایات سامنے آئیں۔
- سندھ اسمبلی نے سندھ ہندو میرج ایکٹ کی منظوری دی تا کہ ہندو، سکھ اور زرتشتی اپنی شادی کا اندراج کرا سکیں۔
- سال کے دوران 30 سے زائد حملوں میں، شدت پسندوں نے مختلف فرقوں سے

تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جن میں سنی، شیعہ، بشمول ہزارہ اور بُوہرا برادری کے افراد شامل تھے۔شدت پسندوں نے عبادت گاہوں اور مزاروں کو بھی نشانہ بنایا۔ان حملوں میں تقریباً 110 افراد ہلاک اور 162 زخمی ہوئے۔

اظہار رائے کی آزادی

- چھ صحافیوں اور ایک بلاگر کے قتل اور بعض خبروں کی گردش نے ذرائع ابلاغ کے لیے خوف کی فضا میں اضافہ کیا اور اس سے ذرائع ابلاغ کی خودساختہ سنسر شپ کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا۔
- سائبر قانون نے سرکاری عہدیداروں پر تنقید کا دائرہ کار محدود کرنے کا تقاضا کیا اور اس قانون کے تحت حکام کو صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور انسانی حقوق کے کارکنوں سمیت تمام شہریوں کی الیکٹرانک ذرائع ابلاغ پر ہونے والی گفت وشنید کی جاسوسی کرنے کا اختیار دیا گیا۔
- سول سوسائٹی کے کارکنوں کو امن کا پرچار کرنے کے باعث سوشل میڈیا میں ہتک آمیزی کا سامنا کرنا پڑا۔
- 2016ء میں میڈیا ہاؤسز، ٹی وی چینلوں، اخبارات کے دفاتر اور پریس کلبوں پر مذہبی وسیاسی شدت پسند گروہوں کے حملوں میں پریشان کن اضافہ دیکھنے کو ملا۔

اجتماع کی آزادی

- حکومت نے اپنی من مرضی کرتے ہوئے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 144 جیسے قوانین نافذ کیے۔
- حکومت کے طاقت پر انحصار سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوئی کہ اس کے پاس ہجوم کو کنٹرول کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔سڑکوں اور شاہراہوں کی بندش سے شہریوں کا عوامی راستوں پر سفر کرنے کا بنیادی حق متاثر ہوا۔
- مظاہرین کی طرف سے تشدد کا ارتکاب کرنے اور راستے بند کرنے سے لوگوں کی نقل وحرکت کی آزادی متاثر ہوئی اور کئی مریض وقت پر ہسپتال نہ پہنچنے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔

- سیاسی ریلیوں میں خواتین کی جنسی ایذادہی سے نہ صرف افسوسناک رویے کی نشاندہی ہوئی ہے بلکہ اس سے سیاسی اجتماعات پر سکیورٹی کے موثر بندوبست کا فقدان بھی اجاگر ہوا ہے۔

انجمن سازی کی آزادی

- گھروں میں رہ کر کام کرنے والے مزدوروں، طالب علموں اور غیر رجسٹرڈ مزدوروں کو انجمن سازی کا حق دینے کا دیرینہ مطالبہ منظور نہ ہو سکا۔
- وکلاء کو اُس وقت ایک بہت بڑے سانحے سے دوچار ہونا پڑا جب بلوچستان بار ایسوسی ایشن کو ایک تباہ کن حملے میں اپنے 70 اراکین سے محروم ہونا پڑا تھا۔
- ریاست نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر این جی اوز کے کام میں غیر ضروری مداخلت کا سلسلہ جاری رکھا۔

سیاسی عمل میں شرکت

- پنجاب اور سندھ میں 2013ء میں بننے والے بلدیاتی حکومت کے قوانین کو نافذ ہونے میں تین برس لگے۔
- انتخابی فہرستوں کی نظرثانی سے ملک گیر سطح پر پائے جانے والے 12.52 فیصد جنسی فرق کی حقیقت منظر عام پر آئی۔ انتخابی رجسٹر میں پانچ کروڑ، 45 لاکھ، نوے ہزار (54.59 ملین) مرد ووٹروں کے مقابلے میں خواتین ووٹروں کی تعداد چار کروڑ، 24 لاکھ، 20 ہزار (42.42 ملین) درج تھی۔
- انتخابی اصلاحات اور فاٹا اصلاحات کو قانونی دستاویزات کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ابھی تک پارلیمانی منظوری کے مرحلے سے گزرنا تھا۔

خواتین

- خواتین کے تحفظ کے نظام کو مستحکم کرنے کے لیے متعدد قوانین منظور ہوئے، تاہم خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات میں نمایاں کمی دیکھنے کو نہ مل سکی۔
- افرادی قوت میں سے 64 برس کی عمر کی خواتین کا حصہ 26 فیصد تھا جس سے مراد یہ ہے کہ تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ (14 ملین) خواتین افرادی قوت میں شامل تھیں

اور کسی بھی صنعت یا شعبے نے 30 فیصد سے زائد خواتین کو اپنے ہاں کام کرنے کا موقع نہ دیا۔

- خواتین کی معاشی خودمختاری کا گوشوارہ جو کہ پاکستان میں اس نوعیت کا پہلا گوشوارہ ہے، کے مطابق پنجاب نے 0.52 اسکور کے ساتھ سب سے اچھی کارکردگی دکھائی جس کے بعد دوسرے نمبر پر سندھ (0.38)، تیسرے پر کے پی (0.35) اور چوتھے پر بلوچستان (0.26) تھا۔ وفاق نے ایک میں سے 0.39 سکور حاصل کئے۔
- مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعلیم کی سطح بہت پست رہی۔خواتین کی متوقع عمر 2005 سے 2015 کے مقابلے میں 4 برس کے اضافے کے ساتھ 67.3 ہوگئی تاہم کئی ہلاکتیں ایسی بیماریوں سے ہوئیں جن سے بچاؤ ممکن تھا۔
- ایچ آر سی پی نے ذرائع ابلاغ میں چھپنے اور نشر ہونے والی اطلاعات کی مانیٹرنگ کی جس سے معلوم ہوا کہ 2016ء میں 2500 خواتین کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔جنسی و گھریلو تشدد کا نشانہ بنانے کے علاوہ انہیں جلایا گیا اور اغواء کیا گیا۔

بچے

- 44 فیصد بچے ناقص افزائش کا شکار ہوئے۔
- دنیا بھر میں 26 کروڑ، تیس لاکھ (263 ملین) کمسن، بالغ بچے اور نوجوان اسکول نہیں جاتے جن میں سے 9 فیصد (دو کروڑ، چالیس لاکھ) کا تعلق پاکستان سے ہے۔
- بچوں کے خلاف جنسی حملے، بچوں کی فحش نگاری اور اسمگلنگ کو جرم قرار دیا گیا۔ 2016ء میں جنسی بدسلوکی کے کل 4139 واقعات پیش آئے جن میں بچوں کے اغواء، گمشدگی اور کم عمری کی شادی کے واقعات بھی شامل تھے۔اس تناسب سے ہر دن بچوں کے ساتھ بدسلوکی کے 11 واقعات پیش آئے اور ان میں 2015ء کی نسبت 10 فیصد اضافہ ہوا۔
- کئی بچوں کو جبری مشقت اور جنسی مقاصد کے لئے کی گئی اسمگلنگ کے ذریعے استحصال کا بدستور نشانہ بنایا جاتا رہا۔

محنت کش

- پاکستان کی 6 کروڑ، 10 لاکھ (61 ملین) سے زائد افرادی قوت کو معاشی حرکیات اور مزدوروں کے حقوق کے تحفظ پر مامور کمزور اداروں کی بدولت تیز رفتار تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا۔
- مزدوروں کی صحت اور سلامتی اور بچوں کی مشقت کی روک تھام (پنجاب میں) کے لیے بعض قوانین منظور کیے گئے، تاہم مزدوروں کے حقوق کے نظام میں بہتری لانے میں ناکامی، قانون کے نفاذ میں ناکامی، سہ فریقی طریقہ کار کے بدستور تعطل، اور یونین سازی کا حق دینے سے انکار کی بدولت مزدوروں کے حقوق کی پامالی میں اضافہ ہوا ہے۔
- مزدوروں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی اور انہیں اس عمل میں ریاست کو بھی شامل کرنا پڑا جو مزدوروں کے تحفظ کی ذمہ داری سے تقریباً دستبردار ہوچکی تھی۔
- ایسی کئی شکایات سامنے آئیں کہ مزدوروں کو مقرر کردہ کم از کم 14000 روپے ماہانہ معاوضہ نہیں دیا جا رہا۔

تعلیم

- اسکول سے باہر بچوں کی تعداد اڑھائی کروڑ سے کم ہو کر دو کروڑ چالیس لاکھ اور بالغوں کی شرح خواندگی 58 فیصد سے کم ہو کر 56.4 فیصد رہ گئی۔
- ملک میں تقریباً 48 فیصد اسکولوں میں بیت الخلاء، چار دیواریاں، بجلی اور پینے کا صاف پانی موجود نہیں تھا۔
- وفاقی اور دو صوبائی حکومتوں - پنجاب اور بلوچستان - نے تعلیم کے شعبے کے لیے اپنا بجٹ کم کر دیا حالانکہ ان صوبوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تعلیم کو ترجیح دے رہے ہیں۔
- صوبے یا تو بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے حق سے متعلق قانون بنانے یا پھر قانون کے من وعن نفاذ میں ناکام رہے۔
- 2015ء کی طرح 2016ء میں بھی ذہنی معذور طالب علموں کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

صحت

- پاکستان نے جی ڈی پی کا محض 0.9فیصد صحت پر خرچ کیا اور ملک میں 1,038افراد کے لیے ایک ڈاکٹر، 1,613مریضوں کے لیے ایک بستر اور 11,513افراد کے لیے ایک دندان ساز موجود تھا جو انتہائی ناکافی تھے۔
- یونیسیف کے مطابق، پاکستان شیر خوار اور نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات کے لحاظ سے انتہائی حوصلہ شکن صورتحال کی جانب گامزن ہے۔
- ملک میں تقریباً پانچ کروڑ افراد مختلف نفسیاتی مسائل کا شکار تھے، لیکن ملک میں صرف 320ماہرین نفسیات اور نفسیاتی امراض کے صرف پانچ ہسپتال موجود تھے۔
- پاکستان میں میں وائلڈ پولیو وائرس ٹائپ 1 (ڈبلیو پی وی) کا انتقال جاری رہا اور 2016میں، ملک میں پولیو کے 20 کیسز سامنے آئے۔

رہائشی سہولیات

- جعلی رہائشی سوسائٹیاں آگاہی کی مہمات اور کریک ڈاؤن کے باوجود کام کرتی رہیں۔
- کچی آبادیاں خالی کرانے کی سرکاری کارروائیاں صرف پاکستان کو درپیش ہاؤسنگ کے بحران کو ہی بے نقاب کرسکیں۔
- حکومت کی جانب سے شہریوں کو رہائشی سہولیات کی فراہمی کے حوالے سے گزشتہ سال کے مقابلے میں معمولی سی بہتری دیکھنے کو ملی۔
- کئی افسوس ناک واقعات ہاؤسنگ کے عمل میں رکاوٹ بنے۔

ماحولیات

- جرمن واچ کے عالمی موسمی خطرات کے گوشوارے 2017ء کے مطابق پاکستان ان سات ممالک میں شامل ہے جنہیں موسمی تبدیلی کے باعث سب سے زیادہ خطرات کا سامنا ہے۔
- پاکستان کو ماحولیاتی تنزلی کے نقصانات کے باعث ہر سال اپنے جی ڈی پی کے 9فیصد سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے۔

- 80 فیصد پاکستانی آلودہ یا غیر محفوظ پانی پی رہے تھے۔
- پاکستان ان 10 ممالک میں شامل تھا جہاں کے شہری علاقوں کی اکثریت صحت وصفائی کی سہولت سے محروم تھی۔
- عالمی ادارہ صحت کی 2016ء کی رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ فضائی آلودگی والے شہروں کی فہرست میں پشاور کا دوسرا جبکہ راولپنڈی کا چوتھا نمبر تھا۔

مہاجرین

- 2016ء میں 381,275 رجسٹرڈ افغان مہاجرین نے وطن واپسی کا فیصلہ کیا۔ سب سے بڑی تعداد (308,171) خیبرپختونخوا سے گئی۔ 241,745 غیر رجسٹرڈ افغان بھی آئی او ایم کی مدد سے وطن واپس گئے۔
- افغانستان وطن واپس جانے والے رجسٹرڈ افغان گھرانوں میں سے 10 فیصد گھرانوں کی سربراہ عورتیں تھیں۔
- 2016ء میں رجسٹرڈ مہاجرین کی وطن واپسی کی حتمی مدت میں دوبار توسیع کی گئی۔
- زیر نظر سال کے دوران نقل مکانی کرنے والے کم از کم 700,000 افراد (نقل مکانی کرنے والے 1140511 گھرانے) اپنے آبائی علاقوں کی طرف لوٹے۔ 76,507 گھرانے بدستور نقل مکانی جیسے حالات میں تھے۔
- 2010ء سے گلگت بلتستان میں نقل مکانی کرنے والے تقریباً 3000 افراد تقریباً نصف درجن آئی ڈی پی خیموں میں تھے۔
- بنگلہ دیش میں پھنسے تقریباً اڑھائی لاکھ پاکستانیوں کی اذیت ختم کرنے کے لیے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

1

قانون کی حکمرانی

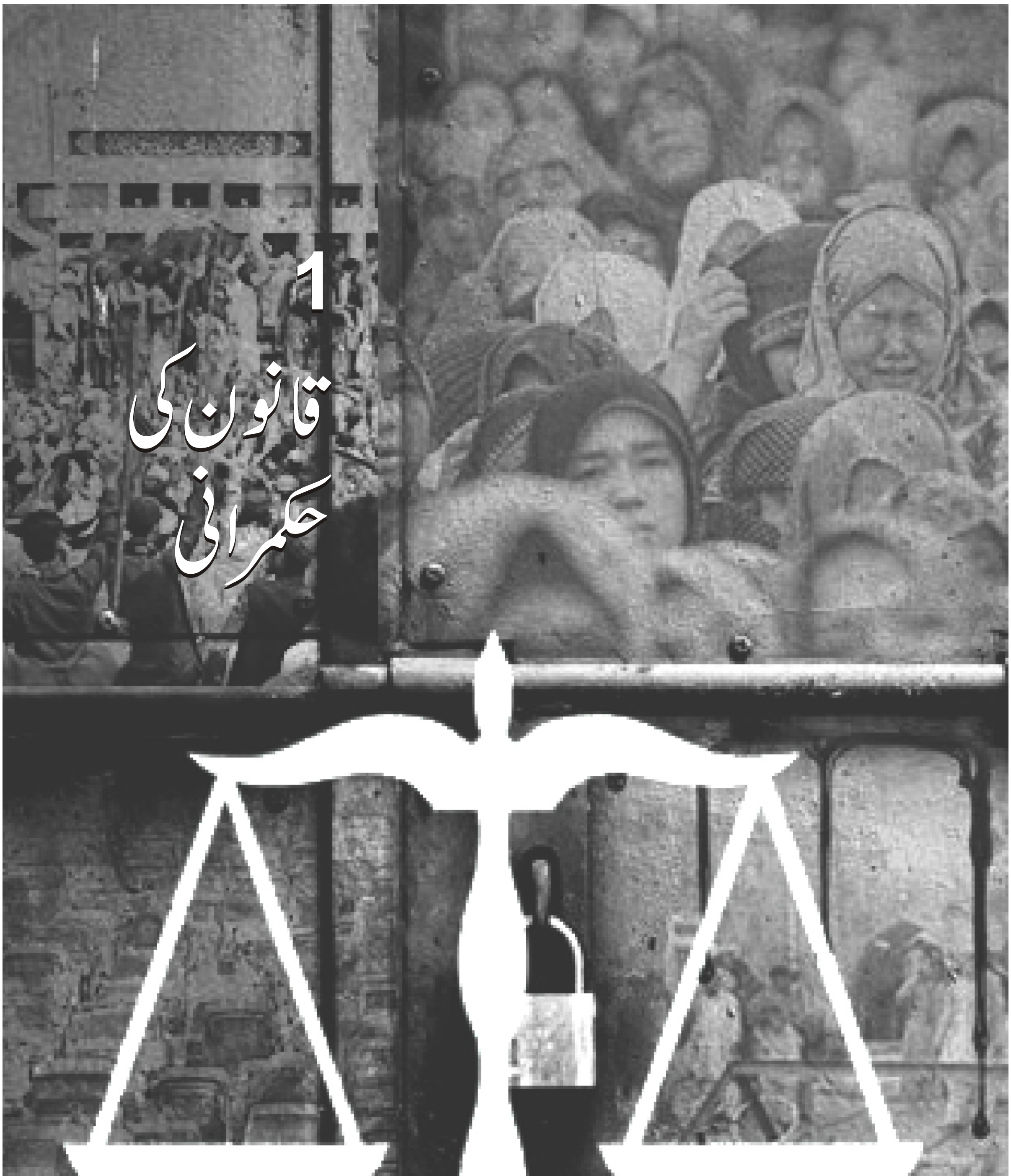

قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی

قانون اور اخلاقیات کے تابع رہتے ہوئے تمام بنیادی حقوق، بشمول رتبے، مواقع، قانون کی نظر میں برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور فکر، اظہار، عقیدہ، ایمان، عبادت اور اجتماع کی آزادیاں، قانون کے مطابق اور اخلاق عامہ کے مفاد میں عائد پابندیوں کے ساتھ مہیا کرنے کی ضمانت دی جائے گی۔ عدلیہ کی آزادی کو مکمل طور پر یقینی بنایا جائے گا۔

آئین پاکستان

[افتتاحیہ]

قانونی تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا بنیادی اور ناقابل تنسیخ حق ہے، چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر اس شخص کا بھی جو عارضی طور پر پاکستان میں مقیم ہو۔

[آرٹیکل - 4]

کوئی قانون یا کوئی رسم یا رواج، جسے قانون کی حیثیت حاصل ہو اگر ان حقوق سے متصادم ہے جو اس باب [بنیادی حقوق] کے تحت شہریوں کو حاصل ہیں، تو وہ اس میں پائے جانے والے تضاد کی حد تک منسوخ تصور کیا جائے گا۔

[آرٹیکل- 8 (1)]

اگر انسان کو اس بات پر مجبور کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ آخری چارہ کار کے طور پر ظلم اور ناانصافی کے خلاف خود علم بغاوت بلند کرے، تو لازم ہے کہ قانون کی حکمرانی کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[افتتاحیہ]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر یا آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل - 21 (1)]

وفاقی پارلیمان نے 2016 میں 21 قوانین منظور کیے۔ گزشتہ برس کے مقابلے میں یہ تعداد زیادہ ہے گزشتہ برس 20 قوانین منظور ہوئے تھے۔ تاہم صدرِ مملکت کے نافذ کردہ آرڈیننس کی تعداد کم ہوئی ہے۔ 2015 میں صدارتی آرڈیننس کی تعداد 15 جبکہ 2016 میں چھ تھی۔

آئین میں اٹھارہویں ترمیم کے تحت اپنے بڑھنے والے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے، صوبوں نے کئی اہم قوانین منظور کیے۔ صوبائی مجالس قانون ساز نے سال 2016 میں 81 قوانین منظور کیے جو کہ گزشتہ برس منظور ہونے والے 120 قوانین کے مقابلے میں

بہت کم ہیں۔ تمام صوبوں نے گزشتہ برس کی نسبت کم قانون سازی کی ہے۔ 30 قوانین کی منظوری کے ساتھ خیبر پختونخوا پہلے نمبر پر تھا جس کے بعد بالترتیب سندھ، پنجاب اور بلوچستان کی باری آتی ہے۔ صوبائی اسمبلیوں کی قانون سازی کی درجہ بندی 2015 اور 2014 جیسی ہی تھی۔

وفاقی بجٹ جون میں مالیاتی قانون کی شکل میں منظور ہوا جس کے بعد صوبائی بجٹ منظور کیے گئے۔

2015 میں قصور میں بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کے واقعے اور ملک کے دیگر حصوں میں اس نوعیت کے واقعات کے متعلق ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے بعد، پارلیمان نے فروری میں فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2016 منظور کیا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کی سمگلنگ اور فحش نگاری کو جرم قرار دے کر بچوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کی سزا میں اضافہ کیا جائے۔

اگست میں الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا قانون 2016 منظور ہوا جو کہ ایک متنازعہ قانون ہے۔ اس کا نفاذ اگرچہ الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کے لیے کیا گیا تھا، تاہم ماہرین نے اس کی مبہم زبان کی وجہ سے اسے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس قانون کی مبہم زبان کی بدولت اس کے ناجائز استعمال کے امکانات زیادہ ہیں۔ سول سوسائٹی کی کئی تنظیموں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کا خیال تھا کہ اس قانون نے بعض انسانی حقوق پر پابندیاں لگائی ہیں اور اظہار کی آزادی کو محدود کیا ہے۔

الیکشن کمیشن پاکستان (ای سی پی) کے چار اراکین کی ریٹائرمنٹ سے دو دن قبل، آئینی (بائیسویں ترمیم) ایکٹ 2016 منظور کیا گیا۔ اس قانون نے اعلیٰ عدلیہ کے حاضر سروس یا ریٹائرڈ ججوں کے علاوہ بیوروکریٹس، حکومتی افسران اور ٹیکنوکریٹس کو بھی چیف الیکشن کمشنر اور الیکشن کمیشن پاکستان کا رکن بننے کا اہل قرار دیا ہے۔

فافن کے مرتب کردہ کوائف کے مطابق، قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی ہونے کی وجہ سے پاکستان مسلم لیگ۔ نواز شریف (پی ایم ایل۔ این) نے اقتدار میں آنے سے لے کر اب تک اسمبلی میں متعارف ہونے والے 49 نجی بلوں میں سے کسی ایک بل کو بھی قانون کا درجہ حاصل نہیں کرنے دیا۔

سندھ اسمبلی نے ہندو میرج ایکٹ 2016 منظور کیا جو طویل عرصہ سے اسمبلی میں پڑا ہوا تھا۔ اس قانون سازی کی بدولت پاکستان میں پہلی مرتبہ ہندو میرج قانون بنا ہے۔ ہندو برادری طویل عرصہ سے اس کی منظوری کی منتظر تھی کیونکہ اس قانون کی عدم موجودگی میں وہ اپنی

شادی کو ثابت نہیں کر سکتے تھے اور متعدد مشکلات کا سامنا کر رہے تھے۔

پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی اسمبلیوں نے بالترتیب خواتین کو تشدد سے تحفظ کا ایکٹ منظور کیا گیا۔ پنجاب ایکٹ 2016، خیبر پختونخوا کمیشن برائے حقوقِ نسواں اور کام کے مقام پر خواتین کو ایذا رسانی سے تحفظ کا بلوچستان ایکٹ 2016 منظور کیا۔ ان قوانین کا مقصد خواتین اور اُن کے حقوق کو تحفظ دینا تھا۔

پنجاب اسمبلی نے صوبے میں بچوں کی مشقت اور جبری مشقت کی روک تھام کے لیے بچوں کے روزگار پر پابندی کا ایکٹ 2016 اور بھٹوں پر بچوں کی مشقت کے امتناع کا ایکٹ 2016 منظور کیا۔ یہ دونوں قوانین طویل مدت سے التوا کا شکار تھے۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی اسمبلیوں نے بھی بچوں کے تحفظ اور بہبود کے لیے قوانین منظور کیے۔

سندھ اسمبلی نے صوبے میں جبری مشقت کے خاتمے کے لیے ایک قانون منظور کیا۔ دوسری اہم قانون سازی سندھ ایمپلائز سوشل سکیورٹی ایکٹ 2016 تھی جس کا مقصد سماجی تحفظ کی اسکیم میں بہتری لانا تھا تاکہ بعض ملازمین اور اُن کے زیرِ کفالت افراد اس اسکیم سے مستفید ہوسکیں۔

سندھ حکومت نے بزرگ شہریوں کی بہبود کے لیے ایک انتہائی ضروری قانون منظور کیا۔ سندھ بزرگ شہری بہبود ایکٹ 2014 میں بزرگ شہریوں کو دی جانے والی سہولیات میں اُن کے لیے اقامت گاہوں کا قیام، طبی سہولیات اور ہسپتالوں میں خاص رعائتیں شامل ہیں۔ اُنہیں پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کے کرایوں اور تفریحی مراکز کی فیس میں کمی جیسی سہولیات بھی میسر ہوں گی۔

پارلیمان کے قوانین

☆ وفاقی عدالتی اکادمی (ترمیمی) ایکٹ، 2016؛ جنوری؛ اس کا مقصد وفاقی عدالتی ایکٹ 1997ء میں ترمیم کرنا تھا۔

☆ اسلام آباد ماتحت عدلیہ سروس ٹربیونل ایکٹ، 2016ء؛ جنوری؛ اس کا مقصد اسلام آباد ماتحت عدالتی ٹربیونل کا قیام تھا۔

☆ انکم ٹیکس (ترمیمی) ایکٹ، 2016؛ جنوری؛ انکم ٹیکس آرڈیننس، 2001 میں ترمیم لانے کے لیے۔

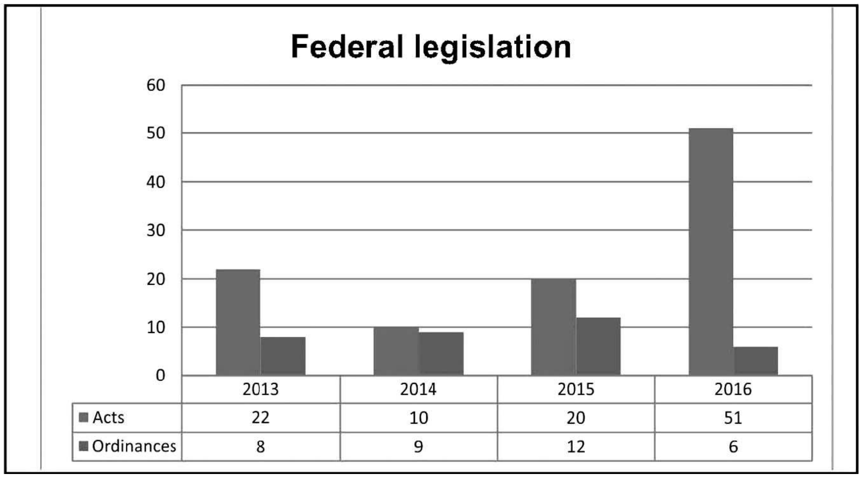

☆ انکم ٹیکس (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، 2016، جنوری; انکم ٹیکس آرڈیننس، 2001 میں مزید ترمیم لانے کے لیے

☆ انکم ٹیکس (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2016; جنوری; انکم ٹیکس آرڈیننس، 2001 میں مزید ترمیم لانے کے لیے۔

☆ فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; فروری; بچوں کی سمگلنگ اور فحش نگاری کو جرم قرار دے کر بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں متعارف کروانے کے لیے۔

☆ بے ہنر مزدوروں کے لیے کم از کم اجرت کا (ترمیمی) ایکٹ، 2016، فروری، اسلام آباد دارالحکومتی علاقے کی حد تک بے ہنر مزدوروں کی کم از کم تنخواہ کے آرڈیننس 1969 میں ترمیم لانے کے لیے۔

☆ پاکستان حلال اتھارٹی ایکٹ، 2016، فروری; پاکستان حلال اتھارٹی کے قیام کے لیے تا کہ حلال مصنوعات اور سرگرمیوں کی تجارت کو فروغ دیا جا سکے۔

☆ سول سرونٹس (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; مارچ; سول سرونٹس ایکٹ 1973 میں ترمیم کے لیے۔

☆ فوجداری قانون (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; مارچ; ضابطہ تعزیرات پاکستان 1860 اور مجموعہ ضابطہ تعزیرات 1898 میں مزید ترمیم کے لیے۔

- ☆ پاکستان ہیلتھ ریسرچ کونسل ایکٹ 2016 ; مارچ; پاکستان ہیلتھ ریسرچ کونسل کی تشکیل نو اور تنظیم نو کے لیے،
- ☆ گیس (چوری پر کنٹرول اور واجبات کی وصولی) ایکٹ 2016 ; مارچ; گیس کی چوری اور گیس سے متعلقہ دیگر جرائم کے خلاف مقدمہ سازی کے لیے اور واجب الداواجبات کی وصولی کا طریقہ کار متعین کرنے کے لیے۔
- ☆ پاکستان کے قوانین کی اشاعت کا ایکٹ، 2016 ; مارچ; اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ پاکستان کے قوانین کی دوبارہ چھپائی یا تجدید کسی قسم کی غلطی سے پاک رہے۔
- ☆ مستقبل کی منڈی کا ایکٹ 2016 ; اپریل; مستقبل کی منڈیوں کو باضابطہ بنانے کے لیے۔
- ☆ سول سرونٹس (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اپریل; سول سرونٹس ایکٹ 1973 میں ترمیم کے لیے۔
- ☆ نجکاری کمیشن (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اپریل; نجکاری کمیشن آرڈیننس 2000 میں ترمیم کے لیے۔
- ☆ پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن کارپوریشن (انضمام) ایکٹ 2016 ; اپریل; پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کارپوریشن کو ایک پبلک لمیٹڈ بنانے کے لیے
- ☆ ترک وطنی (ترمیمی) ایکٹ; اپریل; ترک وطنی آرڈیننس، 1979 میں ترمیم کے لیے،
- ☆ پاکستان بیت المال (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اپریل; پاکستان بیت المال ایکٹ 1991 میں ترمیم کے لیے۔
- ☆ غیر ملکی باشندگان (ترمیمی) ایکٹ ، 2016 ; اپریل ; غیر ملکی باشندگان ایکٹ 1946 میں ترمیم کے لیے۔
- ☆ نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز وٹیکنالوجی (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; مئی; نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز وٹیکنالوجی ایکٹ 1997 میں ترمیم کے لیے۔

☆ بینکوں (خصوصی عدالتوں) سے متعلقہ جرائم کا (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; مئی ; بینکوں (خصوصی عدالتوں) سے متعلقہ جرائم کے آرڈیننس 1984 میں ترمیم کے لیے۔

☆ منصفانہ شراکت فنڈ (تنسیخ) ایکٹ، 2016 ; مئی; منصفانہ شراکت فنڈ آرڈیننس 1970 کو منسوخ کرنے کے لیے۔

☆ پٹیشن (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; مئی; پٹیشن آرڈیننس، 2000 میں ترمیم کے لیے۔

☆ نیشنل ڈیٹابیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; جون; ملک میں غیر ملکیوں کے اندراج میں بہتری لانے کے لیے۔

☆ انتخابی حلقوں کی حد بندی کا (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; جون; انتخابی حلقہ بندیوں کی حد بندی کے ایکٹ 1974 میں ترمیم کے لیے۔

☆ آئینی (بائیسویں ترمیم) ایکٹ، 2016 ; جون; اعلیٰ عدلیہ کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ ججوں کے علاوہ بیوروکریٹس، سرکاری افسران اور ٹیکنوکریٹس کو بھی چیف الیکشن کمشنر اور الیکشن کمیشن پاکستان کا رکن بننے کے اہل قرار دینے کے لیے،

☆ انتخابی فہرستوں کا (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; جون; انتخابی فہرستوں کے ایکٹ 1974 میں ترمیم کے لیے۔

☆ مالیاتی ایکٹ 2016 ; جون; وفاقی حکومت کی مالیاتی تجاویز کی منظوری کے لیے۔

☆ کمپنیوں کی منظّم تنظیم نو کا ایکٹ، 2016 ; جون; کمپنیوں کی منظّم تنظیم نو کرنے اور اُنہیں باضابطہ بنانے کے لیے۔

☆ ملکی توانائی کے استعمال کو مؤثر بنانے اور اُسے محفوظ کرنے کا ایکٹ 2016 ; جون; توانائی کو محفوظ کرنے اور اُس کے مؤثر استعمال کے لیے اداروں کے قیام اور طرائق کار وضع کرنے کے لیے۔

☆ مالیاتی اداروں (محفوظ لین دین) کا ایکٹ، 2016; جون; قابل انتقال جائیداد پر ضمانت نامے کے لیے اور محفوظ سوداکاری کی رجسٹری کے قیام کے لیے۔

☆ زر مبادلہ ریگولیشن (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; جولائی ; زر مبادلہ ریگولیشن ایکٹ 1947 میں ترمیم کے لیے۔

☆ اسلام آباد دارالحکومتی علاقہ مقامی حکومت (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اسلام آباد میٹرو پولیٹن کارپوریشن میں ڈپٹی چیئرمین کی نشستیں ایک سے بڑھا کر تین کرنے کے لیے۔

☆ کریڈٹ بیوروز (ترمیمی) ایکٹ 2016; جولائی; کریڈٹ بیوروز ایکٹ 2015 میں ترمیم کے لیے۔

☆ تمسکات ومبادلہ کمیشن پاکستان (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اگست; سرمائے ومالیاتی سروسز کی منڈی، شعبہ کارپوریٹ اور بیمہ کی صنعت کی بہتر نگرانی اور کنٹرول کے لیے۔

☆ نجی توانائی انفراسٹرکچر بورڈ (ترمیمی) ایکٹ ، 2016 ; اگست ; نجی توانائی وانفراسٹرکچر بورڈ ایکٹ 2012ء میں ترمیم کے لیے۔

☆ مالیاتی اداروں (واجبات کی وصولی) کا (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اگست; مالیاتی اداروں (واجبات کی وصولی) کے آرڈیننس 2001 میں ترمیم کے لیے۔

☆ ڈیپازٹ پروٹیکشن کارپوریشن، 2016 ; اگست; ڈیپازٹ پروٹیکشن کارپوریشن کو بینک دولت پاکستان کا ذیلی ادارہ بنانے اور اُس کے انتظام وانصرام کے لیے۔

☆ بینکوں کا (قومیانہ) (ترمیمی) ایکٹ ، 2016 ; بینکوں (قومیانہ) کے ایکٹ 1974 میں ترمیم کے لیے۔

☆ الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا یکٹ 2016، اگست; الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کے لیے۔

☆ اراکین الیکشن کمیشن (تنخواہ، الاؤنسز، مراعات) ایکٹ 2016 ; اگست; الیکشن کمیشن پاکستان کے اراکین کی تنخواہ، الاؤنسز اور مراعات کے لیے۔

☆ فوجداری قانون (ترمیمی) (جنسی تشدد سے متعلقہ جرائم) ایکٹ، 2016 ; اکتوبر; ضابطہ فوجداری پاکستان 1860، مجموعہ تعزیرات پاکستان 1898 اور قانون شہادت 1984 میں ترمیم کے لیے۔

☆ فوجداری قانون (ترمیمی) عزت کے نام پر سرزد ہونے والے جرائم) ایکٹ ;

2016، اکتوبر ; ضابطہ فوجداری پاکستان 1860 اور مجموعہ تعزیرات پاکستان 1898 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خاص معاشی علاقہ جات (ترمیمی) ایکٹ 2016;اکتوبر، خاص معاشی علاقہ جات کو تجارت کے لیے اور زیادہ سازگار بنانے اور پاکستان میں خاص معاشی علاقہ جات کے فروغ کے لیے۔

☆ مجموعہ ضابطہ دیوانی (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; نومبر; اسلام آباد دارالحکومت کے علاقے کی حد تک مجموعہ ضابطہ دیوانی 1908 میں ترمیم کے لیے۔

☆ پاکستان انجینئرنگ کونسل (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; نومبر ; پاکستان انجینئرنگ کونسل ایکٹ 1976 میں ترمیم کے لیے۔

☆ عدالت عالیہ اسلام آباد (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; نومبر، عدالت عالیہ اسلام آباد ایکٹ 2010 میں ترمیم کے لیے۔

☆ پودوں کی آبیاری کرنے والوں کے حقوق کا ایکٹ 2016 ; دسمبر، پودوں کی نئی اقسام کے فروغ کے لیے اور ان اقسام کی آبیاری کرنے والوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے۔

☆ انکم ٹیکس (چوتھا ترمیمی) ایکٹ 2016 ; دسمبر; انکم ٹیکس آرڈیننس 2001 میں مزید ترمیم کے لیے

☆ نیشنل کمانڈ اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; دسمبر; نیشنل کمانڈ اتھارٹی ایکٹ 2010 میں ترمیم کے لیے۔

صدر مملکت کے نافذ کردہ آرڈیننس

اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن (تنظیم نو اور تبدیل) آرڈیننس، 2016 ; مئی، اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کی تنظیم نو کے لیے اور اُسے ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کرنے کے لیے۔

☆ کریڈٹ بیورو (ترمیمی) آرڈیننس 2016 ; مئی; کریڈٹ بیورو ایکٹ 2015 میں ترمیم کے لیے۔

☆ نیشنل کمانڈ اتھارٹی (ترمیمی) آرڈیننس 2016 ; جون; نیشنل کمانڈ اتھارٹی ایکٹ 2010 میں ترمیم کے لیے۔

☆ انکم ٹیکس (ترمیمی) آرڈیننس 2016 ; ستمبر; انکم ٹیکس آرڈیننس 2001 میں ترمیم کے لیے۔

☆ انکم ٹیکس قوانین (ترمیمی) آرڈیننس 2016 ; ستمبر; انکم ٹیکس کے بعض قوانین میں ترمیم کے لیے۔

☆ کمپنیز آرڈیننس 2016 ; نومبر; کمپنیوں اور اُن سے متعلقہ معاملات سے نبٹنے کی خاطر متعلقہ قانون میں ترمیم کرنے کے لیے۔

صوبائی اسمبلیوں کے منظور کردہ قوانین

2016 کے دوران صوبائی اسمبلیوں کے منظور کردہ اور ترامیم کردہ قوانین کا مقصد درج ذیل تھا۔

بلوچستان اسمبلی

☆ کام کے مقامات پر خواتین کو ایذا دہی سے تحفظ کا بلوچستان ایکٹ 2016 ; جنوری ; کام کے مقامات پر خواتین کو ایذا دہی سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے۔

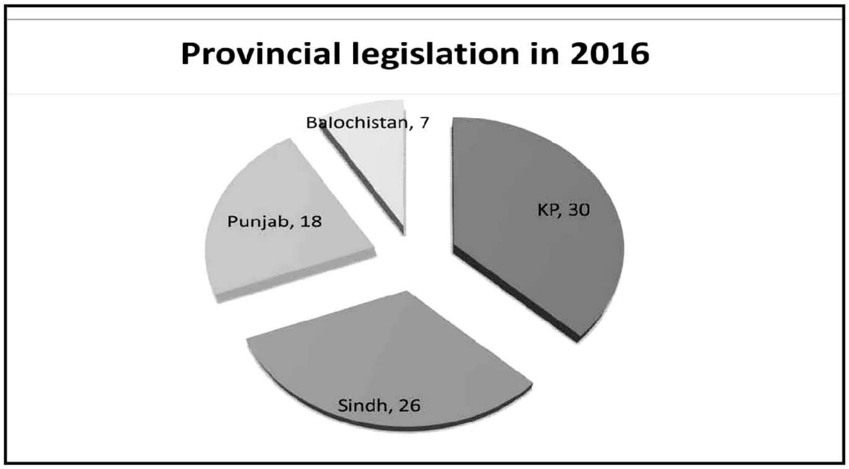

☆ بلوچستان ساؤنڈ سسٹم (ریگولیشن) ایکٹ 2016 ; فروری; بلوچستان میں ساؤنڈ سسٹم کے استعمال کو باضابطہ بنانے اور کنٹرول کرنے کے لیے۔

☆ دیواروں پر لکھنے کے امتناع کا (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; فروری; دیواروں پر لکھنے کے امتناع کے آرڈیننس، 2001 میں ترمیم کے لیے۔

☆ گواہ کے تحفظ کا ایکٹ 2016 ; اپریل; صوبہ بلوچستان میں گواہوں کے تحفظ کے لیے تاکہ انہیں فوجداری مقدمات میں گواہی میں مدد مل سکے۔

☆ بلوچستان میں شیشہ نوشی کی ممانعت کا ایکٹ 2016 ; ستمبر; بلوچستان میں شیشہ نوشی کی روک تھام کے لیے۔

☆ بلوچستان ایمپلائز استعداد وڈسپلن (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اکتوبر; بلوچستان ایمپلائز استعداد وڈسپلن ایکٹ 2011 میں ترمیم کے لیے۔

☆ بلوچستان چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ 2016 ; نومبر; بلوچستان میں بچوں کو ہر قسم کے جسمانی یا ذہنی تشدد، چوٹ، لاپرواہی، لاپرواہی پر مبنی سلوک یا استحصال بشمول جنسی بدسلوکی اور اس سے متعلقہ جرائم سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے۔

خیبر پختونخوا اسمبلی

☆ خیبر پختونخوا میں طب کی تعلیم کے اداروں میں اصلاحات کا (ترمیمی) ایکٹ، ; 2016 اپریل; خیبر پختونخوا میں طب کی تعلیم کے اداروں میں اصلاحات کے ایکٹ 2015 میں اصلاحات لانے کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا آثار قدیمہ ایکٹ، 2016؛ اپریل؛ صوبہ خیبر پختونخوا میں آثار قدیمہ کے تحفظ، ترقی اور دیکھ بھال کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا سول سرونٹس ریٹائرمنٹ فوائد وفوتیدگی معاوضہ (ترمیمی) ایکٹ، 2016; خیبر پختونخوا سول سرونٹس ریٹائرمنٹ فوائد وفوتیدگی معاوضہ ایکٹ 2014 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا چائلڈ پروٹیکشن وویلفیئر (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; مئی; خیبر پختونخوا میں چائلڈ پروٹیکشن وویلفیئر ایکٹ 2010ء میں ترمیم۔

☆ خیبر پختونخوا ہیلتھ فاؤنڈیشن ایکٹ 2016ء، جون، صوبہ خیبر پختونخوا میں ہیلتھ

فاؤنڈیشن کے قیام کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا میں JICA،GAVI ایڈہاک اور کنٹریکٹ ملازمین کی تعیناتی کا ایکٹ; 2016 ; جون ; عالمی اتحاد برائے ویکسی نیشن اور بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت کے (GAVI) پراجیکٹ کے ملازمین کو مستقل کرنے کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا فنانس ایکٹ ، 2016، جون ،صوبہ خیبر پختونخوا میں بعض ٹیکس عائد کرنے،اُن کا اطلاق جاری رکھنے اوراُن پرنظر ثانی کرنے کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا احتساب کمیشن (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اگست ; خیبر پختونخوا احتساب کمیشن ایکٹ 2014 میں ترمیم کے لیے

☆ خیبر پختونخوا گلیات ڈویلپمنٹ اتھارٹی ایکٹ ; 2016 ;اگست ; گلیات ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی تشکیل نواور تعمیر نو کے لیے۔

☆ مفادات کے تصادم کی روک تھام کا ایکٹ، 2016 ;اگست ; سرکاری عہدیداروں کے لیے مفادات کے تصادم اور ملازمت کے بعض دیگر اصولوں کی وضاحت کرنے کے لیے۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ صوبہ خیبر پختونخوا میں سرکاری عہدیداروں کے فرائض منصبی اوراُن کے ذاتی مفادات میں تصادم کا کوئی امکان پیدا نہ ہو۔

☆ خیبر پختونخوا جامعات (ترمیمی) ایکٹ ; 2016 ; اگست ; خیبر پختونخوا جامعات ایکٹ 2012 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا مقامی حکومت (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ;اگست ; خیبر پختونخوا مقامی حکومت ایکٹ، 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا حد بندی (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اگست ; حد بندی ایکٹ 1908 میں ترمیم کے لیے۔

☆ مخبر سے تحفظ اور نگران کار کمیشن ایکٹ، 2016 ; ستمبر ; صوبہ خیبر پختونخوا میں مخبر سے تحفظ فراہم کرنے اور نگران کار کمیشن کے قیام کے لیے۔

☆ نجی قرضوں پر سود کی ممانعت کا ایکٹ ، 2016 ; ستمبر ; سود پر قرضے دینے اور کاروباری معاملات چلانے جیسے رجحانات کی روک تھام کے لیے۔

☆ ڈائریکٹوریٹ انفارمیشن ٹیکنالوجی (ملازمتوں کو مستقل کرنے کے لیے) کے عارضی

ملازمین کا ایکٹ، 2016 ; ستمبر; ڈائریکٹوریٹ انفارمیشن ٹیکنالوجی، خیبر پختونخوا کے بعض عارضی ملازمین کو مستقل کرنے کے لیے۔

- ☆ صنعتی اسٹیٹ یا معاشی علاقوں کو کنٹرول میں لینے کا ایکٹ 2016 ; ستمبر; خیبر پختونخوا اکنامک زونز ڈویلپمنٹ ومینجمنٹ کمپنی کو خیبر پختونخوا ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے صنعتی اسٹیٹ یا اکنامک زونز کا کنٹرول دینے کے لیے اور خیبر پختونخوا ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ملازمین سمیت تمام اثاثے اور ذمہ داریاں بھی مذکورہ کمپنی کو منتقل کرنے کے لیے۔
- ☆ خیبر پختونخوا فیکلٹی آف پیرامیڈیکل والائیڈ ہیلتھ سائنسز ایکٹ;2016 ;اکتوبر; میڈیکل ڈگری ایکٹ، 1916 کے تحت قائم شدہ خیبر پختونخوا میڈیکل فیکلٹی کی تشکیل نو و تنظیم نو کے لیے۔
- ☆ خیبر پختونخوا اعلیٰ تعلیمی اکادمی برائے تحقیق وتربیت ایکٹ، 2016 ; اکتوبر; خیبر پختونخوا اعلیٰ تعلیمی اکادمی برائے تحقیق وتربیت کے قیام کے لیے
- ☆ خیبر پختونخوا طب وہومیو پیتھک ایمپلائز (تعیناتی) ایکٹ;2016;اکتوبر; طب و ہومیو پیتھک کے بعض ملازمین کو مستقل کرنے کے لیے۔
- ☆ خیبر پختونخوا تپ دق نوٹیفکیشن ایکٹ، 2016 ;اکتوبر;اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ رجسٹرڈ ڈاکٹروں، نجی کلینکوں، نجی ہسپتالوں، کمیونٹی رہنماؤں اور اس قانون کے دائرہ کار میں آنے والے مقامات کے سربراہوں کی مدد سے تپ دق کی بیماری کے متعلق حکام کو آگاہ کیا جائے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے، صوبائی پروگرام کے تحت، تپ دق نوٹیفکیشن فارم مرتب کر کے اُن کا استعمال کیا جائے گا۔
- ☆ بریز انسٹی ٹیوٹ ایکٹ 2016 ; اکتوبر; بریز انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور اسے مینجمنٹ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کے شعبوں میں ڈگری جاری کرنے والے ادارے کا درجہ دینے کے لیے۔
- ☆ خیبر پختونخوا بلڈ ٹرانزفیوژن سیفٹی اتھارٹی ایکٹ،2016ا ; اکتوبر; سرکاری و نجی شعبوں میں انسانی خون اور خون کے اجزا کی وصولی، معائنے، پروسیسنگ، ذخیرہ تقسیم، اجراء اور منتقلی کو ضابطے میں لانے اور خیبر پختونخوا بلڈ ٹرانزفیوژن سیفٹی اتھارٹی

کے قیام کے لیے تاکہ خون کی منتقلی سے لگنے والی امراض سے محفوظ رہا جا سکے اور اُن پر قابو پایا جا سکے۔

☆ خیبر پختونخوا اربن ماس ٹرانزٹ ایکٹ، 2016 ; اکتوبر ; صوبہ خیبر پختونخوا میں بڑے پیمانے پر ٹریفک کے جدید اور پائیدار نظام کے قیام اور اس کے انتظام و انصرام کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا کمیشن برائے حقوقِ نسواں ایکٹ، 2016 ; اکتوبر ; خیبر پختونخوا میں کمیشن برائے حقوق نسواں کی تشکیل نو اور تنظیم نو کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا الیسائل والمحر وم فاؤنڈیشن (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; اکتوبر ; خیبر پختونخوا الیسائل والمحر وم فاؤنڈیشن ایکٹ، 2015 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا پبلک پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; دسمبر ; خیبر پختونخوا پبلک پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی ایکٹ، 2012 میں ترمیم کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا بوائلر اینڈ پریشر ویسلز ایکٹ، 2016 دسمبر ; صوبہ خیبر پختونخوا میں بوائلر اور پریشر ویسلز کو ضابطے میں لانے کے لیے۔

☆ خیبر پختونخوا شعبہ معدنیات گورننس ایکٹ 2016 ; دسمبر ; کان کنی کے طریقہء کار کو بہتر بنانے اور باضابطہ بنانے کے لیے، رکاوٹیں دور کرنے کے لیے اور صوبہ خیبر پختونخوا کے شعبہ معدنیات میں ملکی وغیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے سازگار فضا قائم کرنے کے لیے۔

پنجاب اسمبلی

☆ پنجاب سیف سیٹیز اتھارٹی ایکٹ، 2016 ; فروری ; پنجاب سیف سٹیز اتھارٹی کے قیام کے لیے۔

☆ پنجاب اسپیشل پروٹیکشن یونٹ ایکٹ 2016 ; فروری ; پولیس میں اسپیشل پروٹیکشن یونٹ کے قیام کے لیے۔

☆ انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ اتھارٹی پنجاب ایکٹ، 2016 ; انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ اتھارٹی پنجاب کے قیام کے لیے۔

☆ جامعہ اوکاڑہ، ایکٹ 2016 ; فروری; جامعہ اوکاڑہ کے قیام کے لیے۔

☆ خواتین کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے کا ایکٹ 2016 ; فروری; خواتین کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے اور اُن کی دادرسی اور بحالی نو کا مؤثر طریقہ کار وضع کرنے کے لیے۔

☆ فورٹ منرو ڈویلپمنٹ اتھارٹی ایکٹ 2016 ; اپریل، فورٹ منرو ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے قیام کے لیے۔

☆ سیلابی علاقوں کی ریگولیشن کا ایکٹ 2016 ; اپریل; پنجاب میں سیلابی علاقوں کے متعلق مناسب انتظامات کرنے کے لیے۔

☆ پنجاب نگران کمیٹیز ایکٹ 2016 ; اپریل; نگران کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے۔

☆ پنجاب میرج فنکشنز ایکٹ 2016 ; اپریل; شادی اور دیگر متعلقہ امور سے نبٹنے کے لیے۔

☆ پنجاب ایگری کلچر، فوڈ و ڈرگ اتھارٹی ایکٹ 2016 ; مئی; پنجاب ایگری کلچر، فوڈ و ڈرگ اتھارٹی کے قیام کے لیے تاکہ کھاد، کیڑے مار کیمیکل اور ادویات کا فورنیسک معائنہ کیا جائے۔

☆ پنجاب فنانس ایکٹ 2016 ; جون، پنجاب میں بعض ٹیکس، فیس اور محصول عائد کرنے، اُن میں ردوبدل کرنے اور اُنہیں معقول بنانے کے لیے۔

☆ پنجاب میں اینٹوں کے بھٹوں پر بچوں کی مشقت کی روک تھام کا ایکٹ 2016 ; ستمبر پنجاب میں بھٹوں پر بچوں کی مشقت کی روک تھام اور بھٹوں پر مشقت کو باضابطہ بنانے کے لیے۔

☆ دہشت گردی کا شکار ہونے والے عام شہریوں کا (دادرسی و بحالی نو) ایکٹ 2016; ستمبر؛ دہشت گردی کا شکار ہونے والے عام شہریوں اور اُن کے اہل خانہ کو درپیش مشکلات کے ازالے کی خاطر باضابطہ نظام کی تشکیل کے لیے۔

☆ پنجاب بلڈ ٹرانزفیوژن سیفٹی ایکٹ، 2016 ; اکتوبر; انسانی خون اور خون کے اجزاء کی وصولی، معائنے، پروسیسنگ، ذخیرے، تقسیم، اجراء اور منتقلی کو باضابطہ بنانے کے لیے اور خون کی منتقلی کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں سے بچاؤ اور اُن کی روک تھام کو یقینی بنانے کے لیے۔

☆ پولٹری کی پیداوار کا ایکٹ 2016 ; اکتوبر; پنجاب میں پولٹری کی پیداوار کے امور سے نمٹنے کے لیے۔

☆ بچوں کی ملازمت پر پابندی کا ایکٹ، 2016 ; اکتوبر; بچوں کی ملازمت پر پابندی کے لیے اور بعض شعبوں میں نوخیز بالغوں کی ملازمت پر پابندی کے لیے۔

☆ پنجاب حلال ڈویلپمنٹ ایجنسی ایکٹ 2016 ; دسمبر; پنجاب میں حلال اشیائے خوردونوش اور غیر خوردونوش اشیا کی تجارت کو کنٹرول کرنے کی غرض سے پنجاب حلال ڈویلپمنٹ ایجنسی کے قیام کے لیے۔

☆ پنجاب اینیمل فیڈ سٹف اور کمپاؤنڈ فیڈ ایکٹ، 2016 ; دسمبر; پنجاب میں پولٹری کی پیداوار کے امور کو کنٹرول کرنے کے لیے۔

سندھ اسمبلی

☆ سندھ کریمنل پراسیکیوشن سروس (تشکیل، فرائض، اختیارات) (ترمیمی) ایکٹ ; 2015 فروری; سندھ کریمنل پراسیکیوشن سروس (تشکیل، فرائض، اختیارات) ایکٹ 2009 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ مقامی حکومت (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; فروری; سندھ مقامی حکومت ایکٹ 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ انٹرمیڈیٹ وسیکنڈری ایجوکیشن بورڈز (ترمیمی) ایکٹ، 2015 ; مارچ سندھ انٹرمیڈیٹ وسیکنڈری ایجوکیشن بورڈز آرڈیننس 1932 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ سروسز سیلز ٹیکس (ترمیمی) ایکٹ، 2015 ; مارچ; سندھ سروسز سیلز ایکٹ 2011 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ کم از کم تنخواہ ایکٹ 2015 ; اپریل; بعض صنعتی وتجارتی اداروں میں برسرِ روزگار ملازمین کے لیے کم از کم مقررہ کردہ اجرت اور مختلف الاؤنسز کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے۔

☆ میٹروپولیٹن جامعہ کراچی ایکٹ، 2015 ; اپریل; میٹروپولیٹن جامعہ کراچی کے قیام کے لیے۔

☆ سندھ ہندوز میرج ایکٹ 2016 ; اپریل; ہندوؤں کے ازدواجی معاملات کو

باضابطہ بنانے کے لیے۔

☆ سندھ ورکرز معاوضہ ایکٹ، 2016 ; اپریل; اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ بعض آجر کسی حادثے میں اپنے ملازم کو چوٹ لگنے یا اُس کی موت واقع ہوجانے پر اُسے یا اُس کے قانونی ورثاء کو معاوضہ ادا کریں۔

☆ سندھ دوکانات وتجارتی اداروں کا ایکٹ 2015 ; صوبہ سندھ میں دوکانات، اور تجارتی صنعتی یا دیگر اداروں میں برسرروزگار افراد کے کام کے اوقات اور کام کے دیگر حالات سے متعلقہ قانون میں ترمیم کرنے اور اُسے مربوط کرنے کے لیے۔

☆ سندھ فیکٹریز ایکٹ 2015 ; فیکٹریوں میں لیبر سے متعلقہ قانون میں ترمیم کے لیے۔

☆ ملازمت کی شرائط کا ایکٹ (نافذ العمل آرڈرز) ایکٹ 2015 ; اپریل; صوبہ سندھ میں صنعتی وتجارتی ملازمت کو باضابطہ بنانے کے لیے۔

☆ سندھ مقامی حکومت (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اپریل; سندھ مقامی حکومت ایکٹ 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ مقامی حکومت (چوتھا ترمیمی) ایکٹ، 2016 ; اپریل; سندھ مقامی حکومت ایکٹ 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ سروس ٹربیونلز (ترمیمی) ایکٹ ; 2016 ; سندھ سروس ٹربیونلز ایکٹ 1973 میں ترمیم کے لیے۔

☆ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (بحالی و ترمیم) ایکٹ ; 2016 ; مئی ; کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی، متعلقہ قانون کی بحالی اور ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ کمپنیز منافع (مزدوروں کی شمولیت) ایکٹ، 2015; مئی; کمپنیوں کے منافع میں مزدوروں کو بھی شامل کرنے کے لیے۔

☆ بے نظیر بھٹو شہید یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی و سکل ڈویلپمنٹ ایکٹ، 2016; مئی; خیر پور میرس میں بے نظیر بھٹو شہید یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی و سکل ڈویلپمنٹ کے قیام کے لیے۔

☆ سندھ مقامی حکومت (تیسرا ترمیمی) ایکٹ 2016 ; جون; سندھ مقامی حکومت

ایکٹ 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ 2015 ; جون ; صوبہ سندھ میں جبری مشقت کے نظام کے خاتمے کے لیے۔

☆ سندھ سینئر سیٹیزنز ویلفیئر ایکٹ 2014 ; جون؛ صوبہ سندھ میں بزرگ شہریوں کی فلاح و بہبود کے انتظامات کے لیے۔

☆ سندھ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ (ترمیمی) ایکٹ 2016 ; جون ; سندھ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ ایکٹ 2014 میں ترمیم کے لیے۔

☆ ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، 2016، اکتوبر ; ذوالفقار آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی ایکٹ 2010 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ اسلحہ (ترمیمی) ایکٹ، 2016; اکتوبر; سندھ اسلحہ ایکٹ 2013 میں ترمیم کے لیے۔

☆ سندھ ماس ٹرانزٹ اتھارٹی ایکٹ، 2014 ; اکتوبر; صوبہ سندھ میں سندھ ماس ٹرانزٹ اتھارٹی کے قیام کے لیے۔

☆ کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی وتجارت ایکٹ 2015 ; کراچی میں کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی وتجارت کے قیام کے لیے۔

سفارشات

☆ پاکستان کے باشندوں کے انسانی حقوق اور آزادیوں کے فروغ کے لیے مزید قانون سازی کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

☆ ارکان پارلیمان کو چاہیے کہ وہ جہاں ضرورت پڑے قانون سازی سے پہلے ماہرین سے مشاورت لیں تا کہ اراکین پارلیمان کی پارلیمان میں ووٹ ڈالنے کے عمل میں رہنمائی ہو سکے۔

☆ وفاقی وصوبائی مجالس قانون ساز کو چاہیے کہ وہ قواعد وضوابط اور دیگر تفویض شدہ قانون سازی کے معاملات کی بلا تاخیر اور معیاری تشکیل کو یقینی بنائیں تا کہ قوانین پارلیمان سے منظور ہونے کے بعد بغیر کسی غیر ضروری تاخیر کے نافذ ہو جایا کریں۔

☆ مجالس قانون ساز کو چاہیے کہ وہ عوام کو اسمبلیوں میں پیش ہونے والے تمام بلوں کے

متعلق بروقت آگاہ کرنے کے لیے مؤثر ذرائع بروئے کار لائیں تا کہ قانون ساز عوام کی آراء سے مستفید ہو سکیں اور شعوری فیصلے کے قابل ہو سکیں۔

☆ صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کے رجحان پر قابو پایا جائے اور صدارتی آرڈیننس صرف آخری چارے کے طور پر صادر کیا جائے اور صرف اُس وقت تک نافذ العمل رہے جب تک پارلیمان اُس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لیے اپنا اجلاس منعقد نہیں کرتی۔

☆ اِس امر کو یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے کہ قوانین جلد بازی میں منظور نہ ہوں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ بلوں کو ووٹنگ کے لیے پیش کرنے سے قبل قانون دانوں کو مکمل موقع دے کہ وہ اُن کی تمام تفصیلات کا جائزہ لے لیں۔

قانون کی حکمرانی

عدل و انصاف کا انتظام و انصرام

قانون کا تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا چاہے وہ جہاں بھی ہو، نا قابل تنسیخ حق ہے اور ہر اس شخص کا بھی جو فی الوقت پاکستان میں موجود ہے۔ خاص طور پر (الف) کسی شخص کی زندگی، آزادی، جسم، وقار یا جائیداد کے خلاف کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جو نقصان دہ ہو۔ سوائے ایسے قدم کے جو قانون کے عین مطابق ہو (ب) کسی شخص کو ایسا کوئی کام سرانجام دینے سے نہیں روکا جائے گا جس کی قانون ممانعت نہیں کرتا اور (ج) کسی شخص کو ایسا کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جس کی قانون اجازت نہیں دیتا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 4 (1) اور (2)]

کسی شخص کو اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ سوائے قانون کی مطابقت میں۔

[آرٹیکل - 9]

تمام افراد قانون کے سامنے مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں۔

[آرٹیکل 25 (1)]

محض جنس کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

[آرٹیکل - 25 (2)]

ریاست سستے اور فوری انصاف کے حصول کو یقینی بنائے گی۔

[آرٹیکل 37(2)]

کسی جائیداد کو جبراً حاصل یا اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا ماسوائے قومی سطح پر کسی مقصد کے لیے اور ماسوائے قانون کی اجازت سے۔

[آرٹیکل 24(2)]

تمام انسانوں کے وقار اور ان کے مساویانہ اور نا قابل تنسیخ حقوق کو تسلیم کرنا، دنیا میں امن اور انصاف اور آزادی کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [افتتاحیہ]

ہر شخص کو قانون کے روبرو بطور انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل (6)]

ہر شخص قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتا ہے اور بغیر کسی تمیز کے مساویانہ قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

[آرٹیکل- (3)]

قانون یا آئین کی طرف سے عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف ہر شخص کو با اختیار قومی ٹریبونلز کے ذریعے موثر دادرسی کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل نمبر - 8]

ہر شخص کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں یا اپنے خلاف عائد کیے گئے کسی بھی فوجداری الزام کے تعین کے لیے، ایک خود مختار اور غیر جانبدار ٹریبونل کے ذریعے، مکمل مساویانہ حیثیت میں منصفانہ اور کھلی سماعت کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو قانون کے روبرو بطور انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ [آرٹیکل(6)]

ہر شخص قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتا ہے اور بغیر کسی تمیز کے مساویانہ قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے۔
[آرٹیکل - (7)]
قانون یا آئین کی طرف سے عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف ہر شخص کو بااختیار قومی ٹریبونلز کے ذریعے موثر دادرسی کا حق حاصل ہے۔ [آرٹیکل نمبر - 8]
ہر شخص کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں یا اپنے خلاف عائد کیے گئے کسی بھی فوجداری الزام کے تعین کے لیے، ایک خودمختار اور غیر جانبدار ٹریبونل کے ذریعے، مکمل مساویانہ حیثیت میں منصفانہ اور کھلی سماعت کا حق حاصل ہے۔ [آرٹیکل - 10]
کسی شخص کو بے جا طور پر اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ [آرٹیکل 17 - (2)]
موجودہ اختیاری پروٹوکول [سزائے موت کے خاتمے کے لیے] کی فریق کوئی ریاست اپنی حدود میں کسی شخص کو سزائے موت نہیں دے گی۔
ہر فریق ریاست اپنے دائرہ اختیار میں موت کی سزا کے خاتمے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔
آئی سی سی پی آر کا دوسرا اختیاری پروٹوکول۔
[آرٹیکل - 1]

انصاف کا انتظام و انصرام ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ریاست کا قانونی نظام چلایا جاتا ہے۔ ایسے انتظام و انصرام کا مقصد قانونی نظام سے رجوع کرنے والے تمام لوگوں کو انصاف کی فراہمی ہوتا ہے۔ لیکن 2016ء کے دوران بھی پاکستان میں انصاف کا انتظام و انصرام ایک چیلنج بنا رہا۔

ملک کی عدالتوں میں تین لاکھ کے قریب مقدمات زیرِ التوا تھے جس سے فوجداری اور دیوانی انصاف کے کمزور نظام کی عکاسی ہوتی تھی۔ اگرچہ فوجی عدالتیں، جن کی منظوری سپریم کورٹ نے ایک 'خصوصی' قلیل المدتی اقدام کے طور پر دی تھی، پاکستان کے فوجداری نظام انصاف کا حصہ بنیں، تاہم دہشت گردی کے مقدمات کو موثر طور پر نمٹانے کے لیے عام نظام میں اصلاح کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی، جیسا کہ وعدہ کیا گیا تھا۔

ریاست عدلیہ اور وسیع قانونی برادری کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ سال کے دوران کوئٹہ، مردان اور شب قدر کے واقعات سمیت، ججوں اور وکلاء کے خلاف تشدد کے کئی واقعات پیش آئے، جس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کا فوجداری انصاف کا نظام -- مبینہ دہشت گردوں کی ضمانت، سماعت اور اپیلوں کے کیسز کی انجام دہی کی بدولت عسکریت پسندی کے خاتمے کی جنگ میں پیش پیش رہا۔ خوف کا عنصر دیگر چند مقدمات میں بھی نمایاں رہا۔ سپریم کورٹ نے توہین مذہب کے جرم میں موت کی سزا پانیوالی آسیہ بی بی کی اپیل غیر معینہ مدت کے لیے

ملتوی کردی، جبکہ ایک جج نے مقدمے سے علیحدگی اختیار کر لی کیوں کہ سزا کے خاتمے کی صورت میں انتہا پسند عناصر ان کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ اور یوں، پانچ بچوں کی ماں کو مسلسل ساتویں کرسمس قید تنہائی میں گزارنا پڑی۔ دوسری جانب، لاہور کورٹ نے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے توہین مذہب کے ایک ملزم کو بری کر دیا جو چار سال سے جیل میں قید تھا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں کہا گیا تھا کہ ''توہین مذہب کے زیادہ تر مقدمات جھوٹے الزامات پر مبنی تھے اور ان کی اصل وجہ جائیداد کے تنازعات یا دیگر ذاتی یا خاندانی دشمنیاں تھیں''۔

سپریم کورٹ نے وزیراعظم نواز شریف کے خلاف بدعنوانی کے ایک مقدمے کی سماعت پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ن) اور حزب اختلاف کی جماعت پاکستان تحریک انصاف کے درمیان سیاسی محاذ آرائی کے خطرے کو ٹال دیا۔ اعلیٰ عدلیہ نے ایک شق کو بھی غیر قانونی قرار دیا جو وزیراعظم کو کابینہ کے خاتمے کا اختیار دیتی تھی۔ لاہور ہائی کورٹ نے مسیحیوں کو دوشوہر/بیویاں رکھنے یا بدکاری کے ذلت آمیز الزامات کے بغیر اپنے شریک حیات کو طلاق دینے کا دوبارہ اختیار دے دیا۔ نام نہاد غیرت کے نام پر خواتین کے قتل کے واقعات مسلسل منظر عام پر آتے رہے۔ اسی طرح خواجہ سراؤں کے خلاف امتیازی سلوک اور تشدد کے واقعات بھی سامنے آتے رہے۔

عدلیہ

زیرالتوا مقدمات

اخبارات کی رپورٹس بتاتی ہیں کہ مقدمات کا فیصلہ ہونے میں 20 سے 30 سال کا وقت لگا اور ملک بھر کی عدالتوں میں تقریباً 30 لاکھ مقدمات زیرالتوا تھے۔ پاکستان کمیشن برائے قانون وانصاف کے مطابق، سپریم کورٹ میں 30,970 مقدمات زیرالتوا تھے جبکہ وفاقی شرعی عدالت میں زیرالتوا مقدمات کی تعداد 661 تھی۔ صوبوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو لاہور ہائی کورٹ 1,595,787 مقدمات کے ساتھ سرفہرست تھا جبکہ سندھ ہائی کورٹ میں 84,077، پشاور ہائی کورٹ میں 30,730، اسلام آباد ہائی کورٹ میں 13,789 اور بلوچستان ہائی کورٹ میں 6,110 مقدمات زیرالتوا تھے۔ ضلعی عدالتوں میں بھی پنجاب 1,274,310 مقدمات کے ساتھ سرفہرست رہا جبکہ خیبر پختونخوا میں التوا کا شکار مقدمات کی

تعداد 188,561، سندھ میں 121,180، اسلام آباد میں 31,018 اور بلوچستان میں 13,882 رہی۔ گواہ کو تحفظ کی عدم فراہمی کے باعث مقدمات کے فیصلہ نہ ہوسکا۔ برطانیہ سے وراثت میں ملنے والے طریقہء کار سے متعلق ضوابط، جن میں خاطر خواہ ترامیم نہیں کی گئیں، حد سے زیادہ تکنیکی بنے رہے، اور جن کا نتیجہ اپیلوں، جائزوں اور نظرثانیوں کے لامتناہی سلسلوں کی صورت میں نکلتا ہے اور موثر پن مکمل پن کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

زیرالتوا مقدمات

ڈسٹرکٹ کورٹس	ہائی کورٹس
1,274,310	159,577
پنجاب	لاہور
121,180	84,077
سندھ	سندھ
188,561	30,730
خیبر پختونخوا	پشاور
13,882	6,110
بلوچستان	بلوچستان
31,018	13,789
اسلام آباد	اسلام آباد

ذرائع: کمیشن برائے قانون وانصاف، پاکستان
یہ اعداد وشمار 16 نومبر، 2016 تک کے ہیں

بہت سے مقدمات میں شواہد جمع کرنے کا عمل انتہائی ناقص رہا اور محض پولیس کی حراست میں تشدد کے ذریعے کرائے گئے اقرار جرم پر انحصار کیا گیا۔ ان رکاوٹوں کی موجودگی میں فوجداری انصاف کا نظام بدعنوان اور غیر موثر رہا۔

مارچ میں، چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے ایک سیمینار میں اعلان کیا کہ عدالتی نظام میں کوئی خامی نہیں تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ عدالتی نظام نہایت آزمودہ تھا۔ ان کے مطابق چند بیرونی عناصر نظام میں تاخیر کے ذمہ دار تھے، چنانچہ عدالتی نظام پر غیر ضروری تنقید غیر مناسب تھی۔

تاہم، دو بھائیوں، غلام سرور اور غلام قادر جنہیں جیل حکام نے ایک سال پہلے پھانسی دے دی تھی، کو سپریم کورٹ نے اکتوبر میں ایک سال بعد بے گناہ قرار دیا۔

یہ مقدمہ اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ سزائے موت پر پابندی کے خاتمے سے ان لوگوں کو خطرہ ہے جنہیں دہشت گردی کے جرائم میں سزائیں نہیں ہوتیں مگر انہیں ان جرائم میں سزائیں سنائی جاتی ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب نہیں کیا ہوتا۔

اکتوبر میں ہی، سپریم کورٹ نے ایک شخص کو بے گناہ قرار دیا جسے ایک سیشن عدالت نے 2014ء قتل کے جرم میں موت کی سزا سنائی تھی۔ لیکن اس کی رہائی میں دو سال کی تاخیر ہوگئی۔ مظہر حسین، جس کی سزائے موت کے خلاف اپیل کو ایک ہائی کورٹ نے کئی سال پہلے مسترد کردیا تھا، دو سال پہلے حراست کے دوران حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگیا۔ حتیٰ

کہ اعلیٰ عدلیہ بھی اس بات سے بے خبر تھی کہ درخواست گزار جیل میں انتقال کر چکا تھا۔منظور پر 19 سال پہلے مئی 1997ء میں قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔محمد انار اور مظہر فاروق کو بھی اعلیٰ عدلیہ نے اس وقت بری کیا جب وہ جیل میں بالترتیب 24 اور 11 سال گزار چکے تھے۔

احتساب

سپریم کورٹ نے اسلام آباد ہائی کورٹ میں 2011ء اور 2012ء کے دوران کی گئی گئیں چند تقرریوں کو کالعدم قرار دیا۔جسٹس عامر ہانی مسلم نے کہا کہ مذکور تقرریاں آئین کی دفعہ 208 میں دیے گئے طریقہ کار کی خلاف ورزی تھیں۔جسٹس مسلم نے مدعا علیان کو یاد دلایا کہ ایسی غیر قانونی تقرریوں سے 'ادارے کی ساکھ' خراب ہونے کا خطرہ تھا۔فیصلے میں حکم دیا گیا کہ نئی تقرریاں نیشنل ٹیسٹنگ سروس (این ٹی ایس) کے ذریعے کی جائیں۔

سپریم کورٹ نے ایک پٹیشن خارج کردی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ سپریم جوڈیشل کونسل (ایس جے سی) ججوں کے خلاف شکایات اور ریفرنسز کو فوری طور پر نمٹائے ، اور عوام کو درج کرائے گئے مقدمات کی تعداد اور صورتحال سے آگاہ کیا جائے۔عدالت کا یہ موقف تھا کہ ایسے مقدمات میں 'مکمل رازداری' کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے اور ایس جے سی کونسل کو اپنے فیصلوں میں جلدی کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔عدالت کی نظر میں، یہ پٹیشن آئین کی دفعہ 209 اور 211 سے متصادم تھی جس کا تعلق ایس جے سی کے فرائض سے ہے۔

شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے احتساب کی کسی بھی کوشش کی مزاحمت کی۔لاہور لائی کورٹ کے چیف جسٹس منصور علی شاہ نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد عدالتوں میں ناشائستگی کو روکنا اور وکلاء کو عدالتی بالادستی کا احترام کرنے پر مجبور کرنا تھا۔لیگل پریکٹیشنرز اینڈ بار کونسلز ایکٹ کی دفعہ 54 سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کو اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ اگر کوئی وکیل 'انتہائی غیر شائستہ طرزِ عمل' یا 'سنگین پیشہ ورانہ ناشائستہ فعل' میں ملوث پایا جائے تو وہ اسے کام کرنے سے روک سکتے ہیں۔جن وکلاء کی جانچ پڑتال کی جارہی تھی ان میں لاہور بار ایسو سی ایشن کے نائب صدر رانا سعید اور فیروزوالا بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر آصف بشیر مرزا شامل تھے۔ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے 'غیر موافق' فیصلے دینے پر عدالتی افسران کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور ان سے عدالتی ریکارڈ چھین لیا تھا۔لاہور بار نے سیکشن 54 کو بار کی آزادی کے خلاف قرار دیتے ہوئے چیف جسٹس سے مستعفی ہونے اور کمیٹی کو تحلیل کرنے کا مطالبہ کیا۔

فوجی عدالتیں

حکومت نے جنوری 2015ء میں فوجی عدالتوں کو دو سال کے لیے دہشت گردی میں مبینہ طور پر ملوث افراد پر مقدمہ چلانے کا اختیار دیا اور وعدہ کیا کہ فوجداری نظام انصاف میں اصلاح کی جائے گی۔ آئین کی اکیسویں ترمیم پشاور کے ایک اسکول پر ہونے والے حملے کے بعد لائی گئی تھی جس میں 130 سے زائد طالب علم ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ملک بھر میں 11 فوجی عدالتیں-- پنجاب اور خیبر پختونخوا میں تین تین اور سندھ میں دو اور بلوچستان میں ایک -- قائم کی گئیں جو اب تک 274 افراد کو مجرم قرار دے چکی ہیں۔ ان میں سے 161 کو سزائے موت اور 113 افراد کو قید کی سزا (زیادہ تر عمر قید) کی سزا سنائی گئی ہے۔ فوجی عدالتوں سے سزا سنائے جانے کے بعد کم از کم 17 افراد کو پھانسی دی جا چکی ہے۔

اگرچہ فوجی عدالتوں کی معیاد ختم ہونے والی تھی، تاہم دیوانی عدالتوں کے ڈھانچے کو بہتر بنانے کی بجائے حکومت نے فوری انصاف کی فراہمی کے لیے ایک مرتبہ پھر فوجی عدالتوں کی طرف دیکھا۔

بین الاقوامی کمیشن برائے انصاف (آئی سی جے)-- دنیا بھر کے 60 ماہرین قانون کے ایک گروہ نے 2016ء میں شائع ہونے والے ایک بریفنگ پیپر میں کہا کہ ''حکومت اور فوجی حکام عدالتی کارروائیوں کے وقت اور مقام سے متعلق معلومات؛ سزا پانے والے افراد کے خلاف الزامات اور ثبوت؛ اور اس کے علاوہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں بشمول ضروری حقائق، قانونی دلائل اور ان شواہد سے متعلق معلومات کو عام کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں جن کی بنیاد پر سزائیں سنائی گئی تھیں''۔

آئی سی جے کا کہنا ہے کہ ''انسانی حقوق کی تنظیموں، سماعت کے جائزہ کاروں، صحافیوں اور حتیٰ کہ فوجی عدالتوں میں قانونی کارروائیوں کا سامنا کرنے والے ملزموں کے خاندانوں کو بھی فوجی عدالتوں کی کارروائیوں تک رسائی نہیں دی گئی۔''

آئی ایس پی آر کے نمائندے کے ترجمان کے مطابق، دسمبر 2016ء تک فوجی عدالتوں سے سزا پانے والے 144 افراد میں سے 135 نے اپنے جرم کا 'اعتراف' کیا۔ یعنی اقرار جرم کا تناسب 90 فیصد سے زیادہ ہے جو اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ

اقرار جرم کے لیے تفتیش کے قابل اعتراض طریقے استعمال کیے گئے ہوں۔

آئی سی جے نے اس بات کا نوٹس لیا کہ ''فوجی عدالتوں میں جن مشتبہ افراد پر مقدمہ چلایا گیا وہ ہر وقت، حتیٰ کہ مجسٹریٹ کی جانب سے ان کے 'اقرار جرم' کو ریکارڈ کیے جانے کے بعد بھی فوج کی حراست میں رہے۔ ان کا بیرونی دنیا سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا جس کے باعث نہ صرف ان پر تشدد اور ناروا سلوک کیے جانے کا خطرہ موجود رہا بلکہ وہ بیرونی دباؤ اور جبر کے خطرے سے بھی دوچار رہے۔ اور اطلاعات کے مطابق، جن مشتبہ افراد نے فوجی عدالتوں میں سماعت کے دوران اپنے جرائم کا 'اعتراف' کیا تھا ان میں سے چند افراد کو فوجی حکام نے 2010ء میں گرفتار کیا تھا اور انہیں وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) کے حراستی مراکز میں قید رکھا تھا۔

2016ء میں، فوجی عدالتوں کی جانب سے مجرم قرار دیے جانے والے 16 سویلین افراد کے خاندانوں نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں نظر ثانی کی درخواست دائر کی۔

عاصمہ جہانگیر نے اس وقت کے چیف جسٹس انور ظہیر جمالی کی سربراہی میں قائم کیے گئے سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بنچ کے سامنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ''مکمل ثبوت اور ملزم کے مقدمے کے ریکارڈ کی فراہمی کے بعد ان مقدمات کی دوبارہ سماعت اور اس بات کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ ملزم کو اپنی پسند کے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی آزادی ہو''۔

سپریم کورٹ نے اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ فوجی ٹرائل آئین میں دیے گئے ایک آزادانہ اور شفاف ٹرائل کے معیارات سے متجاوز تھے۔

اپریل میں، فوجی عدالتوں میں ملزم کے حقوق سے متعلق ایک اور کیس میں چیف جسٹس نے کہا، ''دہشت گرد ایک طرف آئین کو چیلنج کر رہے ہیں تو دوسری طرف قانون کو، لیکن ان کے وکلاء ان کے دفاع میں بنیادی حقوق کا حوالہ دے رہے ہیں۔''

تاہم ماضی میں ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں کہ ایسے جرائم میں بھی بنیادی حقوق اور معین طریقہ کار کے حق کی خلاف ورزیوں نے سپریم کورٹ کی توجہ حاصل کی۔ انسانی حقوق کے ایک مقدمے میں، جسٹس افتخار چودھری نے کہا تھا کہ ''شہریوں کے بنیادی حقوق کی محافظ ہونے کے ناتے، سپریم کورٹ اپنا دائرہ اختیار استعمال کرنے کی مجاز ہے۔''

توہین مذہب کے مقدمات

پولیس گارڈ ممتاز قادری جنہوں نے ملک میں توہین مذہب کے قوانین میں ترمیم کا مطالبہ کرنے پر گورنر پنجاب سلمان تاثیر کوقتل کر دیا تھا، کو 29 فروری کو پھانسی دے دی گئی۔ سلمان تاثیر نے یہ مطالبہ موت کی سزا پانے والی ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی کی حمایت میں کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ہجوم کے 'انصاف' کے متعدد واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ عدلیہ بھی ایسے واقعات میں ملزم کو بری کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہے، جس کے باعث ملزمان طویل عرصے تک جیلوں میں پڑے رہتے ہیں۔ آسیہ بی بی نے 2016ء میں ساتواں سال قید تنہائی میں گزارا۔ ان کی آخری اپیل کی سماعت اس وقت منسوخ کر دی گئی جب ایک جج مفادات کے تصادم کا حوالہ دیتے ہوئے مقدمے سے الگ ہو گئے۔

دوسری جانب جنوری میں، لاہور ہائی کورٹ نے توہین مذہب کے ایک ملزم کو بری کر دیا۔ ملزم غلام علی اصغر چار سال تک جیل میں قید رہا۔

جسٹس عباد الرحمان نے توہین مذہب کے ایک مقدمے میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ توہین مذہب کے زیادہ تر مقدمات جھوٹے الزامات پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کی اصل وجہ جائیداد کے تنازعات یا دیگر ذاتی یا خاندانی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ اس کا حتمی نتیجہ پوری برادری کے خلاف ہجوم کی صورت میں نکلتا ہے۔

عدالت کا کہنا ہے کہ ''لاہور ہائی کورٹ نے 2002ء میں پولیس کو توہین مذہب کے واقعات سے نمٹنے کے لیے ہدایات جاری کی تھیں۔ تاہم، 2011ء میں درج ہونے والے ایک مقدمے میں تحقیقاتی ایجنسی نے کسی قسم کی رہنمائی حاصل کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس مقدمے میں تفتیش موثر اور مکمل طریقے سے نہیں کی گئی تھی۔''

عدالت نے مزید کہا کہ ''توہین مذہب کے مقدمات کے اندراج میں اضافہ اور ان میں شر انگیزی کے عنصر کی موجودگی اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ استغاثہ کے افسران کے لحاظ سے خصوصی احتیاط برتی جائے۔ اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ ایسے مقدمات کا آزادانہ اور لاپرواہی سے اندراج کیا جائے۔ شہریوں کا ایسا طبقہ جو مذہب کا زیادہ علم نہیں رکھتا اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ اپنے ذاتی تنازعات کے تصفیے کے لیے ان قوانین کا استعمال کرے۔''

توہین مذہب کے تحت درج کیے گئے مقدمات

نمبرشمار	نام	جنس	ضلع	دفعہ	تاریخ	الزام	موجودہ حالت	ماخذ
توہین مذہب کے قوانین کے تحت مسلمانوں کے خلاف درج کیے گئے مقدمات								
1	اظہر	مرد	سانده پھاٹک، قصور	نامعلوم	07/01/2016	بائبل اور دیگر مقدس کتب کو جلایا	گرفتار	ڈان
2	جبریل احمد	مرد	مظفرگڑھ	295-C	14/05/2016	ایک طالب علم جسے ٹیچر جبریل احمد نے مارا پیٹا تھا، کے والدین نے استاد پر پیغمبر پاکؐ کے خلاف توہین آمیز کلمات کہنے کا الزام لگایا	گرفتار	ڈان
3	جہانزیب خاصخیلی	مرد	ٹنڈو آدم	نامعلوم	19/06/2016	ہندوؤں کی مقدس نقوش والے جوتے بیچنے کا الزام	گرفتار	ایکسپریس ٹریبیون
4	حاجی ریاست، باقر علی، راشد گجر، فیض اسلم، شکیل، سانول	مرد	چیچہ وطنی، ساہیوال	نامعلوم	02/05/2016	مہندر پال سنگھ نامی سکھ کی پگڑی کی توہین کی	مقدمہ درج لیکن گرفتار نہیں کیا گیا	ایکسپریس ٹریبیون
5	محمد انور	مرد	حجرہ شاہ مقیم	لاگو نہیں کی گئی	15/01/2016	لڑکا امام کے سوال کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ ہجوم نے اس کی جانب سے دیے گئے جواب کو توہین آمیز قرار دیا۔	لڑکے نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے توہین مذہب کا ارتکاب کیا تھا، اپنا ہاتھ کاٹ لیا	ایکسپریس ٹریبیون
مسیحیوں کے خلاف توہین مذہب کے قوانین کے تحت درج کیے گئے مقدمات								
01	یعقوب مسیح	مرد	حیدر آباد	لاگو نہیں کی گئی	14/07/2016	ایک کتاب کے اوراق جلائے جن میں قرآنی آیات درج تھیں۔	مقدمہ درج نہیں کیا گیا	انٹرنیشنل کرسچن کنسرن
02	ندیم جیمز	مرد	گجرات	295-C, 298-A	10/07/2016	واٹس ایپ کے ذریعے ایک مسلمان کو توہین آمیز پیغام بھیجا۔	گرفتار	پاکستان کرسچن پوسٹ / آئی سی سی
03	عثمان لیاقت	مرد	شیخوپورہ	لاگو نہیں کی گئی	25/05/2016	سوشل میڈیا پر مبینہ طور پر توہین آمیز پیغام پوسٹ کیا	گرفتار	بی بی سی/ پاکستان ٹوڈے
04	عمران مسیح	مرد	چک نمبر 44	نامعلوم	27/05/2016	نامعلوم	نامعلوم	پاکستان

خلاصہ

	ملزمان کی تعداد
مسلمان	10
مسیحی	05
کل	15

2016ء میں توہین مذہب کے مقدمات میں سزائیں

نمبرشمار	نام	جنس	ضلع	دفعہ	تاریخ	الزام	موجودہ حالت	ماخذ
موت کی سزا پانے والے مسلمان								
01	نعمان چانڈیہ	مرد	مظفرگڑھ	نامعلوم	02/06/2016	کام کی جگہ پر اپنے ساتھی کے موبائل سے اپنے موبائل پر توہین آمیز پیغامات بھیجے۔	سزائے موت سنائی گئی	ڈان
02	جعفر علی	مرد	گجراں والا	نامعلوم	28/06/2016	توہین مذہب کا ارتکاب کیا	سزائے موت اور 80 لاکھ روپے جرمانہ	ڈان
موت کی سزا پانے والے مسیحی								
01	انجم ناز	مرد	گجراں والا	295-C	28/06/2016	توہین مذہب کا ارتکاب کیا	سزائے موت اور 50 لاکھ روپے جرمانہ	ڈان
02	جاوید ناز	مرد	گجراں والا	نامعلوم	28/06/2016	توہین مذہب کا ارتکاب کیا	سزائے موت اور 80 لاکھ روپے جرمانہ	ڈان

2016ء میں بری ہونے والے افراد

01	شفقت گل، لطیف مسیح، یونیتان گل، محسن شوکت، ذوالفقار	مرد	گجرات	295-A	20/06/2016	توہین مذہب	بری کر دیا گیا	کلاس

نومبر میں، انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے ان پانچ افراد کو سزائے موت سنائی جنہوں نے ایک مسیحی جوڑے پر توہین مذہب کا جھوٹا الزام لگانے کے بعد انہیں ایک بھٹے میں جلا کر ہلاک کر دیا تھا۔ شہزاد مسیح اور شمع بی بی کی موت سے پاکستان بھر میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ان کے گھر کے قریب رہنے والے مسیحی خاندان خوف کے باعث علاقے سے نقل مکانی کر گئے۔ مقدمے میں 103 افراد کو نامزد کیا گیا تھا، لیکن عدالت نے بھٹے کے مالک سمیت 90 افراد کو بری کر دیا۔ بھٹہ مالک پر الزام تھا کہ جب جوڑے نے بھٹہ مالک کو واجب الا دا قرض کی عدم ادائیگی کے خوف کے باعث وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اس نے انہیں کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جوڑے کو گھسیٹنے، مارنے پیٹنے اور جلانے پر پانچ افراد کو موت کی سزا سنائی گئی۔ اس کے علاوہ مجرموں کی مدد کرنے پر آٹھ افراد کو دو سال قید کی سزا سنائی گئی۔

بدعنوانی

سپریم کورٹ نے تقریباً دو ماہ تک ان پٹیشنوں کی سماعت کی جن میں وزیر اعظم اور ان کے خاندان پر بدعنوانی کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ لیکن 9 دسمبر کو مقدمے کی کارروائی ختم کر دی گئی کیوں کہ اس ماہ کے آخر میں چیف جسٹس انور ظہیر جمالی کے عہدے کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ سپریم کورٹ نے کہا کہ جب جنوری میں سماعت دوبارہ شروع ہو گی تو دونوں فریقین کے دلائل دوبارہ سنے جائیں گے۔ سپریم کورٹ نے پاناما پیپرز کی سماعت کے دوبارہ آغاز کے لیے 4 جنوری 2017ء سے جسٹس آصف سعید کھوسہ کی صدارت میں پانچ ججوں پر مشتمل ایک لارجر بینچ تشکیل دیا گیا۔

سپریم کورٹ نے ایک از خود نوٹس کی سماعت کرتے ہوئے قومی احتساب بیورو کو رضا کارانہ واپسی (وی آر)، جو قومی احتساب بیورو آرڈیننس 1999ء کی ایک شق ہے، کے تحت معاملات کی منظوری دینے سے روک دیا۔ یہ شق بدعنوانی کے مجرموں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ غبن کی گئی رقم کا کچھ حصہ ادا کریں اور کسی تہمت کے بغیر رہا ہو جائیں۔ حتیٰ کہ نیب کی یہ اسکیم وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے ملازمین کو نیب کی وی آر سہولت کے حصول کے بعد اپنے شعبوں میں کام جاری رکھنے کی بھی اجازت دیتی ہے۔

اس سے پہلے نیب نے اپنی ایک رپورٹ میں اعتراف کیا تھا کہ 1,584 سول سرونٹس 2 ارب روپے ادا کرتے ہوئے نیب کی وی آر سہولت سے مستفید ہوئے تھے۔ ان میں وفاقی حکومت کے 165 اور صوبائی حکومتوں کے 1,419 افسران شامل تھے۔

دیگر اہم مقدمات

اگست میں، لاہور ہائی کورٹ نے اورنج لائن میٹرو ٹرین منصوبے کے خلاف پٹیشنوں پر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ہائی کورٹ نے اپنے ثقافتی ورثے کے مقامات کے 200 فٹ کے اندر تعمیرات روکنے کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک اپیل دائر کی گئی تھی۔ دسمبر میں عدالت نے 45 ارب روپے کے اس منصوبے کے تمام فریقین کو دعوت دی کہ وہ نیسپاک کے ماحولیاتی جائزے کی ساکھ کی دوبارہ تصدیق سے متعلق ماہرین کی رپورٹس کے خلاف اپنے مشاہدات جمع کرائیں۔

اپیلوں کی سماعت کے دوران چیف جسٹس کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ ماہرین کی رپورٹس ایک دوسرے کے متضاد تھیں۔ ''دونوں رپورٹس کے حقائق ڈرامائی طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔''

سپریم کورٹ نے ایک اور کیس میں وفاقی کابینہ کے حوالے سے وزیراعظم کے اختیارات واضح کیے اور کہا کہ وزیراعظم ''کابینہ کے سربراہ ہیں لیکن وہ اس کی جگہ نہیں لے سکتے اور اس کے اختیارات خود استعمال نہیں کر سکتے۔'' اس امتیازی کیس کی ابتدا ٹیکس میں تبدیلی کے بعد ہوئی تھی۔ درخواست گزار کمپنیوں کا کہنا تھا کہ یہ تبدیلی کابینہ سے مشورہ کیے بغیر وزیراعظم کی ہدایات پر کی گئی تھی۔

سپریم کورٹ نے بحریہ ٹاؤن کو ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایم ڈی اے) کی جانب سے غیرقانونی طور پر فراہم کی گئی زمین پر تعمیرات جاری رکھنے سے روک دیا۔

پشاور ہائی کورٹ نے ایک رٹ پٹیشن پر ان 65 خاندانوں کی شہریت بحال کر دی جنہیں 1951ء میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی علاقے میں رہ رہے تھے۔ ان کی جائیداد بھی چترال کے اس وقت کے حکمران نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ انہوں نے اپیل میں یہ موقف اختیار کیا کہ وہ پاکستانی شہری تھے اور انہیں اس بنیاد پر شناختی کارڈ سے محروم کیا گیا کیوں کہ انہوں نے راشن کارڈ حاصل کیے تھے اور امدادی سامان وصول کیا تھا جو افغان مہاجرین کے لیے مخصوص تھا۔ عدالت نے وزارت داخلہ کو ہدایت کی کہ انہیں شہریت سے متعلق دستاویزات فراہم کی جائیں۔

سپریم کورٹ نے دماغی عارضے میں مبتلا سزائے موت کے ایک قیدی امداد علی کی

دماغی صحت کا جائزہ لینے کے لیے ایک تین رکنی میڈیکل بورڈ تشکیل دیا اور دو ہفتوں کے اندر رپورٹ جمع کرانے کا حکم دیا۔

سماعت کے دوران جج عامر ہانی مسلم نے مشاہدہ کیا کہ اگر امداد علی، جسے 2 نومبر کو پھانسی دی جانی تھی، کی ذہنی بیماری ثابت ہوگئی تو اس کی موت کی سزا ختم نہیں ہوگی بلکہ اس کی بیماری کا علاج کیے جانے تک ملتوی ہو جائے گی۔

31 اکتوبر کو، اعلیٰ عدلیہ نے امداد علی کی پھانسی روک دی تھی جسے 2 نومبر کو پھانسی دی جانی تھی۔ عدالت مجرم کی بیوی صفیہ بانو کی جانب سے عدالت کے 27 ستمبر کے حکم کے خلاف دائر کی گئی نظر ثانی پٹیشن کی سماعت کر رہی تھی۔ اس حکم میں عدالت نے اعلان کیا تھا کہ شیزوفرینیا جیسی دماغی بیماری سزائے موت کو نہیں روک سکتی۔

دسمبر میں، سپریم کورٹ نے پنجاب پولیس کے 50 سے زائد اعلیٰ افسران کی جانب سے دائر کی گئیں پٹیشنیں خارج کر دیں۔ ان پٹیشنوں میں میرٹ سے ہٹ کر ترقیوں سے متعلق 2013ء کے حکم پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی تھی۔

2013ء میں اعلیٰ عدلیہ نے میرٹ سے ہٹ کر ترقیوں کو آئین کی خلاف ورزی قرار دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ کوئی بھی پولیس افسر یا سول سرونٹ انعام بہادری یا کسی اور بنا پر ایسی ترقی کا حق دار نہیں تھا۔

2013ء کے عدالتی حکم کی مطابقت میں، 20 سپرینٹنڈنٹ سمیت پنجاب پولیس کے سینکڑوں افسران کے عہدے میں تنزلی کر دی گئی۔ پنجاب پولیس نے جولائی میں سپریم کورٹ کو بتایا کہ انہوں نے میرٹ سے ہٹ کر ترقی پانے والے مختلف عہدوں پر براجمان افسران کی 10,884 ترقیاں واپس لے لی تھیں۔

گلگت بلتستان کی ایک اپیلیٹ عدالت نے وادی ہنزہ سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی کارکن بابا جان کی عمر قید کی سزا کو برقرار رکھا۔ بابا جان اور 11 دیگر کارکنوں کو انسداد دہشت گردی کے قوانین کے تحت سزا سنائی گئی تھی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے احتجاجی مظاہروں کی قیادت کرتے ہوئے 2011ء میں عطا آباد جھیل کی قدرتی آفت کے متاثرین کے لیے معاوضے کا مطالبہ کیا تھا۔

انہوں نے جیل میں رہ کر مقامی انتخابات میں حصہ لیا اور دوسرے نمبر پر رہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے ان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اب، صدر مملکت ہی ان کی سزا میں کمی کر سکتے ہیں۔

حملے

کوئٹہ میں 8 اگست کو ہونے والے بم دھماکے میں 50 سے زائد وکلاء جاں بحق ہوئے۔ یہ وکلاء ایک روز پہلے فائرنگ سے ہلاک ہونے والے بلوچستان بار ایسوسی ایشن (بی بی اے) کے صدر بلال انور کاسی کی وفات پر تعزیت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس واقعے سے پہلے جون میں ٹارگٹ کلنگ کے ایک واقعے میں یونیورسٹی آف بلوچستان کے لاء کالج کے پرنسپل بیرسٹر امان اللہ اچکزئی اور اگست کے شروع میں ایک وکیل جہانزیب علوی کو قتل کر دیا گیا تھا۔

ایک اخبار کی رپورٹ میں کہا گیا کہ اس واقعے کے نتیجے میں 2,000 موکل قانونی نمائندگی سے محروم ہوگئے جس کے باعث ہائی کورٹ اور زیریں عدالتیں، جن میں پہلے ہی دیوانی اور فوجداری مقدمات کی بھرمار تھی، ان میں مقدمات مزید غیر معمولی تاخیر کا شکار ہوگئے۔ سال کے آخر تک صوبے کی عدالتوں میں 40 فیصد مقدمات زیر التوا تھے۔ 32 اضلاع میں سے تقریباً 26 کی کوئی قانونی نمائندگی نہیں تھی جس سے مراد یہ تھی کہ کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے وکلاء کو طویل فاصلوں کا سفر کر کے اپنے موکلین کا دفاع کرنا تھا۔ نتیجتاً، ضلعی عدالتوں میں 13,000 مقدمات اور بلوچستان ہائی کورٹ اور سبی اور تربت کی دو سرکٹ عدالتوں میں تقریباً 6,000 سے زائد مقدمات زیر التوا رہے۔ ہڑتال کی مسلسل اپیلوں کے باعث ہائی کورٹ اور سماعت کی زیریں عدالتیں ہفتے میں محض دو دن کام کر سکیں اور چند سینیئر وکلاء پر کام کا بوجھ بڑھ گیا۔ بلوچستان میں پراسیکیوٹر جنرل کا تقرر بھی نہ ہوسکا۔ یہ عہدہ نومبر 2015ء سے خالی تھا۔

7 مارچ کو، چارسدہ کے علاقے شب قدر میں ایک خودکش حملہ آور نے ایک سول عدالت کے داخلی راستے پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں 16 افراد ہلاک ہوئے۔

ستمبر میں، مردان کی ضلعی عدالت میں اس وقت دھماکا ہوگیا جب ایک خودکش حملہ آور نے پہلے پولیس پر ایک دستی بم پھینکا اور پھر خود کو بم سے اڑا لیا۔ دھماکے کے نتیجے میں 14 افراد ہلاک اور 52 زخمی ہوئے۔

ایک از خود نوٹس کیس میں، کوئٹہ میں وکلاء پر ہونے والے حملے کی تحقیقات کے لیے جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی سربراہی میں ایک یک رکنی کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن کی رپورٹ میں دہشت گرد حملے کے ہر پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا۔ رپورٹ میں ہسپتال، صوبائی حکومت، جائے واردات کو محفوظ کرنے یا فارنسک تفتیش میں پولیس کی غفلت اور قومی انسداد دہشت گردی

وکلاء نے مختلف شہروں میں اپنے ساتھیوں پر حملوں کے خلاف ہڑتال کی جس کے باعث ملک بھر میں عدالتی سماعتیں ملتوی کی گئیں

اتھارٹی کے منصوبوں کے غیر موثر نفاذ کا حوالہ دیا گیا۔ رپورٹ میں مستقبل میں دہشت گردی کے واقعات کی روک تھام کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو تجاویز دی گئیں۔

سال کے دوران ایک وکیل اویس شاہ کا اغواء اور بازیابی بھی دیکھنے میں آئی۔ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے بیٹے اویس شاہ کو جون میں کراچی سے اغواء کیا گیا تھا۔ انہیں ایک ماہ بعد جنوبی وزیرستان کے علاقے ٹانک سے بازیاب کرایا گیا جب انہیں افغانستان لے جایا جا رہا تھا۔

شہری

خواجہ سرا:

حکومتی عہدے داروں اور عام افراد دونوں کی جانب سے خواجہ سراؤں کے خلاف امتیازی اور ناروا سلوک کی اطلاعات سامنے آتی رہیں۔ سال کے آغاز میں ٹرانسجنڈر الائنس کے رکن عدنان کو نامعلوم مسلح افراد نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ ہسپتال میں اس کے علاج میں تاخیر کی گئی۔ ڈاکٹروں اور پولیس نے انتہائی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور وہ اس تذبذب میں رہے کہ اسے کس وارڈ میں رکھا جائے۔

مئی میں، مردوں کے ایک گروہ اور متعدد خواجہ سراؤں کے درمیان جھگڑے کے دوران خواجہ سراؤں کے حقوق کی کارکن علیشا کو آٹھ گولیاں لگیں۔ فائرنگ کے فوراً بعد، علیشا کو

ایک خواجہ سراء پشاور میں علیشاہ کے قتل پر رو رہی ہے۔ علیشاہ 46 ویں خواجہ سراء تھی جنہیں گزشتہ دو برس کے دوران پرتشدد موت کا سامنا کرنا پڑا

قریبی لیڈی ریڈنگ ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے مبینہ طور پر اسے نظرانداز کیا اور عملے اور مریضوں کی شکایات کے بعد مردانہ اور زنانہ دونوں وارڈز تک رسائی دینے سے انکار کر دیا۔ علیشا کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ اسے ایک غسل خانے کے آگے واقع راہداری میں پردے کے بغیر بستر پر رکھا گیا، جس کے بعد آخر کار اسے ایک پرائیویٹ کمرہ دے دیا گیا۔ لیکن وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوگئی۔ ہسپتال کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ ہسپتال ''نے صرف مریضوں کی شکایات کے مطابق کارروائی کی۔''

ان دو واقعات نے صوبے میں ہنگامہ خیز صورتحال پیدا کر دی، جس کے بعد خیبر پختونخوا حکومت نے خواجہ سراؤں کی بہبود کے لیے 20 کروڑ روپے کی رقم مختص کی۔ ہیومن رائٹس واچ کے مطابق، ایک خواجہ سرا نے اس اقدام کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''خیبر پختونخوا حکومت کے اراکین نے ہم سے کہا ہے کہ یہ رقم ہماری بہبود پر اس وقت خرچ کی جائے گی کہ اگر ہم خواجہ سراؤں پر حملوں پر بات نہ کر کے حکومت کو بدنام کرنا بند کر دیں۔''

جون میں، لاہور میں 50 علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ ایسے خواجہ سرا جن میں مرد یا عورت ہونے کی 'واضح علامات' موجود ہوں وہ اپنی مخالف جنس کے فرد سے شادی کر سکتے ہیں۔ فتوے میں یہ بھی کہا گیا کہ خواجہ سراؤں کو وراثت اور تدفین سے متعلق رسومات کی ادائیگی کا حق حاصل ہے۔ علماء نے یہ بھی کہا کہ خواجہ سرا برادری کے افراد کی تذلیل یا انہیں تنگ کرنا اسلام

میں ایک جرم تصور کیا جانا چاہئے۔

اگست میں، سنبل کو اغواء کاروں کے ساتھ جھگڑے کے دوران متعدد گولیاں لگیں۔ ہسپتال نے اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ ہسپتال میں مردوں اور خواتین کے لیے الگ الگ وارڈ تھے جبکہ خواجہ سراؤں کے لیے کوئی وارڈ مخصوص نہیں تھا۔ ہسپتال کے باہر احتجاج کے بعد پولیس نے درخواست درج کر لی۔ اس سے پہلے پولیس نے درخواست درج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

پشاور ہائی کورٹ نے ایک رٹ پٹیشن میں مردم شماری کی فہرست میں خواجہ سراؤں کے کالم کی عدم موجودگی کا نوٹس لے لیا۔ حکومت نے سال کے آخر تک اپنا جواب عدالت میں جمع نہیں کرایا تھا۔

نومبر میں، ایک گروہ کے سرغنہ کی ویڈیو منظر عام پر آئی جس میں اسے ایک خواجہ سرا کو کوڑے مارتے دکھایا گیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ خواجہ سرا نے اسے بھتے کی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وائرل ہونے والی اس گرافک ویڈیو میں دیکھا گیا کہ متاثرہ خواجہ سرا کو نیچے لٹا کر مسلسل کوڑے مارے گئے جس کے باعث وہ درد سے چلاتی رہی۔

ناروا اور امتیازی سلوک کے ایسے واقعات خواجہ سرا برادری کو انصاف تک رسائی میں درپیش مشکلات کو ظاہر کرتے ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے یعنی پولیس کے غیر سنجیدہ رویے کے باعث ان کی تکالیف میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ پولیس اور ڈاکٹروں کے رویے کے علاوہ سماجی رویے اس مسلسل تشدد اور امتیازی سلوک میں مزید اضافہ کرتے ہیں جن کا خواجہ سراؤں کو سامنا ہے۔

مذہبی اقلیتیں

دو مذہبی اقلیتوں کے حوالے سے، عائلی قوانین کے ذریعے قانون سازی کر کے انہیں مزید حقوق فراہم کیے گئے۔ ہائی کورٹ نے مسیحیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے طلاق کی وجوہات کو بحال کر دیا جنہیں پہلے ختم کر دیا گیا تھا۔ ملک کی ہندو برادری کو نہ صرف شادی کے اندراج کا حق ملا بلکہ ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے دیگر دفعات بھی قانون میں شامل کی گئیں۔ لاہور ہائی کورٹ نے کرسچن طلاق ایکٹ سے متعلق ایک مقدمے کی سماعت کی۔ اس قانون کی دفعہ 7 کو 1981ء میں سابق فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے حکم پر ختم کر دیا گیا تھا

اور دفعہ 10 کے تحت مسیحی جوڑوں کے لیے بدکاری کو طلاق کی واحد بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ عدالت نے دفعہ 7 کو بحال کر دیا جو کہتی ہے کہ مسیحیوں کے خاندانی معاملات میں برطانیہ کی عدالتوں کے اصولوں کا اطلاق ہوگا۔ اس سے مسیحی جوڑوں کو عزت کے ساتھ علیحدہ ہونے کا موقع ملا۔

سندھ کی صوبائی اسمبلی نے بھی سندھ ہندو میرج ایکٹ 2016ء کی منظوری دی جس سے انہیں شادی کے باضابطہ اندراج کا موقع ملا۔ قانون میں شادی کی کم سے کم عمر بھی مقرر کی گئی جبکہ دو شوہر یا دو بیویاں رکھنے کے حوالے سے کوئی استثنا نہیں دیا گیا۔

قومی اسمبلی نے ہندو میرج ایکٹ 2016ء منظور کیا جس کی بدولت ہندوؤں کو اپنی شادیوں کے اندراج اور تنسیخ کا موقع ملا۔ محکمہ انسداد دہشت گردی (سی ٹی ڈی) نے ایک شکایت کی بنیاد پر ایک 'ممنوعہ' میگزین کی اشاعت روکنے کے لیے ربوہ میں احمدیوں کے ہیڈ کوارٹرز پر چھاپہ مارا۔ یہ اقدام بغیر وارنٹ، بغیر تحقیقات اور اس معاملے میں ہائی کورٹ کی جانب سے جاری کیے گئے حکم امتناع کے خلاف اٹھایا گیا۔

دسمبر میں، چکوال میں احمدیوں کو ایک مرتبہ پھر ان کے عقیدے کی بنا پر نشانہ بنایا گیا۔ پیغمبر پاکؐ کے یوم ولادت پر تقریباً ایک ہزار پر مشتمل ہجوم نے احمدیوں کی عبادت گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس سے پہلے مقامی مذہبی رہنماؤں کا یہ مطالبہ رہا تھا کہ مسجد ان کے حوالے کر دی جائے۔ تاہم وہ اس میں ناکام ہوئے اور انہوں نے ہتھیاروں کے ساتھ عبادت گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے مسجد کی دیوار پر پتھر مارے اور ہوائی فائرنگ بھی کی۔ مسجد، جسے برادری نے اندر سے تالا لگا رکھا تھا، میں ایک شخص حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا۔ احمدی برادری نے حکام کو اپنی املاک اور مسجد پر ممکنہ حملے کے بارے میں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا تاہم اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کافی دیر کے بعد فوج اور پولیس کی بھاری نفری کے پہنچنے پر ہجوم منتشر ہو گیا۔

خواتین

سپریم کورٹ میں خواتین کی نمائندگی اس وقت عوامی بحث کا موضوع بن گئی جب ایم کیو ایم کی جانب سے قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے ایک بل میں تجویز دی گئی کہ سپریم کورٹ میں کم از کم ایک چوتھائی جج خواتین ہونی چاہئیں۔ اس وقت، لاہور ہائی کورٹ کے 49 ججوں میں خواتین ججوں کی تعداد تین ہے۔ پشاور ہائی کورٹ میں دو خواتین جج موجود ہیں جبکہ وفاقی شرعی عدالت اور بلوچستان ہائی کورٹ میں خواتین ججوں کی تعداد ایک ایک ہے۔ سندھ اور اسلام آباد

ہائی کورٹ میں ایک بھی خاتون جج نہیں ہے۔ اعلیٰ عدلیہ میں خواتین کی مجموعی نمائندگی پانچ فیصد تھی۔

بنگلا دیش میں 1989ء سے سپریم کورٹ میں خواتین ججوں کی تعداد چھ ہے جبکہ ہندوستان کی سپریم کورٹ میں بھی خواتین ججوں کی تعداد اتنی ہی ہے۔

ملکی میڈیا کی اطلاعات کے مطابق خواتین کو 'غیرت' کے نام پر قتل کیے جانے کے متعدد واقعات پیش آئے۔ ان واقعات نے حکومت کو چند قوانین میں تبدیلی پر مجبور کردیا۔ پارلیمنٹ کے ایک مشترکہ اجلاس میں غیرت کے نام پر قتل اور جنسی زیادتی کے خلاف بلوں کی متفقہ طور پر منظوری دی گئی۔

غیرت کے نام پر قتل سے متعلق قانون میں قتل کے عام مقدمات کی نسبت مجرموں کے لیے زیادہ سخت سزائیں رکھی گئی ہیں۔

نئے قانون کے تحت، متاثرہ فرد کے ورثاء قاتل کو صرف اس صورت میں معاف کرسکیں گے کہ اگر اسے موت کی سزا سنائی گئی ہو۔ تاہم، مجرم کو پھر بھی ساڑھے بارہ سال کی عمر قید کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اجلاس میں بحث کرتے ہوئے وزیر قانون نے کہا: ''جنسی زیادتی کے مقدمات میں فیصلے تین ماہ کے اندر اندر دیے جائیں گے اور ملزم کو چھ ماہ کے اندر اپیل کا حق حاصل ہوگا۔''

لیکن جب تک ریاست انسدادی طریقہ کار کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتی، خواتین کے خلاف تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان میں کمی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جنسی زیادتی کے واقعات کے خلاف قانونی کارروائی کی شرح مایوس کن طور پر کم ہے۔ لاہور میں ایک 13 سالہ گھریلو ملازمہ کو جنسی زیادتی کی درخواست واپس لینے اور ملزم کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کردیا گیا۔ یہ مقدمہ چھ ماہ تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ ڈی این اے رپورٹ بھی موصول نہ ہوئی۔ پولیس شواہد کو محفوظ کرنے اور اسے لیبارٹری میں بھیجنے میں اس وقت تک ناکام رہی تھی، جب تک کہ وقوعہ کے تین دن بعد اس بات کی نشاندہی نہ کی گئی کہ پولیس نے غفلت اور دانستہ بددیانتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ معاہدہ لڑکی کے والد نے اس کے توسط سے طے کیا اور اسی نے ملزم سے تلافی کی رقم وصول کی۔

چونکہ کسی بھی درجے کی سخت سزائیں تشدد سے متاثرہ خواتین کی برابری، وقار اور

انصاف کو یقینی نہیں بنا سکتیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے پہلے کہ قوانین میں ترمیم کی جائے، فوجداری نظام انصاف میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کیا جائے۔

سفارشات

- ☆ عدلیہ کو مقدمات کی سماعت کا عمل تیز کرنا چاہیے اور سماعت کے التوا کی وجوہات کو سختی سے باضابطہ بناتے ہوئے سماعت کا دورانیہ کم کرنا چاہیے۔
- ☆ حکومت اور عدلیہ کو قوانین کے نفاذ اور تمام لوگوں کے لیے انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔ مذہبی اقلیتوں، خواتین اور خواجہ سراؤں جیسے کمزور طبقات کو فی الفور انصاف فراہم کیا جانا چاہیے۔

2
قانون کا نفاذ

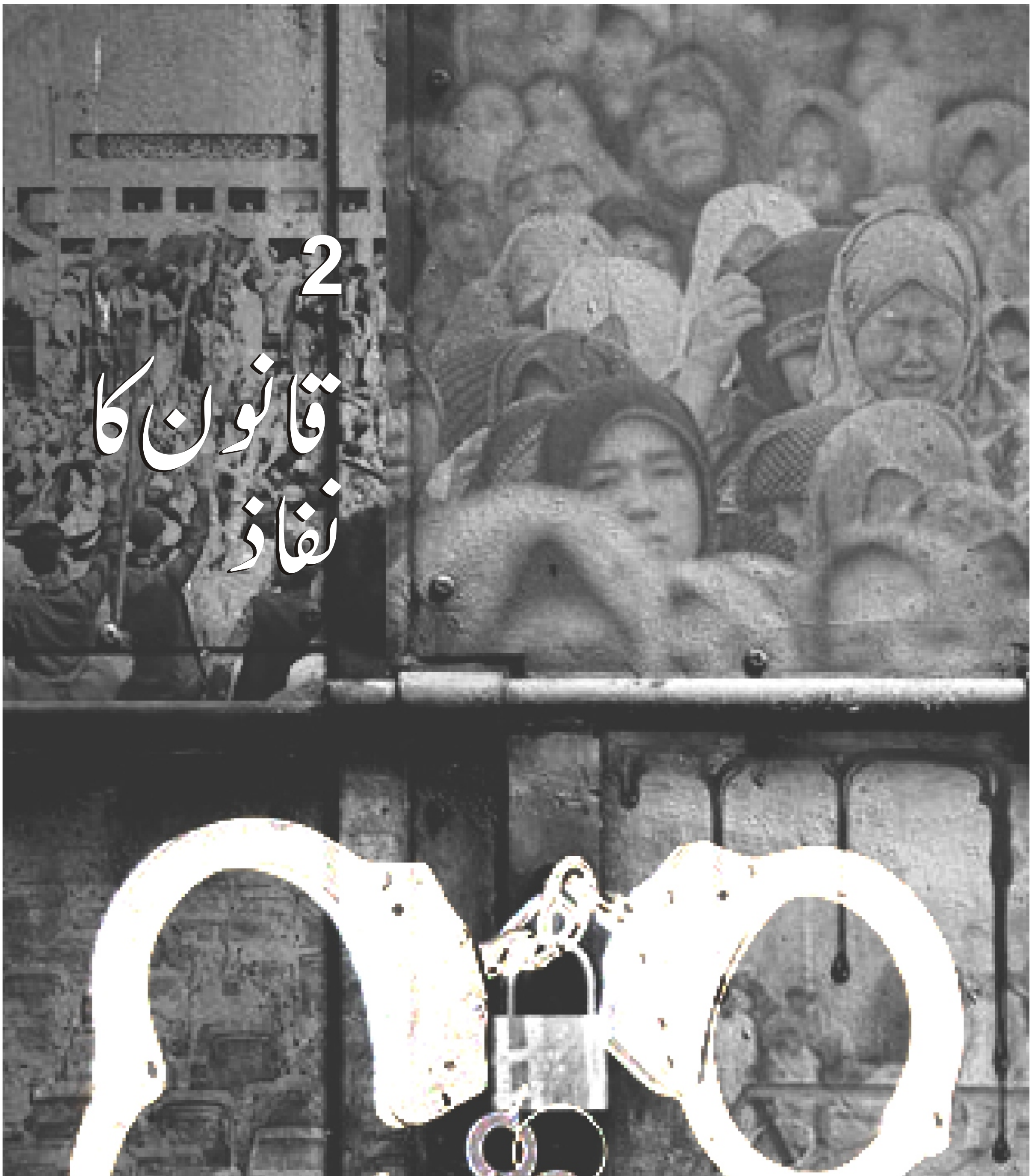

قانون کا نفاذ

امن وامان کی صورتحال

کسی شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو، مذکورہ گرفتاری کی وجوہ سے، جس قدر جلد ہو سکے، آگاہ کیے بغیر نہ تو نظر بند رکھا جائے گا اور نہ اسے اپنی پسند کے کسی قانون پیشہ شخص سے مشورہ کرنے اور اس کے ذریعہ صفائی پیش کرنے کے حق سے محروم کیا جائے گا۔
ہر اس شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو اور نظر بند رکھا گیا ہو، مذکورہ گرفتاری سے چوبیس گھنٹہ کے اندر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا لازم ہوگا۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-10(1) اور (2)]

انسانی وقار، گھر اور چاردیواری کی حرمت کی، قانون کے مطابق، ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔
کوئی شہادت یا ثبوت حاصل کرنے کے لیے کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

[آرٹیکل 14(1) اور (2)]

ہر شخص کو زندہ رہنے، آزادی اور جان و مال کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل -3]

ہر اس شخص کو جس پر کوئی قابل سزا الزام عائد کیا جائے، یہ حق حاصل ہے کہ جب تک قانون کے تحت اس کو ایک کھلی عدالت میں، جہاں اسے اپنے دفاع کی تمام سہولتیں حاصل ہوں، مجرم ثابت نہیں کیا جاتا، اسے بے قصور تصور کیا جائے گا۔

[آرٹیکل 11-(1)]

کسی شخص کی خلوت یا تنہائی، خاندانی زندگی، گھر یا اس کی خط و کتابت میں، من مانے طور پر مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کے وقار اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر شخص کو اس قسم کی مداخلت اور کوششوں کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔

[آرٹیکل 12]

امن وامان سے مراد معاشرے کی وہ مخصوص کیفیت ہے جس میں لوگوں کی بھاری اکثریت قانون کی حکمرانی کا احترام کرتی ہے اور قانون کا نفاذ کرنے والے بھی ان قوانین کی پاسداری کرتے ہیں جو ان کے اختیارات کا تعین کرتے ہیں۔ امن وامان برقرار رکھنے سے مراد فوجداری قانون کے ذریعے جرائم، تشدد اور بدامنی سے نمٹنا اور سزاؤں کے فوری اطلاق کو یقینی بنانا ہے۔

2016ء میں حکومت نے دہشت گردی کے خاتمے اور سکیورٹی کی صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں جس کے نتیجے میں تشدد کی بناء پر ہونے والی اموات میں خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ لیکن بہت سے علاقوں میں سکیورٹی کی صورتحال خطرناک رہی اور لوگوں کو جان و مال کے خلاف ہونے والے جرائم پر تحفظات برقرار رہے۔ قانون کا نفاذ

کرنے والوں کے علاوہ عام لوگ، وکلاء، اور میڈیا کے لوگ بھی تشدد کا شکار ہوئے۔ عوامی جگہیں، مذہبی مقامات، مساجد اور شاپنگ سنٹرز کو نشانہ بنایا گیا۔ وہ جنہیں زیادہ دھمکیوں اور تشدد کا سامنا رہا ان میں عورتیں، بچے، اقلیتیں، خواجہ سراء اور انسانی حقوق کے محافظین تھے۔

قانون نافذ کرنے والے اہلکار بغیر کسی سزا اور جواب دہی کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرتے رہے۔ ہیومن رائٹس واچ کے مطابق آمر طرز عوامیت پسندوں نے حقوق کو اکثریت کی رائے میں رکاوٹ قرار دیا۔ زیادہ تر توجہ دہشت گردی سے نمٹنے پر رہی جس سے جرائم کے خلاف لڑنے، پولیس کی کارکردگی میں بہتری لانے اور کمیونٹی پولیس کی مہم متاثر ہوئی۔ لوگوں کو آسان اور بروقت انصاف کی فراہمی کے لیے فوجداری نظام انصاف میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔

تشدد

2016ء کے دوران دہشت گردی کی وجہ سے ہونے والی اموات میں پچھلے سال کی نسبت 45 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔ اسلام آباد میں موجود ایک تحقیقی ادارے سنٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) کے مطابق، 2016ء میں تشدد کی بنا پر ہونے والی اموات 2610 تھیں۔ جبکہ 2015ء میں یہ تعداد 4647 تھی۔ شدت پسندوں کی آماجگاہوں اور خونریز سازش کے خاتمے کے لیے جون 2014ء میں شمال مغربی قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ فوج کے ترجمان کے مطابق، آپریشن ضرب عضب میں 3500 عسکریت پسند مارے گئے اور 2108 زخمی ہوئے۔ آپریشن کے دوران 583 فوجی اہلکار ڈیوٹی کے دوران جاں بحق ہوئے۔ سی آر ایس ایس کے مطابق، درحقیقت 2014ء سے لے کر اب تک دہشت گرد حملوں میں 66 فیصد کمی آئی ہے۔ سی آر ایس ایس کی رپورٹ کے مطابق صوبہ پنجاب اور بلوچستان میں تشدد کے واقعات میں معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ بلوچستان میں سب سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں۔ یہاں 2015ء میں تشدد سے متعلقہ حملوں میں 719 اموات ہوئیں جبکہ 2016ء میں دس فیصد اضافہ کے ساتھ یہ تعداد 798 ہوگئی اور دوسرے نمبر پر پنجاب تھا جہاں 2016ء کے دوران 424 اموات ہوئیں جو کہ پچھلے چار سالوں میں سب سے زیادہ تعداد ہے۔

دونوں صوبے خودکش حملوں کی زد میں تھے جس وجہ سے یہاں اموات میں اضافہ ہوا۔ بلوچستان میں تین خودکش حملے ہوئے جن میں 186 لوگ مارے گئے جبکہ پنجاب میں ایک خودکش حملہ ایک پارک میں اس وقت ہوا جب وہاں بہت سے خاندان جمع تھے اور یہ ایسٹر کا

اتوار تھا اس حملے میں 75 لوگ نشانہ بنے جن میں بہت سے بچے بھی تھے۔

پشاور، لاہور، کوئٹہ اور کراچی جو کہ اپنے صوبوں کے دارالحکومت ہیں ان اضلاع میں شامل تھے جو کہ 2016ء میں تشدد کے واقعات میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔

اگست میں ایک خودکش حملے اور بعد میں ہونے والی فائرنگ میں 70 لوگ مارے گئے جن میں سے اکثر وکلاء تھے اور اسی حملے میں 130 سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ خیبر پختونخوا میں بہت سارے ٹارگٹڈ حملے ہوئے۔ پشاور میں مارچ کے دوران ایک بس پر اس وقت حملہ ہوا جب وہ سرکاری ملازمین کو لے کر جا رہی تھی۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں ہونے والے حملوں میں زیادہ تر نشانہ سکیورٹی فورسز کے ادارے اور سرکاری ملازمین تھے لیکن اکثر حملوں میں عام لوگ بھی نشانہ بنے۔

2015ء سے اگر موازنہ کیا جائے تو کوئٹہ اور لاہور کے علاوہ دارالحکومتی شہروں میں اس طرح کی اموات میں خاطر خواہ کمی دیکھنے میں آئی۔ کراچی جو کہ ابھی تک ملک کا سب سے پرتشدد ضلع ہے اس میں بھی اس طرح کی اموات میں خاطر خواہ کمی دیکھنے میں آئی۔

عسکریت پسندوں نے اس طرح کے حملوں میں دھماکہ خیز مواد، زیر زمین بارودی سرنگوں اور خودکش بمبار استعمال کیے۔ اس طرح کے حملوں میں رواں سال 474 لوگ مارے گئے جبکہ سال 2015ء میں یہ تعداد 251 تھی۔

سی آر ایس ایس کے مطابق فرقہ وارانہ تشدد میں بھی 20 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔ فرقہ وارانہ حملوں میں اس سال 241 لوگ نشانہ بنے جبکہ پچھلے سال یہ تعداد 304 تھی۔

عقیدے کی بناء پر تشدد میں بھی سندھ اور خیبر پختونخوا میں کمی دیکھنے میں آئی مگر فاٹا، بلوچستان اور پنجاب میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ جتنے لوگ مارے گئے ان میں سے 70 سے زائد خودکش حملوں کا نشانہ بنے۔ اس طرح کے واقعات میں سب سے زیادہ ہلاکتیں ایسٹر کے موقع پر لاہور میں گلشن اقبال پارک میں ہونے والے دھماکے میں ہوئیں۔ بظاہر اس حملے کا نشانہ مسیحی تھے مگر ہلاک ہونے والے 74 لوگوں میں سے مسیحی صرف 14 تھے۔ ستمبر میں مہمند ایجنسی میں مسجد میں ہونے والے خودکش حملے میں 28 لوگ مارے گئے۔ عقیدے کی بناء پر ہونے والے حملوں میں اس دفعہ ایسی جگہیں بھی نشانہ بنیں جہاں پہلے اس طرح کے حملے نہیں ہوئے تھے، جیسا کہ خضدار میں شاہ نورانی، میر پور ماتھیلو، حیدر آباد، بونیر اور بدین۔ شاہ نورانی کے دربار پر فرقہ وارانہ

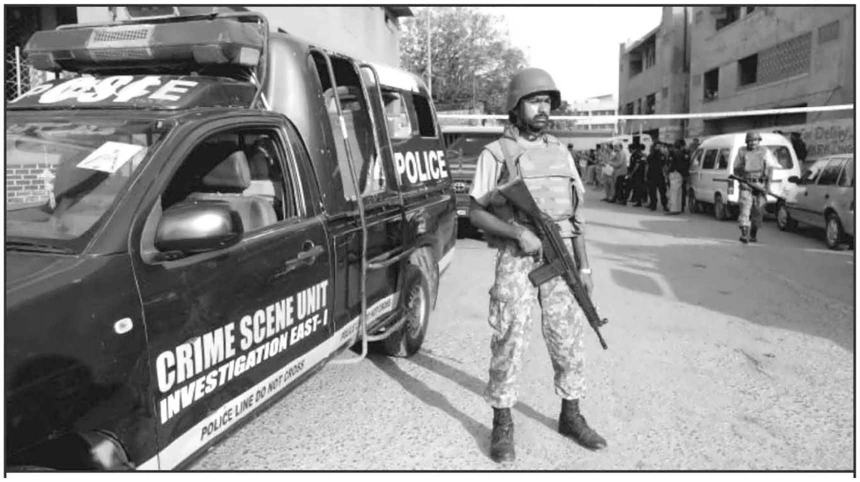

2016ء میں دہشت گردی کے رپورٹ ہونے والے حملوں میں سے 48 فیصد یعنی
211 حملوں کا ہدف سکیورٹی فورسز یا قانون نافذ کرنے والے ادارے تھے

حملے میں کم وبیش 54 نشانہ بنے جو ایک صوفی بزرگ کے مزار کی زیارت کرنے آئے تھے۔ اکتوبر میں ایک مسلح موٹر سائیکل سوار نے ایک چلتی بس پر فائرنگ کر دی جس میں ہزارہ برادری کے لوگ سوار تھے۔ اس حملے میں چار خواتین ہلاک ہوگئیں۔ یہ حملہ بھی بظاہر فرقہ وارانہ نفرت کا شاخسانہ لگتا ہے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی رپورٹ کے مطابق 48 فیصد حملے، یا 2016ء میں کیے گئے کل حملوں میں سے 211 حملوں کا نشانہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور سکیورٹی ایجنسیوں کے لوگ تھے۔ رپورٹ کے مطابق، ان حملوں میں 206 پولیس افسر مارے گئے۔ تقریباً 27 فیصد حملوں کا نشانہ قبائلی عمائدین اور رضا کار تھے جو عسکریت پسندی کے خلاف قائم امن کمیٹیوں کے رکن تھے، خاص طور پر فاٹا اور خیبر پختونخوا میں۔

رپورٹ کے مطابق، بلوچستان کے ''بدلتے ہوئے حالات'' کے پیش نظر سکیورٹی فورسز کو باغی بلوچ قوم پرستوں کی نسبت مختلف عسکریت پسندوں کی طرف سے زیادہ بڑے خطرات کا سامنا تھا۔ رپورٹ کے مطابق، قوم پرستوں کی طرف سے چھوٹے موٹے حملے ہوتے رہے مگر بڑے حملے لشکر جھنگوی اور پاکستانی طالبان کی طرف سے ہوئے۔

ملک میں پولیو ویکسینیشن ٹیموں پر بھی حملے ہوئے۔

جنوری میں کوئٹہ کے جنوب مغربی شہر میں پولیو ویکسینیشن سنٹر پر ہونے والے بم

دھماکے میں 15 لوگ مارے گئے۔ سات پولیس والے جن میں سے تین پولیو ورکرز کے تحفظ پر مامور تھے کراچی میں مارے گئے۔ آٹھ مسلح موٹر سائیکل سواروں نے تین پولیس گارڈز کے گروپ پر گولیاں برسائیں اور انہوں نے بعد میں ایک گاڑی پر بھی فائرنگ کی جو چار آفیسرز کو اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ خیبر پختونخوا میں ویکسینیٹرز پر ہونے والے مسلح حملوں سے نمٹنا ایک بہت بڑا چیلنج رہا ہے۔ ستمبر میں پشاور میں پولیو کے خاتمے کے لیے یونین کونسل کی سطح پر مبنی کمیٹی کے سربراہ کو عسکریت پسندوں نے مار دیا۔

2016ء کے دوران ہونے والے پرتشدد واقعات سے ظاہر ہوا کہ مسلح گروہ ابھی بھی وقفے وقفے سے خونریز حملے کرنے کے قابل تھے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کے مطابق ملک میں ''عدم استحکام پھیلانے والے عناصر'' ابھی متحرک ہیں اور ان کو تقویت دینے والے عناصر مضبوط ہیں۔

رپورٹ کے مطابق ''ملک کے مختلف حصوں میں موجود دولت اسلامیہ (آئی ایس آئی ایس) کے خیر خواہ اور تعاون کار بہت بڑا خطرہ ہیں'' اور ہمسایہ ملک افغانستان میں عدم استحکام سے بھی آئی ایس آئی ایس کو نئے لوگ بھرتی کرنے کا موقع ملا ہے۔

2014ء سے لے کر اب تک، آئی ایس آئی ایس نے بہت سے بم دھماکوں اور دوسرے حملے خاص طور پر بلوچستان اور سندھ میں، کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ آئی ایس آئی ایس نے ملک میں اپنا کوئی بلاواسطہ نیٹ ورک قائم کر نا رکھا ہے یا پھر اس نے ملک میں موجود عسکری تنظیموں جنہیں عرف عام میں آئی ایس آئی ایس کے خیر خواہ کہا جاتا ہے سے حملے کروائے تھے۔

جنوری میں پنجاب کے وزیر قانون نے سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلہ امور کے سامنے بیان دیا کہ پاکستان سے 100 سے زائد لوگ عسکریت پسندوں کی طرف سے لڑنے کے لیے مشرق وسطیٰ گئے ہیں جہاں وہ کافی مضبوط ہیں۔ تین خواتین اور بارہ بچے لاہور سے غائب تھے۔ بعد میں ان میں سے ایک خاتون نے اپنے شوہر کو ایک آڈیو پیغام بھیجا کہ وہ اور کچھ اور عورتیں شام میں موجود ہیں جہاں اس کا بیٹا آئی ایس آئی ایس کے عسکریت پسندوں کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

فروری میں ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو نے داخلہ امور سے متعلق سینٹ کی قائمہ

کمیٹی میں بیان دیا کہ آئی ایس آئی ایس ایک ابھرتا ہوا خطرہ ہے کیونکہ ملک میں بہت سے عسکری گروہ ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ دو دن بعد، وزیر داخلہ نے یہ کہہ کر اس بیان کو رد کر دیا کہ ملک میں آئی ایس آئی ایس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسرے دہشت گرد گروپ جو کہ ریاست کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہیں وہ آئی ایس آئی ایس کا نام استعمال کر کے ملک میں موت اور تباہیاں پھیلا رہے ہیں''۔

اگست میں، آئی ایس آئی ایس نے کوئٹہ میں وکلاء پر حملے کی ذمہ داری قبول کی۔ ستمبر میں، فوج کے سابق ترجمان نے اس بات کا اقرار کیا کہ ملک میں آئی ایس آئی ایس کا وجود تھا۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ 309 لوگ بشمول کچھ غیر ملکیوں کو دہشت گرد گروہ کے ساتھ منسلک ہونے کی بناء پر گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آئی ایس آئی ایس کا اسلام آباد ایئرپورٹ اور غیر ملکی سفارتخانوں پر حملے کا منصوبہ تھا جو کہ حکام نے ناکام بنایا۔ یہ کسی بھی سرکاری عہدیدار کی طرف سے پاکستان میں آئی ایس آئی ایس کی موجودگی کا پہلا اعتراف تھا۔ اکتوبر میں، آئی ایس آئی ایس نے کہا کہ کوئٹہ میں پولیس ٹریننگ سنٹر پر حملے کے پیچھے ان کا ہاتھ تھا جس میں 60 کیڈٹ مارے گئے تھے۔ جب کہ کوئٹہ کے سرکاری اہلکاروں کا موقف تھا کہ یہ حملہ کالعدم لشکر جھنگوی العالمی نے کیا تھا نہ کہ ایس آئی ایس نے کیا تھا۔ نومبر میں آئی ایس آئی ایس نے خضدار میں مزار پر دھماکے کی ذمہ داری بھی قبول کی اور پنجاب کے محکمہ انسداد دہشت گردی نے مقامی حکام کو خبردار کیا کہ آئی ایس آئی ایس سے وابستہ دہشت گرد اسلام آباد میں ذرائع ابلاغ کے چینلوں پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

ڈرون حملے

2016ء میں تقریباً ایک درجن پاکستانی تین ڈرون حملوں میں مارے گئے جو کہ امریکہ نے کیے تھے۔

9 جنوری کو، شمالی وزیرستان میں ایک گھر پر ڈرون حملہ کیا گیا جس میں پانچ لوگ مارے گئے۔ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے ایک کمانڈر نور سعید کے بارے میں کہا گیا کہ وہ بھی اس حملے میں مارا گیا تھا۔ دو ازبک لوگوں کے بارے میں بھی کہا گیا کہ وہ بھی اس حملے میں مارے گئے تھے۔ 22 فروری کو، ایک اور ڈرون حملہ کیا گیا جس میں تین یا چار لوگ مارے گئے اور ایک زخمی ہو گیا۔ لوئیر کرم ایجنسی کے قبائلی علاقے میں بہت سے گھر اور گاڑیاں حملے کا نشانہ بنی

تھیں۔ مقامی سرکاری حکام کے مطابق 21 مئی کو افغان طالبان رہنما ملا اختر منصور اور ایک ٹیکسی ڈرائیور جو گاڑی چلا رہا تھا کو ڈرون حملے میں مار دیا گیا۔ یہ بلوچستان میں پہلا اور فاٹا سے باہر چھٹا ڈرون حملہ تھا۔ جائے وقوعہ پر ملنے والے پاسپورٹ سے معلوم ہوا کہ ملا اختر منصور ابھی ابھی ایران سے آیا تھا۔ حکومت نے کہا کہ ڈرون حملہ پاکستان کی حاکمیت کی خلاف ورزی ہے۔

حملے کا شکار ہونے والے لوگوں کی شناخت کرنے کا کوئی آزاد ذریعہ دستیاب نہیں تھا کیونکہ صحافیوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں پر ڈرون حملے کیے گئے لیکن پھر بھی ایچ آر سی پی کو جس حد تک معلومات میسر ہو سکیں۔ ان کے مطابق ان حملوں میں کچھ معصوم لوگ ضرور مارے گئے جن کا اس مسلح جنگ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ کمیشن یہ معلوم نہیں کر سکا کہ تناسب کیا تھا کہ کتنے معصوم لوگ مارے گئے اور کتنے مسلح انتہا پسند۔

ہسپتال اور سکول

سکولوں اور ہسپتالوں میں ہونے والے فائرنگ کے مختلف واقعات سے وہاں سکیورٹی کی ناقص صورتحال واضح تھی۔

جنوری میں خیبر پختونخوا میں باچا خان یونیورسٹی چارسدہ میں کچھ نامعلوم مسلح دہشت گردوں نے معصوم طالب علموں اور اساتذہ پر اس وقت فائر کھول دیا جب وہ معروف کارکن اور اسی سیاسی رہنما جس کے نام پر یونیورسٹی ہے کی برسی کے موقع پر مشاعرے کا اہتمام کر کے انہیں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ کالعدم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) گیدر گروپ کے عمر منصور نے اپنے فیس بک صفحہ کے ذریعے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

گجر خان میں ایک سرکاری سکول میں دو طالب علم گولیاں لگنے سے اس وقت زخمی ہوئے جب ایک مسلح گروہ نے اندر گھس کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

ستمبر میں، پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغ عامہ کے کم از کم تین طالبعلم زخمی ہو گئے جب دو گروہوں میں تصادم ہوا۔

دسمبر میں، پنجاب یونیورسٹی میں انتظامیہ اور ایک طلبہ گروپ میں جھگڑے کے دوران کم از کم دس سکیورٹی گارڈ اور آٹھ طالب علم زخمی ہو گئے۔

یہ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب یونیورسٹی انتظامیہ نے طلبہ کی طرف سے منعقد کردہ سیمینار یہ کہہ کر بند کرنے کی کوشش کی کہ اس سیمینار منعقد کو کرنے کی پیشگی اجازت نہیں لی گئی تھی۔

ایک آدمی اس وقت زخمی ہوگیا جب ایک مسلح شخص نے جناح ہسپتال لاہور میں ایک مریض پر گولی چلائی۔ پولیس کے مطابق مسلح شخص کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں دو مسلح گروہوں کے درمیان تصادم میں ایک وارڈ ماسٹر گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔

ذرائع ابلاغ

صحافیوں کو حکام کی طرف سے تحفظ نہ ہونے کے برابر ملا اور وہ اکثر خطرناک حملوں اور دھمکیوں کا شکار رہے۔ کراچی، حیدرآباد، لاہور اور راولپنڈی میں صحافی اور میڈیا ہاؤسز ممتاز قادری کے حمایتیوں کے حملوں کا نشانہ بنے۔ ممتاز قادری کو گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو قتل کرنے کے جرم میں فروری میں پھانسی دی گئی۔ حکومت نے میڈیا کو واقعہ کی کوریج کرنے سے روکا تھا جبکہ دوسری طرف قادری کے حمایتی اس بات پر غصہ تھے کہ انہیں میڈیا کوریج کیوں نہیں دی گئی لہذا انہوں نے صحافیوں اور میڈیا ہاؤسز پر پتھروں اور ڈنڈوں سے حملہ کیا گیا۔ بزنس ریکارڈر گروپ کا ٹی وی چینل ''آج'' ان میں سے ایک تھا جن پر حملے کیے گئے۔ مظاہرین نے حیدرآباد میں ایک کاؤنٹر کو جلا دیا اور چار صحافیوں اور ایک پریس کلب کے ملازم کو زخمی کر دیا۔ میڈیا کی ٹیموں کو لاہور کی انارکلی بازار میں پتھروں سے نشانہ بنایا گیا جس سے نیوٹی وی اور اب تک ٹی وی کی گاڑیوں کی ونڈ سکرینیں ٹوٹ گئیں۔

13 جنوری کو اسلام آباد کے وسط میں ایک ٹی وی چینل کے دفتر پر آتش گیر مادے سے حملہ کیا گیا۔ چند ہی دنوں میں، 16 جنوری کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک صحافی محمد عمر کا قتل کیا گیا اور 19 جنوری کو جمرود میں ٹی وی کے ایک صحافی محبوب شاہ آفریدی کو مار دیا گیا۔

22 اگست کو کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ کے لوگ احتجاج کے دوران جب جذباتی ہوگئے تو انہوں نے وہاں پر موجود تین کیمرہ مینوں کو زخمی کر دیا جو ان کے احتجاج کو کور کر رہے تھے۔ مظاہرین نے اے آر وائی نیوز چینل اور نیوٹی وی کے دفاتر پر بھی حملے کیے۔ سماء ٹی وی کی خبریں جمع کرنے والی گاڑی کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

ہجوم کی طرف سے تشدد

جب میڈیا میں یہ بات رپورٹ ہوئی کہ بچوں کے اغواء کے واقعات رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تو ہجوم کی طرف سے مبینہ اغواء کاروں اور پولیس پر تشدد کے بہت سے واقعات

رونما ہوئے۔فیصل آباد میں، لوگوں نے ایک پولیس والے کو اس بات پر مارا پیٹا کہ وہ ان کے گمشدہ بچے کو بازیاب نہیں کرواسکا۔ لاہور میں ایک اور ہجوم نے ایک ماں کو مارا پیٹا جو کہ اپنے دس سالہ بچے کے ساتھ گلی میں چل رہی تھی۔ بچوں کے اغواء کے حوالے سے پھیلنے والے خوف وہراس کے نتیجے میں کراچی میں تین لوگ ہجوم کی مار پیٹ کا نشانہ بنے جنہیں لوگوں نے غلطی سے اغواء کار سمجھ لیا تھا۔ جن تین لوگوں کو مار پڑی ان میں سے ایک سرکاری افسر، دوسرا ایک سیکیورٹی گارڈ اور تیسرا بھکاری تھا۔

اٹک کے ایک گاؤں میں لوگوں نے ایک چور کو مار مار کر ہلاک کردیا جو کہ مویشی چرا رہا تھا جبکہ اس کا ساتھی فرار ہوگیا۔ مشتبہ چوروں نے گاؤں کے دو لوگوں کو مزاحمت کرنے پر زخمی کردیا۔

عاملوں کی طرف سے تشدد

پنجاب میں عاملوں کی طرف سے کیے گئے تشدد کی رپورٹس موصول ہوئیں۔ فروری میں ڈیرہ غازیخان میں ایک عامل اور اس کے دو شاگردوں کو گرفتار کیا گیا جنہوں نے ایک عورت کو مار مار کر ہلاک کردیا تھا۔ اپریل میں، بہاولنگر میں ایک عامل اپنے ایک نوجوان کی زبان کاٹ دی اور اسے لوہے کے راڈ اور کوڑے سے مارتا رہا۔ مئی میں، اسی طرح کے دو عاملوں نے اوکاڑہ میں ایک خاتون کو مار مار کر ہلاک کردیا۔ ساہیوال میں ایک خودساختہ پیر نے ایک تیرہ سالہ جوان بچی کے جن نکالتے ہوئے اسے زندہ جلادیا۔

جرائم

اسلام آباد جو کہ صرف 20 لاکھ آبادی کا شہر ہے، میں 2016ء میں 96 قتل ہوئے جن میں سے 11 صرف دسمبر کے مہینے میں ہوئے۔ پولیس نے 2016ء میں قتل کے کم ازکم 23 مقدمات کو حل کیا اور عدالتوں میں فرد جرم جمع کرائی۔کم ازکم 252 کاریں اور 179 موٹرسائیکلیں چوری ہوئیں۔ بلوچستان میں کل 2305 جرائم کی وارداتیں رپورٹ ہوئیں جس میں 200 کیسز اغواء کے تھے اور 1547 جرائم جائیداد سے متعلق، ٹارگٹ کلنگ کے 78 واقعات میں 36 کا نشانہ پولیس اہلکار بنے۔

2016ء میں گلگت بلتستان میں، قتل کے 23 مقدمات درج ہوئے جس میں 13 مقدمات عزت کے نام پر قتل کے تھے۔ پولیس پر 29 حملے ہوئے۔ 52 چوری کے، ایک ڈکیتی کا،

29 اغواء کے اور ایک گینگ ریپ کا مقدمہ رجسٹرڈ ہوا۔

خیبر پختونخوا میں جنوری سے نومبر 2016ء تک 2472 قتل، 148 زنا بالجبر، 185 لواطت، 220 اغواء، 21 اغواء برائے تاوان، 2125 بچوں کے اغواء، 862، 236 پولیس پر حملے، 1588 ڈاکہ زنی، 766 نوسربازی، 1111 چوری، 708 گاڑی چوری، 239 کاریں چھیننے، 95 بھتہ خوری اور تین توہین مذہب کے مقدمات رجسٹر ہوئے۔ سال کے پہلے دس مہینوں میں کم از کم 187 خواتین کے قتل ہوئے جن میں سے 40 غیرت کے نام پر تھے۔ یہ قتل پچھلے سال کی نسبت کچھ زیادہ تھے کیونکہ 2015ء میں اس عرصہ کے دوران ان کی تعداد 185 تھی۔

پنجاب میں 2016ء میں جرائم کے 50,388 مقدمات رجسٹرڈ ہوئے جبکہ 2015ء میں یہ تعداد 49,800 تھی۔ 2016ء میں جائیداد کے خلاف جرائم کے 80,319 مقدمات رجسٹرڈ ہوئے جبکہ 2015ء میں اس نوعیت کے مقدمات کی تعداد 84,518 تھی۔ ان میں سے 25,860 مقدمات ابھی تک زیر تفتیش تھے جن میں سے، پولیس کے بقول، 22,271 کیسز کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

پنجاب میں جنسی تشدد، اجتماعی تشدد اور اغواء کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ البتہ قتل، اقدام قتل، لوٹ مار، چوری، ڈکیتی اور گاڑیوں کی چوری کے رپورٹ ہونے والے واقعات میں 2016ء میں 2015ء کی نسبت تھوری سی کمی واقع ہوئی ہے۔ 2015ء کی نسبت 2016ء میں سزا دہی کے تناسب میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ پولیس کے مطابق، 2016ء میں کم از کم 69,069 مجرموں کو سزائیں دی گئیں جبکہ 70,059 کو بے گناہ قرار دیا گیا۔ جبکہ 2015ء میں کم از کم 68,718 مجرموں کو سزا دی گئی اور 65,260 سے زائد کو بے گناہ قرار دیا گیا تھا۔

2016ء میں مقدمات ''جو مقامی اور خصوصی'' قوانین کی خلاف ورزیوں کے تحت رجسٹرڈ کیے گئے ان کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پنجاب پولیس نے لوکل اور خصوصی قوانین کی خلاف ورزی کے تحت 2016ء میں 150,574 مقدمات رجسٹر کئے جبکہ 2015ء میں اس نوعیت کے کم از کم 144,357 مقدمات رجسٹرڈ کیے گئے۔

پچھلے سال کی نسبت 2016ء میں قتل کے واقعات میں کم و بیش 9 فیصد کمی دیکھنی میں آئی۔ 2015ء میں قتل کے 4522 مقدمات رپورٹ ہوئے تھے جبکہ 2016ء میں مختلف

گلگت ۔ بلتستان میں قتل کے 23 مقدمات درج ہوئے جن میں 16 قتل عزت کے نام پر کیے گئے تھے

واقعات میں 4112 افراد قتل ہوئے۔صوبائی پولیس نے ابھی 152 اندھے قتلوں کا سراغ بھی لگانا ہے۔اکثر اندھے قتلوں کا نشانہ خواتین تھیں جو کہ صوبے کے مختلف حصوں میں ماری گئیں۔

2016ء میں اغواء کے 1334 مقدمات پولیس نے درج کئے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 13320 تھی۔اغواء برائے تاوان کے مقدمات میں 59 فیصد کمی آئی۔2016ء میں اغواء برائے تاوان کے صرف 35 مقدمات سامنے آئے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 78 تھی۔

2016ء میں اغواء کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا والدین نے گھر سے بھاگ جانے والے بچوں کے حوالے سے پولیس میں شکایات درج کرائیں کہ ان کے بچے اغواء ہوگئے ہیں۔پولیس نے گھر سے بھاگے ہوئے 95 فیصد سے زائد بچے تلاش بازیاب کر لیے تھے۔

صوبائی پولیس کے پاس 2016ء میں تقریباً 2942 ریپ مقدمات درج کئے گئے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 2737 تھی۔اسی طرح پچھلے سال پولیس نے اجتماعی زیادتی کے 223 مقدمات درج کئےاور 2015ء میں بھی ان مقدمات کی تعداد اتنی ہی تھی۔

2016ء میں صوبہ بھر میں 951 ڈکیتی کے مقدمات رجسٹرڈ ہوئے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 1537 تھی۔19 نومبر کو لاہور میں ایک ڈکیتی کے دوران مزاحمت پر پانچ لوگ جان سے گئے اور دو زخمی ہوگئے۔ملزمان واقعہ کے کچھ ہی دن بعد مبینہ پولیس مقابلے میں مار

دیے گئے۔ پولیس کو ابھی بھی 80 ڈکیتی کی وارداتوں کا سراغ لگانا باقی ہے اور 133 ڈکیتی کے مقدمات ابھی زیرِ تفتیش ہیں۔

رہزنی کے واقعات میں کچھ کمی دیکھنے کو آئی۔ 2015ء میں یہ واقعات 16,388 تھے جبکہ 2016ء میں یہ تعداد کم ہو کر 13,675 ہو گئی۔ جبکہ پولیس کو رہزنی کے 2,627 سے زائد واقعات کا سراغ لگانا ابھی باقی ہے جو کہ 2016ء کے دوران صوبہ بھر سے رپورٹ ہوئے۔ تقریباً 2,128 رہزنی کے مقدمات ابھی زیرِ تفتیش ہیں۔

دسمبر میں، لاہور کے علاقے فیصل ٹاؤن میں سگنل پر ایک رہزنی کی ویڈیو منظرِ عام پر آئی جس نے لاہور پولیس کی سٹریٹ کرائم سے نمٹنے کی قابلیت اور اہلیت پر سوال کھڑے کر دیے۔ ویڈیو میں دکھایا گیا کہ ڈاکوؤں نے کار سواروں کو دھمکایا، ہوا میں ایک گولی چلائی، کار میں موجود خاتون سے زیور چھینا اور موٹر سائیکل پر فرار ہو گئے۔ اس طرح کی وارداتیں روز کا معمول تھیں۔ پاکستان کے اکثر شہروں میں سٹریٹ کرائم کی وارداتیں بڑے پیمانے پر ہوتی رہیں۔ جدید ہتھیاروں اور تربیت پر بڑی رقوم خرچ کرنے کے باوجود سٹریٹ کرائم کے واقعات میں کمی نہ آئی۔ لاہور کی ڈولفن فورس جس کا بہت زیادہ چرچا کیا گیا تھا، بھی اپنے قیمتی موٹر سائیکلوں پر سوائے ظاہری دکھاوے کے کوئی خاطر خواہ بہتری نہ لا سکی۔ نومبر میں، خیبر پختونخوا میں ''سٹی پٹرول فورس'' کا آغاز کیا گیا جس کا کام کسی جرم کے ہونے کی اطلاع پر، ایمرجنسی صورتحال یا پھر سڑک پر حادثات کے دوران سب سے پہلے پہنچنے کا ہے۔

پنجاب میں 2016ء کے دوران نقب زنی کے 11,627 مقدمات رپورٹ کیے جبکہ 2015ء میں یہ تعداد کم از کم 12,727 تھی۔ 2016ء کے دوران چوری کے کم از کم 1375 کیسز درج کیے گئے جبکہ 2015ء میں یہ تعداد 1681 تھی۔ 2016ء میں گاڑیوں کی چوری کے 16,042 واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ 2015ء میں یہ تعداد 17,805 تھی۔

اسی طرح 2016ء میں پولیس نے گاڑیاں چھیننے کے 3857 واقعات رپورٹ کیے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 4903 تھی۔

سندھ میں 2016ء میں بھتہ خوری کے 188 مقدمات جسٹرڈ ہوئے جو کہ 2015ء کی نسبت 27 فیصد کم ہیں۔ 2015ء میں یہ تعداد 256 تھی۔ قتل کے واقعات میں بھی خاطر خواہ کمی دیکھنے میں آئی۔ 2016ء کے دوران قتل کے 1482 واقعات سامنے آئے جبکہ

پنجاب میں جنسی تشدد، اجتماعی جنسی تشدد اور اغواء کے واقعات میں اضافہ دیکھا گیا

2015 میں یہ تعداد 2,087 تھی۔اسی طرح رہزنی کی وارداتوں میں بھی 21 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔2016 میں 641 واقعات ہوئے جبکہ 2015ء میں ان کی تعداد 811 تھی۔اغواء برائے تاوان کے واقعات میں بھی 12 فیصد کمی دیکھنے کو ملی۔2016ء میں ان واقعات کی تعداد 47 رہی جبکہ 2015ء میں یہ تعداد 53 تھی۔جون 2016ء میں چیف جسٹس ہائی کورٹ سندھ کا بیٹا تحریک طالبان پاکستان کے ایک گروہ نے کراچی سے اغواء کیا جنہیں بعد میں خیبر پختونخوا منتقل کر دیا گیا۔پاکستانی فوج نے انہیں ٹانک کے قریب ایک گاؤں میں چھاپہ مار کر برآمد کیا۔ جہاں سے عسکریت پسند اسے سرحد پار افغانستان منتقل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک رپورٹ کے مطابق کراچی میں، 2016ء میں 45 ٹارگٹ کلنگ کے واقعات رجسٹرڈ کیے جو کہ گزشتہ برس کی نسبت 72 فیصد کمی ہے کیونکہ 2015ء میں یہ تعداد 159 تھی۔ پاکستان رینجرز کی سالانہ آپریشن رپورٹ کے مطابق ستمبر 2013ء سے لے کر اب تک ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں 90 فیصد کمی وقوع پذیر ہوئی۔پولیس نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ٹارگٹ کلنگ کے 12 اہم مقدمات حل کیے جن میں فوج اور رینجرز کے جوانوں پر حملہ، وکلاء اور پولیس پر حملے اور امجد صابری کے قتل کا مقدمہ شامل ہے۔البتہ سٹی پولیس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ 2016ء میں وہ کچھ اہم کیسز کا سراغ نہیں لگا سکے۔ٹارگٹ کلنگ کے ان واقعات میں بوہرا کمیونٹی کے دو لوگ، ڈسٹرکٹ سنٹرل سے دیو بندی مکتبہ فکر 6 کے لوگ، احمدی کمیونٹی کے بعض لوگ اور ایک پولیس اہلکار شامل ہیں۔

کراچی میں بڑے جرائم جیسا کہ اغواء برائے تاوان اور بھتہ خوری میں واضح کمی دیکھنے میں آئی۔موجوداعدادوشمار کے مطابق اغواء برائے تاوان کے واقعات میں 57 فیصد کمی دیکھنے کوآئی بہ نسبت 2015ء کے۔2015ء میں کراچی میں اغواء برائے تاوان کے 49 جبکہ 2016ء میں 21 واقعات پیش آئے۔بھتہ خوری کے واقعات میں گزشتہ برس کی نسبت 34 فیصد کمی آئی۔ 2015ء میں ان واقعات کی تعداد 224 جبکہ 2016ء میں 146 تھی۔تاہم کراچی پولیس اور شہریوں و پولیس میں رابطہ کار کمیٹی (سی پی ایل سی) کے فراہم کردہ سرکاری اعدادوشمار کے مطابق، بینکوں میں ڈاکہ زنی اور موٹر سائیکلوں اور موبائل فونوں کی چوری و چھیننے کے واقعات میں، 2016ء کے دوران 2015ء کی نسبت اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔

بچے

ایک غیر سرکاری تنظیم ساحل کے مطابق سال 2016ء کے دوران اوسطاً 11 بچے روزانہ جنسی بدفعلی کا شکار ہوئے اور 2016ء کے دوران 100 مظلوم جنسی زیادتی کے بعد قتل کردیے گئے۔ 86 قومی، علاقائی اور لوکل اخبارات پر نظر رکھنے اور ان سے ترتیب دیئے گئے اعدادوشمار کے مطابق 2016ء میں بچوں سے جنسی زیادتی کے واقعات دل دہلا دینے والے ہیں جو کہ تعداد میں 4139 ہیں۔ان کل واقعات میں سے 78 فیصد رجسٹرڈ کیے گئے۔ 32 فیصد رجسٹر نہ ہوسکے۔جبکہ پولیس نے 142 کیسز کی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کردیا۔تحقیق کے مطابق 2016ء میں 1445 جبری قید کے واقعات رپورٹ ہوئے، جبکہ 502 ریپ کیسز، 453 غیر فطری جنسی زیادتی، 217 اجتماعی جنسی زیاتی، 268 غیر فطری اجتماعی جنسی زیادتی اور 362 بچوں کے ساتھ ہونے والی جنسی بدفعلی کے واقعات تھے۔ پنجاب میں جنسی زیادتی اور اجتماعی جنسی زیادتی اور اغواء کے واقعات میں اضافہ ہوا۔

انسانی حقوق کے محافظین

تین انسانی حقوق کے محافظین، ظفر لنڈ، خرم ذکی اور علیشاء کو 2016ء میں مار دیا گیا۔ خرم ذکی جو کہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق اور امن کے حوالے سے کام کرنے کے لیے مشہور تھے، کو دو حملہ آوروں نے ہلاک کردیا۔خیبر پختونخوا میں خواجہ سراؤں کے حقوق اور تحفظ کے فروغ کے لیے متحرک گروہ کے ایک رکن کو موت کی دھمکیاں دی گئیں، ہراساں کیا گیا اور اس کے گھر پر فائرنگ

اور حملہ کیا گیا۔ مقامی پولیس سے مدد لینے کی متعدد کوششوں سے ناکامی کے بعد مئی میں اس تنظیم کی پشاور کوآرڈینیٹر علیشا کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اس تنظیم کی پانچویں کارکن تھیں جن پر جان لیوا پرتشدد حملے کیئے گئے۔ جولائی میں ایک سرائیکی دانشور، انسانی حقوق کے کارکن، مصنف اور ہیرک ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن کے چیف ایگزیکٹو ظفر لنڈ کو کوٹ ادو میں اپنے گھر کی دہلیز پر مار دیا گیا۔

خواجہ سراء

ایک غیر سرکاری تنظیم کے مطابق خیبر پختونخوا میں 2016ء میں خواجہ سراؤں پر تشدد، حملے اور دھمکیوں کے 90 مقدمات رپورٹ ہوئے۔ تیسری جنس کے لوگ پولیس، سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور مذہبی اور شدت پسند گروہوں کی زیادتی کا نشانہ بنے۔ 14 واقعات میں پولیس اہلکار ملوث پائے گئے۔

2016 کے دوران خیبر پختونخوا میں خواجہ سراؤں پر تشدد، حملوں اور دھونس و دھمکی کے کم از کم 90 واقعات رپورٹ ہوئے

لوگوں کی خواجہ سراؤں کے ساتھ زیادتی کے واقعات پنجاب سے بھی رپورٹ ہوئے۔

بینک

2016ء کے دوران کراچی، حیدرآباد، سرگودھا اور کوئٹہ میں متعدد بینک ڈکیتیوں کی وارداتیں ہوئیں۔ اسی طرح کی ایک بینک ڈکیتی میں حیدرآباد میں تین ڈاکو پولیس مقابلہ میں مارے گئے۔ سرگودھا میں ایک مسلح شخص ایک سکیورٹی گارڈ کو مار کر اور دو کو زخمی کر کے ایک پرائیویٹ بنک سے بھاری رقم لے کر نکل گیا۔ کوئٹہ میں پولیس کے مطابق دو سکیورٹی گارڈز اپنے ساتھی گارڈز کو بے ہوش کر کے ایک پرائیویٹ بنک سے پانچ کروڑ روپے (5 ملین روپے) کی بھاری رقم لے اڑے۔

جون میں سینیٹ کے ایک پینل کی طرف سے جمع کرائی گئی دستاویز کے مطابق دوسرے ممالک میں مقیم پاکستانیوں کو اپنی جائیداد سے متعلق اپنے ملک میں قبضوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پولیسنگ

امن وامان کی صورتحال اتنی خراب رہی کہ پولیس کے نظام میں بہتری لانے کے لیے بھاری رقوم خرچ کرنے کے باوجود تمام صوبوں کے عوام میں عدم تحفظ کا رجحان بڑھتا رہا۔ خاص جرائم سے نمٹنے کے لیے پولیس کے ڈھانچے پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور بروقت اور موثر کارروائیاں کر کے پولیس پر عوام کا اعتماد بحال کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کے نظام میں فوری اصلاحات پر زور دیا گیا ہے۔

اپریل میں سات پولیس اہلکاروں کو مار دیا گیا۔ پنجاب، راجن پور میں ایک جرائم پیشہ گینگ کے خلاف آپریشن کے دوران پنجاب پولیس کی بہت سی خامیاں بے نقاب ہوئیں۔ جرائم پیشہ گروہ نے سات پولیس اہلکاروں کو مار دیا اور 24 پولیس والوں کو یرغمال بنالیا۔ گینگ کے پاس پولیس سے زیادہ اسلحہ تھا اور اس نے پولیس کو بری طرح شکست دی۔ پولیس کی ہلاکتوں کو علاقے میں ہونے والے فوجی آپریشن کی بازگشت میں دبا دیا گیا۔ کراچی جہاں پچھلے کچھ سالوں میں سینکڑوں پولیس والے قتل کیے جا چکے ہیں۔ رینجرز والے پولیس کی ڈیوٹی کر رہے ہیں اور انہیں بھی اسی طرح نشانہ بنایا جاتا ہے۔ رینجرز نے اسلام آباد میں بھی پٹرولنگ اور سکیورٹی کے اقدامات اپنے ہاتھ لے لیے ہیں۔

بلوچستان میں ایف سی کو اپنے بنیادی مینڈیٹ جو کہ سرحد پر موثر کنٹرول کا ہے سے ہٹا کر روایتی پولیس کی ذمہ داری پر مامور کر دیا گیا ہے۔ پولیس کا دائرہ کار جو کہ 2007ء تک پورے صوبے پر تھا کم ہوتے ہوتے پانچ فیصد علاقے تک رہ گیا ہے۔ اس طرح کا مسلح قانون کا نفاذ شاید وقتی طور پر تو حالات کو بہتر کر دے مگر مستقل اور دیرپا امن کے لیے شاید یہ چیز سازگار نہ ہو۔ لاہور میں پولیس ٹریننگ سکول پر حملے کے سات برس بعد بھی قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کو ان کے اپنے تربیتی مراکز میں تحفظ دینے میں ناکامی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ریاست اپنے اداروں کی صلاحیت میں بہتری لانے میں ناکام ہے۔ بلوچستان کا اکثر علاقہ بہت سے پاکستانیوں کے لئے نو گو ایریا بنا رہا اور سکیورٹی کی حکمت عملیاں صوبہ میں حالات کو معمول پر لانے میں ناکام رہیں، امن قائم کرنا تو دور کی بات ہے۔ سالوں تک فورس کو سیاسی بنانے سے عملے کے معیار اور جرائم سے نمٹنے کی صلاحیتوں پر منفی اثر پڑا ہے۔

شعبہ پولیس میں اب قانون نافذ کرنے اور عوام کے تعاون، دونوں کی ضرورت

ہے۔عوام کے تعاون سے پولیس کو جرائم کی روک تھام اور نشاندہی میں مدد ملے گی۔کوئی بھی صوبائی حکومت پولیس اصلاحات میں دلچسپی لیتی نظر نہیں آئی۔خیبر پختونخوا حکومت نے نام نہاد پولیس اصلاحات کا شور مچایا مگر اس میں بھی دیر پا انتظامی اور قانونی تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔سندھ اور بلوچستان پولیس انگریز دور کے پولیس ایکٹ 1861 کے تحت کام کرتی رہیں۔پنجاب اور خیبر پختونخوا میں قانون کا نفاذ پولیس آرڈر 2002ء کے تحت رہا لیکن سال 2016ء کے آخر میں خیبر پختونخوا حکومت نے ایک قانون منظور کیا جس کا مقصد بھرتی اور ترقی کا شفاف طریقہ کار قائم کرنا تھا اور پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں کے تبادلے اور تقرری کا اختیار آئی جی پولیس کو دے دیا گیا جبکہ پہلے یہ اختیار وزیر اعلیٰ کے پاس ہوتا تھا۔اگرچہ قانون میں ان پولیس افسروں کے خلاف سزائیں بڑھا دی گئی ہیں جو مختلف جرائم جیسا کہ غیر قانونی دخل اور تشدد میں ملوث پائے جائیں مگر پھر بھی نگرانی اور احتساب کے کچھ پہلوؤں پر بات ہو سکتی ہے۔

2016ء میں پولیس فورس کی صلاحیتوں میں اضافہ کے لیے تفتیش کے جدید طریقہ کار اور فورنزک تجزیہ میں بہتری کے لیے کوششیں کی گئیں۔پولیس نے جرائم سے نمٹنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا۔پنجاب کے انسداد دہشت گردی کے خودکار نظام، جرائم سے متعلق ڈیجیٹل ڈیٹا بیس اور مجرموں سے متعلق تفصیلات ڈیجیٹائز کرنے سے بہت سے اشتہاری گرفتار کیے گئے جو کہ پہلے بچ نکلتے تھے۔

260,000 مجرموں کے انگلیوں کے نشان، تصاویر، اور دوسری متعلقہ تفاصیل کریمنل ریکارڈ مینجمنٹ سسٹم میں داخل کی گئیں جبکہ جو ریکارڈ بچ گیا اس پر کام جاری تھا۔

ایک اہم پیش رفت شہریوں کی بائیو میٹرک تصدیق کے لیے جدید آلے کا استعمال کرنا تھا۔تاہم اس آلے میں ایک کمی یہ ہے کہ مشکوک آدمی کی شناخت کے لیے اسے شناختی کارڈ اور انگلیوں کے نشان دونوں چیزیں درکار ہوتی ہیں۔

زمبابوے کرکٹ میچ دیکھنے والے لوگوں کو اندر جانے دینے کے لئے، ان لوگوں کو معاوضہ دینے کے لیے جن کے گھر، دکان اورنج ٹرین میٹرو پروجیکٹ سے متاثر ہوئے اور رائے ونڈ کے سالانہ مذہبی اجتماع کے لئے بائیو میٹرک تصدیق کا آلہ استعمال کیا گیا تھا۔

اکتوبر میں لاہور کی نگرانی کے لئے پنجاب سیف سٹی پروجیکٹ کے تحت 12 ارب کی لاگت سے 800 کیمرے نصب کیے گئے۔

پولیس اور انسانی حقوق

2016 میں پولیس کے خلاف ماورائے عدالت قتل، زیر حراست تشدد، اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی بہت سی شکایات رپورٹ ہوئیں۔ پولیس کو شاذ و نادر ہی ان خلاف ورزیوں کے لیے جوابدہ ٹھہرایا گیا۔ پولیس گردی کا شکار ہونے والے لوگوں کو انصاف کے حصول میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس خود بھی ان قوانین سے مکمل طور پر واقف نہیں بھی جو بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق تھے۔ جیسا کہ گھریلو تشدد، بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق قوانین۔ یہی وجہ تھی کہ ان قوانین پر صحیح معنوں میں عملدرآمد نہیں کیا جا سکا۔

پولیس مقابلے

پولیس مقابلوں میں ہلاکتوں کی بناء پر پاکستان کو ہمیشہ بدنامی کا سامنا کرنا پڑا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مجرموں کے خاتمے کے لیے بڑے پیمانے پر پولیس مقابلوں کا کھیل جاری رکھا۔

پنجاب پولیس کے مطابق انہوں نے صوبہ بھر میں سال 2016ء میں 291 پولیس مقابلوں میں 340 مجرموں کو مارا۔ جبکہ 2015ء میں 394 پولیس مقابلوں میں 457 مجرموں کو ہلاک کیا گیا تھا۔ پنجاب کے شعبہ انسداد دہشت گردی کے مطابق انہوں نے سکیورٹی آپریشنز کے دوران درجنوں مشکوک دہشت گرد مارے جو کہ بعد میں شناخت کے دوران مختلف کالعدم تنظیموں اور دہشت گردوں کے کمانڈر نکلے۔ 2016ء کے دوران پنجاب میں مجرموں سے لڑتے ہوئے 25 پولیس اہلکار بھی جان کی بازی ہار گئے۔ 2015ء میں مجرموں سے لڑتے ہوئے 19 پولیس اہلکار جاں بحق ہوئے تھے۔ پولیس نے مقابلوں کے دوران تقریباً 169 مجرم بھی گرفتار کیئے۔

سندھ پولیس نے 1896 پولیس مقابلوں میں 248 ڈکیت اور دیگر مجرم ہلاک کیے اور 10,876 گرفتار کیئے۔ پولیس نے ان مقابلوں کے دوران 96 دہشت گرد ہلاک اور 424 کو گرفتار کیا، اسی طرح 11 اغواء کاروں کو ہلاک اور 28 کو گرفتار کیا اور 2016ء کے

دوران سندھ میں 41 پولیس اہلکار فرائض کے انجام دہی کے دوران مارے گئے۔ سندھ پولیس نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے میٹروپولیٹن شہر میں 2016ء کے دوران 318 مجرموں کو ہلاک کیا۔ جن میں سے 73 مبینہ طور پر دہشت گرد تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے، 60 کا تعلق لیاری گینگ سے تھا، 183 ڈکیت اور 8 اغواء کار تھے۔

قانون نافذ کرنے والوں کے مطابق انہوں نے 2016ء کے دوران مختلف کارروائیوں میں بلوچستان میں 229، فاٹا میں 315، خیبر پختونخوا میں 40، اور گلگت بلتستان میں چار دہشت گردوں کو ہلاک کیا۔

پولیس مقابلوں میں ہلاکتیں قابل قبول اور معمول کا حصہ رہیں اور پولیس کو ان کی اجازت ملنے سے اختیارات کے ناجائز استعمال میں اضافہ ہوا۔

جنوری میں کراچی میں گزری کے علاقے میں پولیس نے مبینہ پولیس مقابلے میں ایک طالب علم کو مار دیا جو محض چھ دن پہلے ملائشیا سے آیا تھا۔ جنوری میں ہی احتجاجی مظاہروں کے دوران، دو پولیس اہلکاروں کو گرفتار کیا گیا جنہوں نے ڈی ایچ اے میں انجینئرنگ کے ایک طالب علم کو ہلاک کر دیا۔ پولیس نے 22 سالہ شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اسے پولیس مقابلے کا نام دے دیا مگر بعد میں انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے موٹر سائیکل سوار کو رکنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ نہیں رکا اس لئے انہوں نے گولی چلا دی۔ اپریل میں راولپنڈی پولیس نے مقتول کی بیوی صبیحہ بی بی کی طرف سے طویل عدالتی لڑائی لڑنے کے بعد پانچ پولیس افسروں کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا جنہوں نے مبینہ طور پر ایک نوجوان عبدالخالق کو 2015ء میں جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا تھا۔ مئی میں ایک جوڈیشل مجسٹریٹ نے ایک پولیس مقابلے کی تحقیق کر کے بتایا کہ 18 اگست 2015ء کو فیصل آباد میں جس پولیس مقابلے میں تین لوگوں کو مارا گیا بشمول دو بھائیوں کے وہ پولیس مقابلہ جعلی طریقے سے رچایا گیا تھا۔

جولائی میں کراچی میں ایک نوجوان ابرارالحق کو کار کا پیچھا کرتے ہوئے ہلاک کر دیا گیا۔ اس قتل کی ذمہ داری انسداد دہشت گردی کے چار پولیس اہلکاروں پر ہے۔

جون میں پشاور ہائی کورٹ نے اپنی ماتحت عدلیہ کو چار پولیس افسروں کے خلاف ایف آئی آر کے اندراج کا حکم دیا۔ جنہوں نے جعلی پولیس مقابلے میں ایک ملزم کو مار دیا

تھا۔ جون میں 25 سالہ رحمت علی جس کا تعلق اوکاڑہ سے تھا کو مبینہ طور پر لاہور سے پولیس نے اٹھایا اور اگلے دن پولیس نے اسکے رشتہ داروں کا آ گاہ کیا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ کچھ سال پہلے ڈکیتی کی تین وارداتوں میں نامزد تھا جبکہ اس کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ وہ ان تین مقدمات میں سے ایک میں بری ہو گیا تھا۔ پھر وہ لاہور چلا گیا تھا جہاں وہ اپنے خاندان کو پالنے کے لیے مزدوری کرتا تھا۔ کراچی میں اکتوبر میں دوز یرحراست پولیس اہلکاروں کے خلاف ایک خاندان کی طرف سے ایف آئی آر درج کرائی گئی۔ ان پولیس اہلکاروں پر ایک کیڈٹ طالبعلم کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کے قریب مبینہ پولیس مقابلہ میں ہلاک کرنے کا الزام تھا۔ اکتوبر میں سکھر کی دادلوئی پولیس نے وقار بھٹو نامی ملزم کو پولیس مقابلہ میں ہلاک کر دیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص تو ایک انجینئر تھا جو سکھر سے ملتان موٹروے پر اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔

مجرم پولیس اہلکار

جون میں، 5 لڑکیوں کے ساتھ بارڈر ملٹری پولیس کے اہلکاروں نے فورٹ منرو پولیس سٹیشن پر اجتماعی جنسی زیادتی کی۔ فورٹ منرو کوہ سلیمان کے قبائلی علاقے میں ڈیرہ غازیخان سے 85 کلومیٹر دور ایک پہاڑی سیاحتی مقام ہے۔

لاہور میں پولیس نے ڈولفن فورس کے ایک اہلکار کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کیا جس نے ایک منشیات فروش ملزم پر گولی چلائی جو کہ اس کے بجائے ایک سات سالہ لڑکی کو جا لگی تھی۔ ایک منشیات فروش سے رشوت لینے کے الزام میں ڈولفن فورس کے ایک افسر کو معطل کیا گیا اور تین کو محکمانہ انکوائری کا سامنا کرنا پڑا۔

جنوری میں ڈی آئی جی لاڑکانہ نے اغواء کے ایک کیس میں مبینہ طور پر ملوث ہونے پر ایس ایچ او خان پور کی تنزلی کی اور اسے معطل کر دیا۔

جون میں ایف آئی اے نے پولیس کے پانچ اہلکاروں کو بشمول سپیشل برانچ کے دو اہلکاروں کے سمندر پار پاکستانیوں کے ساتھ فراڈ کرنے پر گرفتار کیا۔ ایف آئی اے کے مطابق اہلکاروں پر الزام تھا کہ انہوں نے سمندر پار پاکستانیوں سے کوائف کی تصدیق اور پاسپورٹ کے دوبارہ اجراء کے لیے بھاری رشوت لی تھی۔ اہلکاروں کے دو دلال بھی گرفتار کیے گئے جنہوں نے سمندر پار پاکستانیوں سے رقم وصول کی تھی۔

سفارشات

☆ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مرتکب پولیس اہلکاروں کی تفتیش ہونی چاہیےاور ان کے خلاف قانون کے مطابق کاروائی ہونی چاہیے۔حکومت کو چاہیے کہ وہ پولیس کے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لائے جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کوفروغ دیتا ہے۔قانون کی حکمرانی سے دیوانی اورفوجداری نظام انصاف مضبوط ہونا چاہیےاور بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ یقینی ہو۔

☆ پولیس کے لیے ایسے لازمی احکامات جاری کیے جائیں کہ کسی بھی جرم کے وقوع پذیر ہونے کی ایف آئی آر لازمی درج کی جائے۔اس بات کویقینی بنایا جائے کہ اگرکوئی متعلقہ پولیس افسر ایف آئی آر کے اندراج سے انکار کرے تو انکار کی تحریری وجوہات اپنے دستخط کے ساتھ شکایات کنندہ کومہیا کرے۔

☆ پولیس کے قواعد وضوابط میں تفتیش کے قابل قبول طریقہ کار واضح طور پر درج کیے جائیں اور شواہد کے حصول کے لیے غیر قانونی حراست،تشدد،اور ظالمانہ طریقوں پر پابندی ہونی چاہیے۔

☆ پولیس کو سیاسی اور دوسری غیر مناسب مداخلت اور دھونس سے محفوظ رکھا جائے۔پولیس کے نظام میں درج ذیل حوالوں سے اصلاح کی جائے۔میرٹ پر بھرتیاں کی جائیں،جدیدیت اورتربیت پر دھیان دیا جائے،کرپشن کا خاتمہ کیا جائے اوراداروں میں رابطے کےفقدان کوختم کیا جائے۔

قانون کا نفاذ

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں

کسی بھی شخص کو جسے گرفتار کیا جاتا ہے' گرفتاری کی وجوہات بتائے بغیر [جتنا بھی جلدی ممکن ہو سکے] حراست میں نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ کرنے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ ہر وہ شخص جسے گرفتار کرنے کے بعد حراست میں رکھا گیا ہے' گرفتاری کے 24 گھنٹے کے اندر' مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل - 10 (1)اور (2)]

ہر انسان کا احترام اور وقار اور بشرطیکہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے' خلوت اور تنہائی نا قابل دخل اندازی ہے۔ کوئی معلومات' شہادت' ثبوت حاصل کرنے کی خاطر' کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

[آرٹیکل-14-(1)اور(2)]

کسی شخص کو اذیت رسانی یا ظالمانہ' غیر انسانی یا رسوا کن سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل-5]

ہر شخص کو ہر کہیں قانون کے روبرو خود کو انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل - 6]

کسی شخص کو بے جا گرفتاری، حراست یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

[آرٹیکل - 8]

دہشت گردی کے خلاف ریاست کی جنگ کے دوران امن عامہ کے نام پر قانون کے غیر قانونی اور سخت نفاذ کا سلسلہ بڑھا۔ ریاست نے امن قائم کرنے کا وعدہ پورا کرنے کے لیے جو کارروائیاں کیں ان کا نتیجہ فرد کی حرمت کے حق کی پامالی اور بنیادی حقوق کے تعطل کی صورت میں برآمد ہوا۔ ریاست نے قانون نافذ کرنے کے لیے متشدد اور ماورائے عدالت طریقے اختیار کئے جس سے خوف کا ماحول پیدا ہوا۔ جیلوں کے ٹوٹنے اور شدت پسندوں کے حملوں کے خدشات نے جیلوں اور قیدیوں سے متعلق ایک بحث چھیڑی جس میں سخت سکیورٹی، پہلے سے زیادہ نگرانی اور انتقامی انصاف مرکزی موضوعات تھے۔ ظالمانہ اور غیر انسانی سزا کو اصول کا درجہ حاصل رہا اور حکومت پاکستان میں ایذا رسانی کے خلاف قانون متعارف کرانے میں ناکام رہی جس کا بہت عرصے سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ فوجی عدالتوں کی دو سالہ مدت ختم ہونے کے قریب تھی مگر عدالتی

اصلاح کے وعدے کی پاسداری خواب ہی رہی۔ جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش سے زیادہ تعداد، عدالتوں میں طویل سماعتیں، بدعنوانی اور قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کی اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کرنے والے سکیورٹی اہلکاروں کے خلاف قانونی کارروائی کے فقدان نے گزشتہ برسوں کی طرح 2016ء میں بھی نظام انصاف کو شدید متاثر کیا۔

کئی مقدمات میں سامنے آنے والے تشویشناک حقائق کے باوجود، پاکستان نے پھانسیاں دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ عدالت عظمیٰ نے کم از کم ایسے تین افراد کو رہا کیا جنہیں پھانسی دی جا چکی تھی۔ کئی دیگر نے پھانسی لگنے سے قبل عمر قید بھگت لی تھی جس کا مطلب ہے کہ انہیں دوہری سزا بھگتنا پڑی۔

ایچ آر سی پی نے 60 اضلاع میں انسانی حقوق کی صورتحال کے جائزے کے دوران 2016ء میں جبری گمشدگی کے 79 واقعات قلمبند کئے۔ زیرِ نظر سال کے دوران، ریاست ایک مرتبہ پھر کسی ایک بھی ایسے سکیورٹی اہلکار یا پولیس افسر کو سزا نہ دے سکی جن پر مشتبہ افراد کو غائب کرنے کا الزام تھا۔ بعض لوگوں کے اس دعوے کی توثیق نہیں ہو سکی کہ زیادہ تر ''جبری گمشدہ افراد، کو حراستی مراکز پر رکھا جاتا ہے کیونکہ ان مراکز پر سویلین حکام کی نگرانی نہیں ہے۔ خفیہ معلومات کی ایجنسیوں کی سویلین نگرانی اور سیاسی و قانونی جوابدہی کے فقدان سے انہیں غیر قانونی کارروائیاں کرنے میں مدد ملی ہے۔ حکومت ان کے کردار کی حدود طے کرنے کے لیے جامع قانونی ڈھانچہ تشکیل دینے میں ناکام رہی ہے۔

دہشت گردی کی آڑ میں، حکومت نے مشتبہ افراد کو ماورائے عدالت سزاؤں کا نشانہ بنانے کے لیے انہیں بنی نوع انسان سے خارج کرتے ہوئے ان کے بنیادی انسانی حقوق معطل کر دیئے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کا احترام نہ چھوڑے۔ بصورت دیگر، پائیدار امن کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

جیلیں

محکمہ جیل خانہ جات، پنجاب اور منشیات و جرم پر اقوام متحدہ کے دفتر کے ایک مشترکہ پراجیکٹ کے تحت 'جیل مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم' قائم کیا گیا۔ اگست 2016 تک، 34000 سے زائد قیدیوں کے کوائف کمپیوٹرائزڈ کر لئے گئے تھے۔ 200,000 قیدیوں کے کوائف کمپیوٹرائزڈ کرنا اس پراجیکٹ کا مقصد تھا تاکہ سکیورٹی کی صورتحال بہتر ہو سکے، رہائی پانے والے مجرموں پر نظر رکھی جا سکے اور جیلوں کے انتظامات کی کارکردگی اور شفافیت میں بہتری لائی جا سکے۔ کیمپ جیل، لاہور سے شروع ہونے والے اس پراجیکٹ کا دائرہ پنجاب کی 20 دیگر بڑی جیلوں تک پھیلایا گیا۔

دسمبر 2016ء میں وفاقی محتسب کے دفتر نے عدالت عظمیٰ کو ایک رپورٹ جمع کروائی جو جیلوں کی حالت پر ایک ازخود نوٹس کی سماعت کر رہی تھی۔ رپورٹ میں تجویز پیش کی گئی کہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن ججوں کی سربراہی میں ضلعی جیلوں، پولیس اور مقامی انتظامیہ کے سربراہوں پر مشتمل اصلاحی کمیٹیاں قائم کی جائیں جنہیں جیلوں کی نگرانی کرنے اور ان تک فوری رسائی کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ اور ہر جیل میں اس کمیٹی کا دفتر قائم ہو۔ دوسری سفارش جیل عملے کی سروس اسٹرکچر میں بہتری لانے سے متعلق تھی۔ اپنے سروے کے دوران، محتسب کو معلوم ہوا کہ عملے کے اراکین گزشتہ ایک دہائی سے زائد عرصہ سے اسی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ترقی اور تنخواہوں میں اضافے کے فقدان کا مطلب ہے کہ عملہ اپنی کارکردگی بہتر کرنے کے جذبے سے محروم ہے۔ کم معاوضہ جیلوں میں بدعنوانی اور رشوت کے پیچیدہ نظام کا سبب بھی بنتا ہے۔ جیل حکام ان غریب قیدیوں کو ہراساں کرتے جن کو سیاسی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ ان کے اہل خانہ کو کئی بار قرض لینے پر مجبور ہونا پڑا تاکہ وہ اپنے عزیز قیدیوں کو ایذا رسانی سے بچانے کے لیے جیل کے اہلکاروں کو رشوت دے سکیں۔ قیدی بہتر خوراک، جیل کلینک میں قدرے طویل قیام اور موبائل فون جیسی مراعات کے لیے جیل کے عملے کو رشوت دیتے ہیں۔ جیل کے عملے کے لیے پورے ملک میں صرف ایک تربیتی کالج ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جیل کا عملہ جیل کے قواعد وضوابط سے لاعلمی کی بدولت غیر پیشہ وارانہ، یہاں تک کہ مجرمانہ طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ جیل کے سارے عملے کا ہر تین سال بعد جیل سے کہیں اور تبادلہ کیا جائے تاکہ جرائم پیشہ عناصر کے ساتھ ان کی طویل وابستگی کے باعث ہونے والی بے ضابطگیوں پر قابو پایا جا سکے۔

جیل میں گنجائش سے زیادہ قیدی

جیلوں میں گنجائش سے زائد قیدیوں کی موجودگی اور اس مسئلے سے نبٹنے میں حکام کی ناکامی انسانی حقوق کے گروہوں کے لیے شدید تشویش کا باعث تھی۔ چونکہ زیر سماعت قیدیوں کی تعداد سزایاب قیدیوں سے کہیں زیادہ ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جیل میں قیدیوں کی بہتات کا بنیادی سبب انصاف کی فراہمی میں غیر ضروری تاخیر ہے۔ تمام جیلوں میں تقریباً دو تہائی قیدی ایسے تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔ ان کے مقدمات کے فیصلوں میں تاخیر کی وجوہات بالعموم ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی، چالان پیش ہونے میں تاخیر یا پولیس کی طرف سے مقدمات کی

زیرسماعت قیدیوں کی تعداد سزایاب قیدیوں سے بہت زیادہ تھی

ازسرنو تحقیقات ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ قیدیوں کو اپنے وکیل تک رسائی نہیں تھی اور وہ عدالت میں اپنی پیشی کی تاریخ سے بھی لاعلم تھے۔ مشتبہ افراد کو جیلوں میں پھینکنے کے رجحان، ریمانڈ کی کارروائی کا کھلم کھلا ناجائز استعمال، ضمانت کے حصول کو بے جا طور پر مشکل بنانے کا عمل اور مقدمات کے تصفیے میں قابل مذمت تاخیر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جیلیں زیرسماعت قیدیوں سے بھر جاتی ہیں۔

قیدیوں کو عدالت لے جاتے ہوئے بالعموم ایک یا دو پولیس اہلکار ایک ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے دس زیرسماعت قیدیوں کی نگرانی پر مامور ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قیدیوں کو سماعت کے لیے عدالت نہ لایا جاسکا کیونکہ سکیورٹی کے موثر انتظامات نہیں ہوسکے تھے۔ موت کی کوٹھریاں بھی مسائل کی زد میں رہیں۔ سزائے موت کے قیدیوں کو موت کی کوٹھڑی میں منتقل کیا گیا حالانکہ عدالت عالیہ یا عدالت عظمیٰ نے ابھی ان کی سزائے موت کی توثیق نہیں کی تھی۔ اعلیٰ عدالتوں سے سزائے موت کی توثیق ایک ایسا عمل ہے جس پر عموماً دس برس لگ جاتے ہیں۔

جیلوں میں قیدیوں کو دستیاب رہائش کے حوالے سے کے ملک کی موسمی حالات کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا۔ بارکوں اور سیلوں میں موسم سرما میں شدید سردی اور موسم گرما میں شدید گرمی تھی۔

جیلوں میں قیدیوں کی بہتات کا زیادہ مسئلہ پنجاب میں تھا جبکہ جیل خانہ جات، پنجاب نے جیلوں میں قیدیوں کی بہتات سے نبٹنے کے لیے صوبے میں سات نئی ڈسرکٹ جیلیں اور ساہیوال میں ایک ہائی سکیورٹی جیل تعمیر کی۔

ملک میں کھلی جیلوں کے تصور کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ پاکستان میں واحد کھلی جیل

’بدین کھلی جیل‘ بلوچستان میں واقع ہے۔ 2008ء ایکڑز پر پھیلی جیل میں قیدیوں اوران کے خاندانوں کے لیے کمرے ہیں، نیز زرعی زمین بھی ہے تاکہ قیدی وہاں کاشتکاری کرسکیں اور جیل کے عملے کی رہائش کا بندوبست بھی ہے۔ کھلی جیل کے سپرنٹنڈ کے بقول، جیل کے اندر قیدیوں نے کبھی جرم کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ تاہم، 2010ء میں دوبارہ کھلنے کے وقت سے لے کر اب اس جیل کو موثر طریقے سے استعمال نہیں کیا گیا اور اس کی دیکھ بھال نہیں کی جارہی۔

پارلیمان کے ایوان بالا، سینٹ کے جن اراکین نے کراچی سنٹرل جیل کا دورہ کیا تھا انہوں نے ستمبر میں تجویز پیش کی کہ جیل میں گنجائش سے تین گنا زائد قیدی ہیں لہذا کراچی میں ایک اور جیل تعمیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

آوارہ گردی کے حوالے سے سخت قوانین نے جیلوں میں قیدیوں کی بہتات کے مسئلے کو اور زیادہ سنگین بنایا ہے۔ قانون بیروزگار اور بے گھر افراد کو نشانہ بناتا ہے۔ انہیں معاشرے کے ہر فرد کو بنیادی سہولیات فراہم کرنے میں ریاستی ناکامی کی سزا بھگتی پڑتی ہے۔ مجموعہ ضابطہ تعزیرات پاکستان (سی آر پی سی) کی دفعہ 109اور 110 (امن، اچھے اخلاق کا مظاہرہ اور حفاظتی انتظامات سے متعلق) کے بے جا استعمال کو ترک کرنے سے جیل کی آبادی میں کمی آسکتی ہے۔

معمولی جرائم میں ملوث قیدیوں کی رہائی کے لیے جیلوں میں باقاعدہ عدالتی سماعتیں ہونی چاہئیں۔

	کل مرد قیدی	کل خواتین قیدی	کل قیدی	گنجائش
پنجاب	48,683	920	49,603	23,617
سندھ	20,059	249	20,308	12,245
خیبر پختونخوا (نومبر 2016 تک)	10,891	309	11,200	7,547
بلوچستان (نومبر 2016 تک)	2,798	18	2,816	2,585
گلگت بلتستان (نومبر 2016 تک)	387	1	388	
کل	**82,818**	**1,497**	**84,315**	

آزمائشی اور عارضی مدت کی رہائی کی مدت بڑھانے سے بھی جیلوں پر موجودہ دباؤ کم ہو گا۔ ستمبر 2016 میں، صرف پنجاب میں 21,000 قیدی عارضی رہائی کی سہولت سے مستفید ہوئے تھے۔ فٹ پاتھوں پر مصوری کرنے جیسی متبادل سزاؤں، خاص طور پر بچوں کے لیے، سے بھی جیلوں کا بوجھ ہلکا ہوگا اور اِس سے مجرموں کو معاشرے کی خدمت کی اہمیت کا احساس بھی ہو گا۔ جیل کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے مگر جیل کے عملے کی تعداد میں اِس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا، اس لیے متبادل سزا کے اطلاق سے قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کنٹرول کرنے کے لیے جیلوں میں زائد لوگ بھرتی کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

جیل ایکٹ 1894 کی دفعہ 27 اور 30 اور جیل ضوابط کا ضابطہ نمبر 224 سے 249 دیوانی یا فوجداری جرائم میں ملوث ہونے کی بنیاد پر قیدیوں کی درجہ بندی سے متعلق ہیں۔ یہ دفعات اور ضوابط خواتین اور کمسن قیدیوں کو دیگر قیدیوں سے الگ رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مگر جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش سے زیادہ تعداد کے باعث قیدیوں کی علیحدگی والے ضوابط کی پاسداری نہیں کی جا رہی اور نتیجتاً کمسن خواتین قیدیوں کو بالغ خواتین قیدیوں کے ساتھ رکھا جا رہا ہے۔

اصولی طور پر قیدیوں کی علیحدگی درج ذیل بنیادوں پر ہونی چاہیے: سزا یاب، سزائے موت کے قیدی، زیرِ سماعت قیدی، معمولی اور بڑے جرائم میں ملوث ایسے قیدی جو پہلی بار جیل میں آئے ہوں، اُنہیں خطرناک مجرموں سے الگ رکھا جانا چاہیے۔

وبائی بیماریوں میں مبتلا قیدیوں کو دیگر قیدیوں سے الگ نہیں رکھا جا رہا تھا۔ ذہنی متاثرہ قیدیوں کو بحالی نو کے مراکز میں رکھا جائے۔ فہم و فراست سے معذور قیدی، جھگڑالو اور غیر جھگڑا دونوں طرح کے، بغیر کسی مناسب توجہ یا علاج معالجہ کی سہولیات کے، دیگر قیدیوں سے الگ ایک ہی بارک میں رہ رہے تھے۔ ذہنی معذور خواتین قیدیوں کو دیگر خواتین قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔

خواتین قیدی اور بچے

اکتوبر میں وزارت داخلہ کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق، پنجاب کی جیلوں میں بند 939 خواتین قیدیوں میں سے 110 کے ساتھ اُن کے بچے بھی رہ رہے تھے۔ ان 110 خواتین میں سے 60 زیرِ سماعت قیدی تھیں، 45 کو قید کی سزا جبکہ پانچ کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔

اپنے بچوں کے ہمراہ جیلوں میں بند خواتین کے بچے جب اسکول جانے والی عمر کو پہنچ جائیں تو جیل سے باہر اُن کی دیکھ بھال اور تحفظ کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسی

ملک بھر میں 3500 سے زائد خواتین اور بچے جیلوں میں بند تھے جن کی حالت بہت خراب تھی

خواتین قیدیوں کے متعلق پیش کی گئی رپورٹس میں سفارش کی گئی ہے کہ اسکول جانے والے ایسے تمام بچوں کو نگہداشت کے مراکز میں منتقل کیا جائے تاکہ اُنہیں صحت مند ماحول مل سکے جو اُنہیں جیل میں دستیاب نہیں ہوتا۔ ستمبر میں، ایک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے ایسے چار بچوں کو لاہور میں ایس او ایس سنٹر بھیجنے کے احکامات جاری کیے۔ چاروں بچوں کو فوری طور پر ایس او ایس سنٹر بھیجا گیا۔ تاہم، ایسے کسی بھی اقدام سے قبل، والدین کی رضامندی لینی چاہیے۔

زیادہ تر جیلوں میں خیراتی تنظیموں کی امداد سے تعمیر ہونے والے مذہبی اسکول بند ہو گئے تھے اور جیل حکام نے اُن کی بندش کی وجہ یہ قرار دی کہ اِن اسکولوں کی عمارتیں جیلیں توڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

خواتین قیدیوں کے جنسی تشدد کی شرح میں کمی ضرور آئی مگر یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواتین کو جیل حکام اور مرد قیدیوں، دونوں اطراف سے خطرہ تھا۔ اگرچہ بعض جیلوں میں خواتین کو مردوں سے علیحدہ رکھا گیا تھا مگر دیگر میں مرد اہلکاروں کو خواتین قیدیوں کی بارکوں اور سیلوں تک رسائی تھی۔

جیلوں میں صحت کی سہولیات کی قلت کے باعث خواتین، خاص طور پر حاملہ خواتین کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ ہر جیل میں لیڈی ڈاکٹر یا نرس کی آسامی موجود ہے مگر زیادہ تر جیلوں میں یہ آسامیاں خالی پڑی رہیں۔

ان بچوں کو اُن کے حقوق سے محروم رکھا گیا جن پر فوجداری جرم کا الزام عائد تھا۔ عالمی قوانین کا تقاضا ہے کہ زیر حراست تمام افراد کے ساتھ اچھا سلوک برتا جائے، تاہم بچے خصوصی

دیکھ بھال اور مدد کے مستحق ہیں۔ بچوں کے حقوق کی کمیٹی (سی آر سی) کے مطابق، بچوں سے متعلق تمام اقدامات میں، چاہے وہ سرکاری طرف سے کیے جائیں یا فلاح و بہبود کے نجی اداروں کی طرف سے یا عدالتوں کی طرف سے ہوں...... بچے کے بہترین مفاد کو پہلی ترجیح تصور کیا جائے گا۔ پاکستان میں بچوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا فقدان ہے اور کئی بچوں کو طویل عرصے کے لیے قید کی سزا دی گئی ہے۔

حکومت یہ واضح کرنے میں ناکام رہی ہے کہ آیا بچوں کے مقدمات کی سماعت فوجی عدالتوں میں ہوسکتی ہے یا نہیں۔ آرمی ایکٹ 1952 کے مطابق، دیگر قوانین کے ساتھ تصادم کی صورت میں، آرمی ایکٹ کی دفعات لاگو ہوں گی۔ چنانچہ، آرمی ایکٹ کی یہ دفعہ بچوں کو اپنے دائرہ اختیار سے باہر تصور نہیں کرتی۔ فوجی عدالتوں میں شفافیت کے فقدان کے باعث، اس امر کی تصدیق نہیں ہوسکتی کہ اُن عدالتوں میں جس فرد کے خلاف مقدمے کی سماعت ہوئی وہ بالغ تھا یا کمسن۔

تعزیری قانون (دوسری ترمیم) ایکٹ 2016 نے مجرمانہ ذمہ داری کی عمر سات سے بڑھا کر 10 برس اور بالائی عمر کی حد 12 برس سے بڑھا کر 14 برس کی۔ مجرمانہ ذمہ داریوں کی عمر بڑھا کر، ریاست بچوں کو جیلوں میں سخت حالات کا نشانہ بننے سے بچا سکتی ہے۔

بورسٹل اداروں کی قلت اُن بچوں کی آزمائشی مدت کے لیے رہائی کی راہ میں رکاوٹ ہے جنہیں اُن کے اہل خانہ کے پاس نہیں بھیجا جا سکتا۔ غیر متشدد زیرِ سماعت قیدی بچے، ماسوائے اُن کے جو سنگین جرائم میں ملوث ہیں، اپنے اہل خانہ کے حوالے کیے جائیں اور اُن کی نگرانی کی ذمہ داری متعلقہ افسران پر عائد ہونی چاہیے۔

جیلوں میں ایذا رسانی

ایذا رسانی اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی یا تضحیک آمیز سلوک کے خلاف میثاق، جس کی پاکستان نے 2010 میں توثیق کی تھی، تمام فریق ریاستوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ایذا رسانی کے خلاف قانون سازی کریں۔ میثاق کا تقاضا ہے کہ فریق ریاستیں مذکورہ قانون سازی میں ایذا رسانی میں ملوث لوگوں کے لیے سزاؤں کا تعین کریں، متاثرین کی تلافی کے ذرائع تجویز کریں اور تحقیقات کے طرائق کار وضع کریں۔ تاہم، حکومت ایذا رسانی کو باقاعدہ جرم قرار دینے میں ناکام رہی اور نتیجتاً ایذا رسانی کو پاکستان کے نظامِ انصاف میں شہادت حاصل کرنے کا سب سے خاص ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

مارچ میں ایک ہسپتال میں ایک زیرِ سماعت قیدی کی ہلاکت کا واقعہ پیش آیا جسے مبینہ طور پر سنٹرل جیل کراچی کے حکام نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اُس کے ورثاء کا کہنا تھا کہ وہ 27 جنوری کو اپنے گھر سے لاپتہ ہوا تھا۔ اُس کے وکیل کا کہنا تھا کہ اُسے 27 جنوری کو پولیس اہلکاروں نے سادہ کپڑوں میں ملبوس بعض افراد کے ہمراہ گرفتار کیا تھا اور انہیں یہ کہہ کر ایف آئی آر درج کروانے سے منع کیا تھا کہ اُسے جلد ہی رہا کر دیا جائے گا۔ اُس کی گرفتاری کی تاریخ 10 فروری ظاہر کی گئی اور اُس پر کسی فرد کو مختصر عرصے کے لیے اغوا کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ اپنی موت سے قبل متاثرہ فرد نے اپنے بھائی کو بتایا کہ پولیس نے اسے جھوٹے مقدمے میں ملوث کیا ہے اور اُسے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اُسے 06 مارچ کو ہسپتال منتقل کیا گیا جہاں جیل حکام نے ڈاکٹروں کو بتایا کہ وہ جیل میں دورہ پڑنے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُس کی طبی قانونی رپورٹ کے مطابق ایک سخت کند آلے کی ضرب اُس کے سر پر لگنے سے اُس کی موت واقع ہوئی ہے۔ اپریل میں، عدالتی حکم پر، پولیس نے کراچی سنٹرل جیل کے جیلر، ایک پولیس افسر اور دیگر تین اہلکاروں پر اُس کے قتل کا مقدمہ درج کیا۔

نومبر میں، منشیات کے مقدمے میں ملوث ایک قیدی کیمپ جیل لاہور میں بے ہوش ہو گیا اور بعدازاں ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گیا۔ تحقیقات جاری تھیں مگر سپرنٹنڈنٹ کو غفلت برتنے پر معطل کر دیا گیا تھا۔

غیر ملکی قیدی

وزارت برائے اوورسیز و ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2005 سے 2015 کے دوران تقریباً 14,628 تارکِ وطن پاکستانی مزدور دیگر ممالک کی جیلوں میں بند تھے۔ سعودی عرب کی وزارت داخلہ نے دسمبر میں بتایا کہ کم از کم 69 پاکستانی دہشت گردی میں ملوث ہونے کے شبے میں سعودی عرب کی جیلوں میں بند ہیں۔ جولائی میں، جدہ میں یو ایس قونصلیٹ کے نزدیک ایک پاکستانی نے خودکش بم دھماکہ کیا تھا اور اکتوبر 2016 میں دو پاکستانی دہشت گردوں نے دہشت گردی کی ناکام کوشش کی جس کے بعد یہ گرفتاریاں عمل میں آئیں

اگست میں، پشاور سنٹرل جیل میں، ایک ہندوستانی قیدی حامد انصاری کو اُس کے ساتھ بند دیگر قیدیوں نے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ یہ ان پر دو ماہ میں ہونے والا دوسرا حملہ تھا۔ وہ

تین برس قید کی سزا بھگت رہا تھا اور اس کے تحفظ کی خاطر اُسے موت کی کوٹھری میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ اطلاعات کے مطابق، انصاری کو جیل کا وارڈن ہر روز تشدد کا نشانہ بناتا تھا جسے عدالت نے سماعت سے ایک ماہ قبل معطل کر دیا تھا۔ حامد انصاری کو نومبر 2012 میں جعلی شناختی دستاویزات رکھنے کے جرم میں کوہاٹ سے گرفتار کیا گیا تھا اور دسمبر 2015 میں فوجی عدالت نے سزا سنائی تھی اور اُنہیں پشاور جیل میں اپنی قید کی سزا پوری کرنی تھی۔ اُنہوں نے فوجی عدالت کی سزا سے قبل اپنی حراست کے دورانیے کو بھی سزا کی مدت میں شامل کرنے کی پٹیشن دائر کی تھی مگر سال کے اختتام تک وہ زیرِ التوا تھی۔

وزارتِ خارجہ کے مطابق 2016 میں، 55 پاکستانی بگرام ائیر بیس، افغانستان کے حراستی مرکز میں زیرِ حراست تھے۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے اُن کی رہائی کے لیے افغان حکومت سے رجوع کیا تھا مگر پاکستان اور افغانستان کے مابین قیدیوں کے تبادلے یا حوالگی کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔

سال کے اختتام تک گوانتاناموبے جیل میں چھ پاکستانی مرد قید تھے۔ اُن میں خالد شیخ محمد بھی شامل تھے جن پر 9/11 حملوں کی منصوبہ بندی کا الزام ہے۔ اُن چھ افراد میں ماجد خان بھی شامل ہے جسے سی آئی اے کی فاش ہونے والی اطلاعات کے مطابق ایذا رسانی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

سرحدی حدود کی خلاف ورزی میں گرفتار پاکستانی اور ہندوستانی ماہی گیروں کی حالت مایوس کن ہی رہی۔ سمندر میں ملکی حدود واضح نہیں ہیں کیونکہ کسی بھی ملک کے کوسٹ گارڈ اس کی درست نشاندہی نہیں کر سکتے۔ دسمبر 2016 میں 156 پاکستانی ماہی گیر ہندوستانی جیلوں میں گل سڑ رہے تھے جبکہ 439 ہندوستانی ماہی گیر پاکستانی جیلوں سے رہائی کے منتظر تھے۔

سمندری قانون سے متعلقہ اقوام متحدہ کا میثاق سمندر میں ماہی گیروں کی گرفتاری کے خلاف ہے اور کہتا ہے کہ اگر ماہی گیر نادانستہ طور پر علاقائی پانیوں میں داخل ہو جائیں تو اُنہیں گرفتار کرنے کی بجائے دوبارہ ایسا نہ کرنے کی تنبیہہ کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ گرفتاری کی صورت میں بھی، سزا چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ بدقسمتی سے، ہندوستان اور پاکستان، دونوں ممالک میں، مہینوں تک مقدمات کی سماعت شروع نہیں ہوتی جبکہ ماہی گیر برسوں تک جیلوں میں پڑے رہتے ہیں۔ کئی سزا بھگتنے کے بعد بھی جیلوں میں رہتے ہیں کیونکہ اُس دوران اُن کے ملک کی طرف سے اُن کی شہریت کی توثیق کا عمل مکمل ہو رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ جیل ایکٹ

اور جیل ضوابط میں قیدیوں کو جیل حکام کے جسمانی، جنسی اور نفسیاتی تشدد سے تحفظ فراہم کرنے، اُنہیں مناسب خوراک اور اچھی رہائش کی سہولیات فراہم کرنے اور اصلاحاتی اقدامات کرنے سے متعلق دفعات موجود ہیں مگر اصل مسئلہ اُن کے نفاذ کے فقدان کا ہے۔

انتظامیہ، عدلیہ، نیم سرکاری تنظیموں اور وفاقی وصوبائی محتسب کی طرف سے جیل حکام کے طرزِ عمل اور قیدیوں کی نگہداشت پر نظر رکھنے کا ٹھوس نظام وضع کیا جائے۔

سزائے موت

اگرچہ 2016 میں پاکستان میں پھانسیوں کی تعداد کم ہوئی ہے مگر اس کے باوجود 87 افراد کو تختہ دار پر لٹکایا گیا جس کی وجہ سے ابھی بھی ملک کا شمار اُن ریاستوں میں ہوتا ہے جہاں سزائے موت پر بہت زیادہ عملدر آمد کیا جارہا ہے۔ سال کے پہلے چھ ماہ میں پھانسیوں کی شرح زیادہ تھی۔

اکتوبر میں، سزائے موت کے ایک ذہنی معذور قیدی، امداد علی کی اپیل کی سماعت کے دوران، عدالتِ عظمیٰ نے کہا کہ شیزوفرینیا ہر وقت طاری رہنے والی ذہنی کیفیت نہیں ہے، اِس لیے اسے قانونی طور پر ذہنی بیماری کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ عدالت نے کہا کہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوسکی کہ قتل کا ارتکاب کرتے وقت امداد علی ذہنی بگاڑ کا شکار تھا، چنانچہ اُسے پھانسی سے استثنیٰ نہیں دیا جا سکتا۔ امداد علی نے 2001 میں ایک مولوی کو قتل کیا تھا اور 2002 میں اُسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔

2012 میں ڈاکٹروں نے امداد علی کو شیزوفرینیا کے مرض میں مبتلا ہونے کا سٹیفکیٹ دیا جبکہ اُسے جیل میں پڑے 10 برس بیت چکے تھے۔ اکتوبر کے آخر میں اُس کی موت کا پروانہ جاری ہوا اور 2 نومبر اُس کی پھانسی کی تاریخ طے ہوئی تاہم پھانسی عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی تھی۔

سزائے موت کے ایک اور قیدی خضر حیات بھی شیزوفرینیا کا مریض ہے۔ وہ متعدد بار پھانسی پانے سے بچا ہے اور سال کے اختتام تک اُس کے مقدر کا حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ججوں کے پاس ملزم کی دماغی حالت جانچنے کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اُس سے اُس کا نام پوچھتے تھے اور اگر ملزم نام بتانے میں کامیاب رہے تو وہ یہ فیصلہ کرتے کہ اس کی دماغی حالت درست ہے۔ اقوام متحدہ کی معاشی وسماجی کونسل کا مطالبہ ہے کہ ذہنی معذور افراد یا محدود ذہنی استعداد والے لوگوں کے لیے سزائے موت ختم کی جائے، چاہے اُن کا مقدمہ سزا سنائے جانے کے مرحلے پر ہو یا پھانسی کے مرحلے پر۔

فالج کے مرض میں مبتلا عبدالباسط بھی سزائے موت کا قیدی ہے جسے 2010 میں

جیل میں گردن توڑ بخار ہوا تھا مگر اُس کا علاج نہیں کروایا گیا تھا جس کی وجہ سے اُس کے بدن کا نچلا حصہ ناکارہ ہو گیا۔ اُسے 2009 میں قتل کے جرم میں سزائے موت ہوئی تھی۔ 21 ستمبر 2015 کو عدالتِ عظمیٰ نے پھانسی سے متعلقہ جیل ضوابط کی روشنی میں باسط کی پھانسی کا حکم صادر کیا۔ اگرچہ جیل ضوابط اس چیز کی وضاحت نہیں کرتے کہ ایک مفلوج آدمی کو کس طرح پھانسی دی جائے، تاہم اِس کے باوجود 22 ستمبر باسط کی پھانسی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ تاہم بارش کی وجہ سے اُس کی پھانسی روک دی گئی اور بعدازاں عدالت کے حکم پر اُسے ایک بار پھر ملتوی کر دیا گیا۔ سال کے اختتام تک اُس کی موت کا پروانہ چار بار جاری ہو چکا تھا۔

ہر بار حکومت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اُس کی زندگی بچائی۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے کئی بار کہا کہ باسط کی پھانسی نہ صرف پاکستانی قانون کی خلاف ورزی ہو گی بلکہ انصاف کی تمام اقدار کے خلاف جرم تصور ہو گی۔

دسمبر میں، عدالتِ عظمیٰ نے سزائے موت کے قیدی محمد عامر کو رہا کیا جو ایک عشرے سے جیل میں پڑا ہوا تھا۔ اکتوبر میں عدالتِ عظمیٰ نے مظہر حسین کی رہائی کا حکم دیا جو دو سال قبل جیل میں دل کی شریان پھٹنے سے ہلاک ہو چکا تھا۔ حسین 13 برس تک سزائے موت کے قیدی کی حیثیت سے جیل میں پڑا رہا۔ نومبر میں عدالتِ عظمیٰ نے مظہر فاروق کو بھی بری کیا جو 21 برس جیل میں گزار چکا تھا۔

دو بھائیوں، غلام سرور اور غلام قادر کی پھانسی ہمارے نظامِ انصاف میں برتی جانے والی مجرمانہ غفلت کی خوب عکاسی کرتی ہے۔ 2005 میں دوہرے قتل میں سزا پانے والے دونوں بھائیوں نے 10 برس سزائے موت کے قیدیوں کی حیثیت سے جیل میں گزارے۔ 12 اکتوبر 2015 کو دونوں بھائیوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا جبکہ اُن کی اپیلیں ابھی زیرِ سماعت تھیں۔ اُن کے خاندان اور وکیل کا کرب اُس وقت اور زیادہ ہو گیا جب عدالتِ عظمیٰ نے ایک برس بعد اکتوبر 2016 میں اُنہیں بری کر دیا کیونکہ استغاثہ بغیر کسی شک وشبہ کے اپنا مقدمہ ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ رہائی کی وجہ استغاثہ کے گواہوں کے متضاد بیانات تھے مگر نچلی عدالتوں نے اِس چیز کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اُن کے وکیل نے عدالتِ عظمیٰ میں ایک درخواست دائر کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اپنے فریضے کی انجام دہی سے انحراف کرنے والوں پر مجرمانہ ذمہ داری عائد کی جائے۔

زیادہ تر مقدمات میں سماعت کے دوران ملزموں کو غیر جانبدار وکیل تک رسائی کا

مسئلہ درپیش رہا ہے۔ملزم کی قسمت کا فیصلہ مقدمے کے ابتدائی مراحل میں ہی ہو جاتا ہے جب اُنہیں ریاست کے مقرر کردہ وکیل مہیا کیے جاتے ہیں جو کہ زیادہ تر غیر تربیت یافتہ اور نالائق ہوتے ہیں۔اگر اس مرحلے پر ملزموں کی عمر اور اُن کی ذہنی حالت جیسے اہم پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا جائے تو پھر اعلیٰ عدالتوں میں اِن پہلوؤں کو اٹھانے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

فوجی عدالتوں سے سزا پانے والے کم از کم 17 افراد نے سویلین عدالتوں میں اپنی سزاؤں کو چیلنج کیا تھا مگر تمام کی پٹیشنیں خارج کر دی گئیں۔

ذرائع ابلاغ کی مانیٹرنگ کے ذریعے ایچ آر سی پی کے جمع کردہ کوائف کے مطابق، 2016 میں 426 افراد کو سزائے موت سنائی گئی جبکہ 87 کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔

سزائے موت سنائی گئی	2016	2015
پنجاب	403	378
سندھ	21	22
بلوچستان	0	9
خیبرپختونخوا	2	6
کل	**426**	**496**

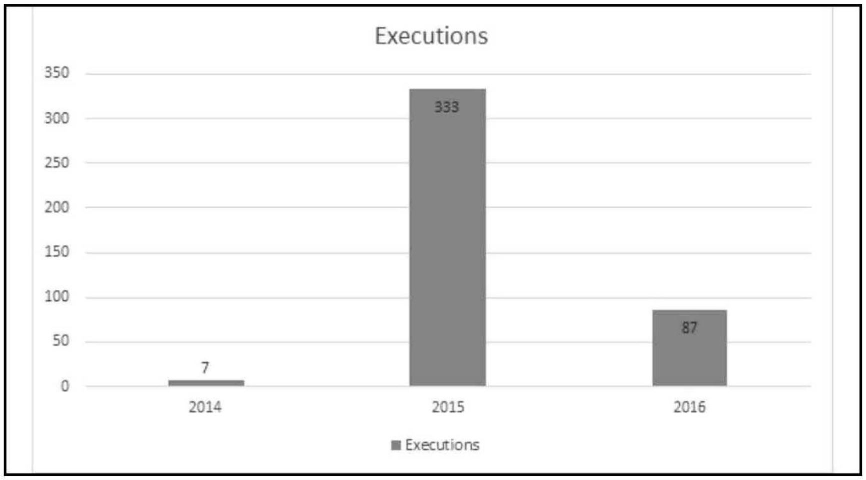

2016 میں پھانسیاں	قتل کے الزام میں	کل
پنجاب	65	75
سندھ	1	2
بلوچستان	1	1
خیبر پختونخوا	4	7
آزاد کشمیر	2	2
کل	**73**	**87**

فوجی عدالتیں

جنوری 2015 میں منظور ہونے والی اکیسویں آئینی ترمیم کے نتیجے میں، فوجی عدالتوں کو تشدد اور دہشت گردی کے واقعات میں ملوث عام شہریوں کے مقدمات کی سماعت کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ترمیم میں یہ شق بھی شامل تھی کہ جنوری 2017 میں فوجی عدالتوں کی مدت ختم ہوجائے گی۔ بعدازاں، چاروں صوبوں میں 11 فوجی عدالتیں قائم ہوئیں جبکہ حکومت نے فوجداری عدالتی نظام میں اصلاحات لانے کا عہد بھی کیا۔ ترمیم کو سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کے گروہوں کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ ترمیم عالمی میثاق برائے شہری وسیاسی حقوق (آئی سی سی پی آر) کی دفعہ 14 کے تحت پاکستان پر عائد قانونی وعالمی ذمہ داریوں سے متصادم تھی۔ آئی سی سی پی آر کی دفعہ 14 شفاف سماعت کے حق سے متعلق ہے۔ مسلح افواج کے میڈیا ونگ، انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے ذرائع ابلاغ کو دیے گئے بیانات کے مطابق، فوجی عدالتوں میں منتقل کیے گئے۔ 275 مقدمات میں سے 274 میں سزا سنائی گئی تھی۔ ایک مقدمے کے فیصلے کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ فوی عدالتوں نے 161 قیدیوں کو سزائے موت جبکہ 113 کو قید کی سزا سنائی۔ سال کے اختتام تک، فوجی عدالتوں سے سزا پانے والے 12 افراد کو پھانسی دی جاچکی تھی۔ قید کی سزا پانے والے 113 مجرموں میں سے صرف سات کی تفصیلات سے عوام کو آگاہ کیا گیا۔ 106 پر لگائے گئے الزامات اور قید کی مدت کے حوالے سے عوام کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ آئی ایس پی آر کے مطابق، زیادہ تر ملزموں کو سنائی جانے والی سزا کی وجہ اُن کا ''اعترافِ جرم'' تھا۔ اعترافِ جرم کی اتنی زیادہ شرح ملزموں کے اعترافی بیانات پر انحصار، حکام کے ہاتھوں ملزموں کی بدسلوکی اور ایذا رسانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جبری گمشدگیاں

اقوامِ متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق کو جمع کروائی گئی اپنی تازہ ترین رپورٹ میں اقوام متحدہ کے جبری وغیر اختیاری گمشدگیوں کے ورکنگ گروپ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ حکومتِ پاکستان نے اُن سفارشات پر عمل درآمد نہیں کیا جو ورکنگ گروپ نے 2012 میں اپنے دورہ پاکستان کے بعد کی تھیں۔ ان سفارشات میں حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ جبری گمشدگیوں کو اپنے فوجداری قانون میں باقاعدہ جرم قرار دے، جبری گمشدگیوں کے انکوائری کمیشن کو بااختیار کرے، جبری گمشدگیوں میں ملوث مشتبہ افراد کے خلاف سویلین عدالتوں میں مقدمات قائم کرے اور تمام افراد کو جبری گمشدگیوں سے تحفظ فراہم کرنے کے میثاق کی توثیق کرے۔ تاہم، ورکنگ گروپ نے حکومت کے اس اقدام کو سراہا کہ اُس نے گروپ کو جبری گمشدگی کے واقعات کی بہت بڑی مقدار سے آگاہ کیا تھا۔ رپورٹنگ کے دورانیے میں، گروپ نے حکومت کو 321 نئے واقعات منتقل کیے، اِن کی اکثریت کا تعلق سندھ سے تھا اور زیادہ تر متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) سے وابستہ تھے۔

حکومت تحفظ پاکستان ایکٹ (جو کہ اس وقت نافذ العمل نہیں ہے) پر ورکنگ گروپ اور دیگر اداروں کے تحفظات کا جواب دینے میں بھی ناکام رہی۔ ورکنگ گروپ نے بارہا کہا کہ جبری گمشدگی کا جرم دنیا بھر میں بڑھ رہا ہے اور اِس کی بنیادی وجہ یہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ جبری گمشدگی کے ذریعے قومی سلامتی کا تحفظ یقینی بنایا جا سکتا۔

دنیا بھر میں مبینہ جبری گمشدگی کے سب سے زیادہ واقعات جنوبی ایشیا میں پیش آئے۔ سری لنکا، نیپال، پاکستان اور ہندوستان سے لاکھوں کیسز رپورٹ ہوئے ہیں۔ 2009 سے بنگلہ دیش سے بھی جبری گمشدگی کے بہت زیادہ کیسز رپورٹ ہو رہے ہیں۔

ہندوستان میں 1989 سے 2009 کے دوران، صرف کشمیر سے جبری گمشدگی کے 8,000 سے زائد واقعات رپورٹ ہوئے۔

سری لنکا نے 2016 میں میثاق کی توثیق کی اور اس طرح میثاق کی توثیق کرنے والی ساتویں ایشیائی ریاست بنا۔ جنوبی ایشیائی ریاستوں میں مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جبری گمشدگی کو فوجداری قانون میں باقاعدہ جرم کا درجہ حاصل نہیں۔ قانونی ڈھانچے کی عدم موجودگی میں جبری گمشدگیوں کو 'لاپتہ افراد' تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح جبری گمشدگی کے جرم کی پیچیدگی اور سنگینی کو تسلیم نہ کر کے اُس اذیت سے بھی چشم

جیلوں میں زیر سماعت قیدیوں پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا

پوشی کی جاتی ہے جو جبری گمشدہ فرد کے عزیز و اقارب جھیلتے ہیں۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ سکیورٹی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کو قانونی استثنیٰ حاصل ہے۔ اُنہیں حاصل وسیع اور بے لگام اختیارات اُنہیں شہریوں کو بغیر کسی الزام کے گرفتار کرنے اور طویل مدت کے لیے زیرِ حراست رکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جبری گمشدگیوں کے مجرموں کو سزا سے استثنیٰ کے خاتمے کے لیے ایشیا بھر میں قانون اور پالیسی میں جامع اصلاحات کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر برس کے دوران، ملک بھر سے جبری گمشدگیوں کے واقعات رپورٹ ہوتے رہے۔

جبری گمشدگیوں کے انکوائری کمیشن کے مطابق 2016 میں لاپتہ افراد کی فہرست میں 728 پاکستانیوں کا اضافہ ہوا۔ یہ تعداد چھ برسوں میں سب سے زیادہ ہے اور اب لاپتہ افراد کی کل تعداد 1,219 تھی۔

26 جولائی کو، سماجی کارکن عبدالواحد بلوچ کو سُپر ہائی وے پر رینجرز کی ایک چوکی کے نزدیک سے اُس وقت اغوا کرلیا گیا جب وہ میر پور خاص سے کراچی جا رہے تھے۔ ان کی بس کو ٹال پلازہ پر روکا گیا، سادہ کپڑوں میں ملبوس دو افراد نے ان کی اور اُن کے دوست کی شناختی دستاویزات دیکھیں۔ اُن دونوں کو بس سے باہر موجود لوگوں کے ساتھ جانے کو کہا گیا۔ بعدازاں اُن لوگوں نے بلوچ کے دوست کو چھوڑ دیا اور بلوچ کو نیلے رنگ کی ٹیوٹا ویگن میں اپنے ساتھ بٹھا کر فرار ہو گئے۔ بلوچ کو جس جگہ سے غائب کیا گیا وہ گڈاپ پولیس اسٹیشن اور رینجرز کی چیک پوسٹ کے قریب تھی جس سے بلوچ کے اہل خانہ کے اِس مؤقف کو تقویت ملی کہ اُنہیں سکیورٹی فورسز یا انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اغوا کیا تھا۔ بلوچ خود بھی بلوچستان میں ہونے والی جبری

گمشدگیوں کی سرگرم مخالفت کررہا تھا۔ پولیس نے ایچ آر سی پی کے کارکنوں کے کہنے کے باوجود بھی ایف آئی آر درج نہ کی۔عدالتِ عالیہ،سندھ کے حکم پر قانون نافذ کرنے والی خفیہ ایجنسیوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی۔ بلوچ کی بیٹی،حانی بلوچ نے اپنے باپ کی بحفاظت رہائی کے لیے کراچی اور لاہور میں احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا۔اُنہیں گمشدگی کے پانچ ماہ سے زائد عرصہ کے بعد بالآخر 5 دسمبر کو رہا کر دیا گیا۔اُن کی گمشدگی کے دوران عوام کو ان کے مقام سے لاعلم رکھا گیا۔

خیبر پختونخوا کے ضلع بونیر سے جبری گمشدگی کے کئی واقعات رپورٹ ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق،سوات آپریشن کے بعد شدت پسند سوات سے متصل ضلع بونیر منتقل ہو گئے تھے۔فوج اُس وقت سے ضلع بونیر میں سرچ آپریشن کررہی تھی اور چھاپے مار رہی تھی۔ 17 مئی کو گاؤں ڈوکڈا کے سرفراز احمد کو اُن کے گھر سے اٹھایا گیا جو اُس وقت سے لاپتہ ہیں۔ 7 جنوری کو گاؤں پولانڈ میں ایک سرچ آپریشن کے دوران 70 سالہ سید خان باچا کو اُن کے گھر سے اٹھایا گیا۔ 7 ستمبر کو اقبال حسین کو گاؤں ڈوکنڈا سے اُن کی کریانے کی دوکان سے اغوا کیا گیا۔

جبری گمشدگیوں کے واقعات کے شکایت دہندوں نے اسلام آباد میں واقع جبری گمشدگی کے انکوائری کمیشن کی کارکردگی پر مایوسی کا اظہار کیا۔انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد، عدالتِ عظمیٰ نے جبری گمشدگیوں کے تمام واقعات کمیشن کو منتقل کر دیے تھے۔مگر انسانی حقوق کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ کمیشن متاثرین کو ریلیف دینے میں ناکام رہا ہے۔ چھ برس کے عرصہ میں، اِس کی تشکیل سے لے کر اب تک، مجرموں کو سزا دینا تو دور کی بات ہے،کسی کے خلاف کسی ایک واقعے کی فوجداری تحقیقات بھی نہیں ہوسکیں۔ انتہائی کم وسائل ہونے اور سکیورٹی و انٹیلی جنس ایجنسیوں پر اپنا فیصلہ لاگو کرنے کا اختیار نہ رکھنے کے باعث بھی کمیشن پر تنقید کی جاتی ہے۔نومبر 2016 تک کمیشن کے پاس تقریباً 1300 کیسز زیرالتواء تھے اور اُن میں سے تقریباً نصف خیبر پختونخوا سے تھے۔ دسمبر 2016 میں کمیشن کی پیش کی گئی رپورٹ کے مطابق، زیرالتوا کیسز میں سے 200 سندھ سے، 223 پنجاب سے، 654 خیبر پختونخوا سے، 96 بلوچستان سے، 53 فاٹا سے اور چار گلگت بلتستان سے رپورٹ ہوئے۔

حکام نے ابھی تک زینت شہزادی کے اغواء اور مبینہ جبری گمشدگی کی تحقیقات نہیں کی تھیں جسے 19 اگست 2015 کو اغوا کیا گیا تھا۔ 24 سالہ صحافی لاہور میں ایک آٹو رکشہ پر سوار ہو کر اپنے دفتر جارہی تھی جب اُسے مسلح افراد نے اغوا کیا،اُس وقت سے اُس کا کچھ اتا پتا

نہیں۔ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ وہ جبری گمشدگی کا نشانہ بنی ہے۔ وہ ایک ہندوستانی شہری حامد انصاری کی گمشدگی کے مقدمے کے متعلق شہادت دینے والی تھی جس سے صرف چند روز قبل اُسے جبری طور پر لاپتہ کیا گیا۔ وہ حامد انصاری کی جبری گمشدگی کے واقعے کی تحقیقات اور رپورٹنگ کر رہی تھی۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پاکستان کے اُن 60 اضلاع میں انسانی حقوق کی صورت حال پر نظر رکھی جہاں انسانی حقوق کی صورتِ حال ملک کے دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ خراب تھی۔ پاکستان نے رواں برس کے دوران اُن اضلاع سے جبری گمشدگیوں کے 79 کیسز قلمبند کیے۔ درج ذیل جدول میں پاکستان کے 60 اضلاع سے رپورٹ ہونے والی جبری گمشدگیوں کو صوبہ وار بیان کیا گیا ہے۔

	2014	2015	2016
خیبر پختونخوا	7	28	16
بلوچستان	106	65	38
اندرون سندھ	13	22	19
جنوبی پنجاب	2	1	0
فاٹا	2	10	6
گلگت بلتستان	1	0	0
کل	**131**	**126**	**79**

اِس حقیقت کے باوجود کہ جبری گمشدگیوں کے تازہ واقعات کی رپورٹنگ کا تسلسل جاری تھا، انکوائری کمیشن کے سربراہ نے دسمبر میں سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلی امور کو بتایا کہ انہیں ''لاپتہ افراد کی مبالغہ آمیز تعداد بتائی گئی ہے'' اور یہ کہ بلوچستان میں صرف 96 افراد لاپتہ تھے۔ انہوں نے ملک کی غیر سرکاری تنظیموں پر الزام لگایا گیا کہ وہ منفی کردار ادا کر رہی ہیں اور مزید کہ انہوں نے 2012 میں اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ کے دورہ پاکستان کی راہ ہموار کی ہے۔ اجلاس کے دوران، ایک سابق وزیر داخلہ نے کہا کہ بلوچوں کے قتل میں موردالزام فرنٹیئر کور اور فوج کے اہلکار اصل میں ہندوستانی کارندے تھے جنہوں نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ حالانکہ انکوائری کمیشن کے سربراہ نے اپنی رپورٹ میں یہ ذکر کیا تھا کہ سندھ میں لاپتہ ہونے والے لوگ کئی برس تک پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی حراست میں رہے۔

ذرائع ابلاغ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ وزارت انسانی حقوق سے حاصل کردہ اعداد وشمار کے مطابق گزشتہ چھ برسوں میں، بلوچستان میں سیاسی کارکنوں اور مشتبہ مسلح علیحدگی پسندوں کی تقریباً 1,000 نعشیں برآمد ہوئی ہیں۔ حکومت مسلسل یہ کہتی رہی کہ ان نعشوں کی بنیادی وجہ باغی گروہوں کی آپس کی لڑائی ہے، تاہم مقتولین کے اہلِ خانہ کا یہ کہنا تھا کہ مقتولین کے ماورائے عدالت قتل سے قبل اُنہیں سکیورٹی ایجنسیوں نے اٹھایا تھا۔

جبری گمشدہ افراد کی بازیابی کے لیے کام کرنے والی ایک مقامی این جی او 'ڈیفنس آف ہیومن رائٹس' نے جبری گمشدہ افراد کی رشتہ دار خواتین کو درپیش مشکلات پر ایک تحقیق کا اہتمام کیا۔ انٹرویو کیے گئے 100 خاندانوں میں سے 98 فیصد نے بتایا کہ وہ جبری گمشدہ فرد کی عدم موجودگی میں خود کو غیر محفوظ تصور کرتی ہیں۔ اُن تمام کا کہنا تھا کہ اُنہیں اپنے پیاروں کے مقدمات کی پیروی کے لیے حکومت سے کسی قسم کی امداد نہیں ملی۔ انٹرویو کی گئی تمام خواتین نفسیاتی دباؤ کا شکار بنیں اور یہاں تک کہ 67 فیصد نے ماہر نفسیات سے بھی رجوع کیا۔ رپورٹ میں 'نصف بیوہ' کے معاملے پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ یہ اصطلاح اُن شادی شدہ خواتین کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن کے خاوند جبری گمشدگی کا نشانہ بن چکے ہیں۔ شریک حیات کی عدم موجودگی میں، جو کہ پاکستان میں زیادہ تر گھر کا محافظ تصور کیا جاتا ہے، بیوی کو وہ کام کرنا پڑتے ہیں جو کہ بالعموم مردوں سے وابستہ ہوتے ہیں یا پھر اُن پر معاشرے اور اپنے خاندان کی طرف سے دوبارہ شادی کرنے کا دباؤ ہوتا ہے، تاہم، خاوند کی قسمت پر چھائی غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے، یہ عمل اُن کے لیے قانونی اور جذباتی لحاظ سے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

سفارشات

☆ حکومت کو فوری طور پر پھانسی پر عارضی پابندی لگانی چاہیے اور سزائے موت کا خاتمہ حکومت کا حتمی نصب العین ہونا چاہیے۔

☆ جبری گمشدگیوں سے تمام افراد کے تحفظ کے میثاق کی توثیق کرنی چاہیے۔

☆ ایذا رسانی کے خلاف میثاق (کیٹ) کی روشنی میں ایذا رسانی کے خلاف مخصوص قانون بنائے، اور فوری انصاف کی فراہمی کے لیے پالیسی تشکیل دے اور اُس کا نفاذ کرے، اور جیلوں میں قیدیوں کی بہتات کے مسئلے سے نبٹنے کے لیے نئی جیلیں تعمیر کرے۔

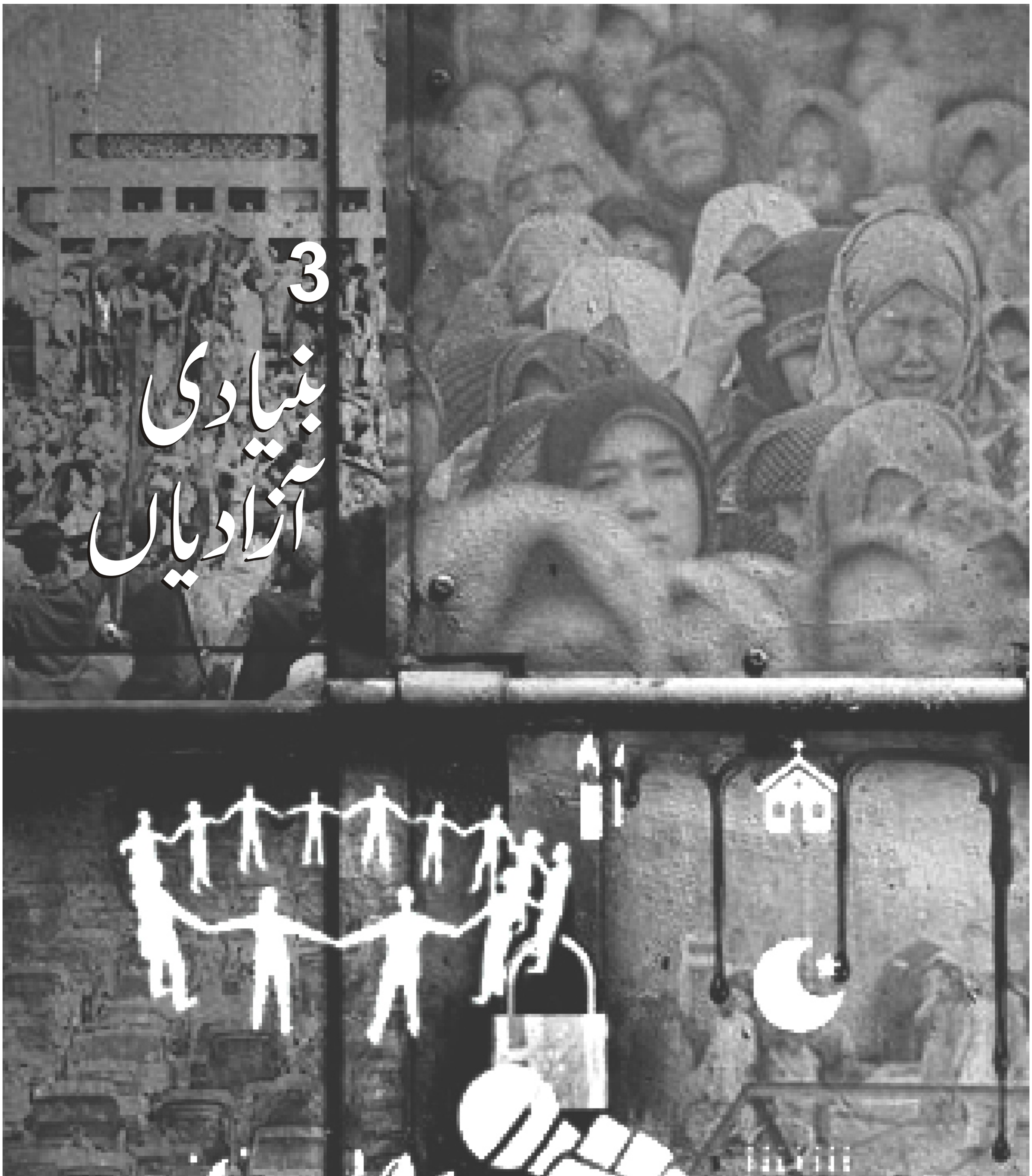
3
بنیادی
آزادیاں

بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی

ہر شہری کو پاکستان میں رہنے، داخل ہونے اور آزادانہ پورے ملک میں گھومنے پھرنے، ملک کے کسی بھی حصے میں رہائش اختیار کرنے یا مستقل طور پر آباد ہونے کا حق حاصل ہے۔ البتہ یہ حق قانون کے تحت مفاد عامہ میں جائز طور پر عائد کی گئی کسی بھی پابندی سے مشروط ہے۔

آئین پاکستان
[آرٹیکل - 15]

ہر شخص کو کسی بھی ریاست کی حدود میں گھومنے، پھرنے، سفر کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔
ہر شخص کو اپنے ملک سمیت، کسی بھی ملک کو چھوڑنے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور
[آرٹیکل -17(2,1)]

1۔ کسی ملک کی حدود میں قانونی طور پر رہائش پذیر ہر شخص کو ان حدود کے اندر آزادانہ نقل وحرکت اور آزادی کے ساتھ اپنی رہائش گاہ منتخب کرنے کا حق ہوگا۔
2۔ ہر شخص اپنے ملک سمیت کوئی بھی ملک چھوڑنے کے لیے آزاد ہوگا۔
3۔ متذکرہ حقوق کسی پابندی سے مشروط نہیں ہوں گے سوائے ان پابندیوں کے جو قانون کے تحت عائد کی جائیں اور جن کا مقصد قومی سلامتی، امن عامہ، صحت عامہ، اخلاق عامہ، یا دوسرے لوگوں کی آزادی کا تحفظ ہوگا۔ وہ پابندیاں ان حقوق کے مطابق ہوں گی جو موجودہ میثاق میں تسلیم کیے گئے ہیں۔
4۔ کسی شخص کو حکام کی مرضی کے تحت اپنے ملک میں داخل ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

شہری وسیاسی حقوق کا عالمی میثاق
[آرٹیکل - 12]

نقل وحرکت کی آزادی جو کہ فرد کی ترقی کی بنیادی شرط ہے، پاکستان میں 2016ء کے دوران بھی زیرِ عتاب رہی۔ نقل وحرکت کی آزادی کی خلاف ورزی کی بنیادی وجوہات امن عامہ کی مخدوش صورت حال، شدت پسندی، شورش پر قابو پانے کے لیے کیے گئے اقدامات اور قدرتی آفات تھیں۔ خواتین، خواجہ سراؤں اور بعض مذہبی اقلیتی برادریوں کے لیے سفر کرنا خطرات سے خالی نہیں تھا۔ عدالتوں نے اندرون و بیرون ملک سفر پر پابندیوں سے متعلقہ کئی کیسز کی سماعت کی۔ ایسے ہی ایک کیس میں، عدالتِ عظمیٰ نے زور دے کر کہا کہ نقل وحرکت کی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے جسے پسند یا ناپسند کی بنیاد پر بے جا طریقے سے محدود یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔

مشکلات

امن عامہ

''امن عامہ برقرار رکھنے کی بنیاد پر'' عائد کردہ بعض پابندیوں سے لوگوں کی نقل و حرکت متاثر ہوئی۔ پاکستان تحریک انصاف نے وزیراعظم کو بدعنوانی کے الزامات پر مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کے لیے اسلام آباد کو بند کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے ردِّعمل میں پولیس نے ملک گیر کارروائی کرکے پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے تقریباً 1800 حمائتیوں کو گرفتار کیا۔ پولیس نے اسلام آباد جانے والی بڑی شاہراہوں پر کنٹینرز رکھے تاکہ خان کی جماعت کے ملک بھر سے آنے والے قافلوں کو اسلام آباد پہنچنے سے روکا جاسکے۔ وزیرداخلہ کا کہنا تھا کہ خان کے حمایتی حکومتی دفاتر پر دھاوا بولنے سمیت دیگر پُرتشدد کارروائیاں کرنے کے عزائم لے کر آرہے تھے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ نے خان کے حمایتیوں کو اسلام آباد کی سڑکوں پر احتجاج کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ریلی سٹی پارک کی حدود تک محدود رہنی چاہیے۔ حکومت نے پہلے ہی اسلام آباد کی سڑکوں پر ریلیاں نکالنے پر دو ماہ کی پابندی عائد کررکھی تھی۔

پنجاب حکومت نے فروری میں سنی تحریک کے سربراہ ثروت اعجاز قادری کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کی اور اس پابندی کے جواز میں کہا کہ صوبے میں اُن کا داخلہ امن عامہ میں خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ قادری نے پابندی کو عدالتِ عالیہ، لاہور میں چیلنج کیا۔

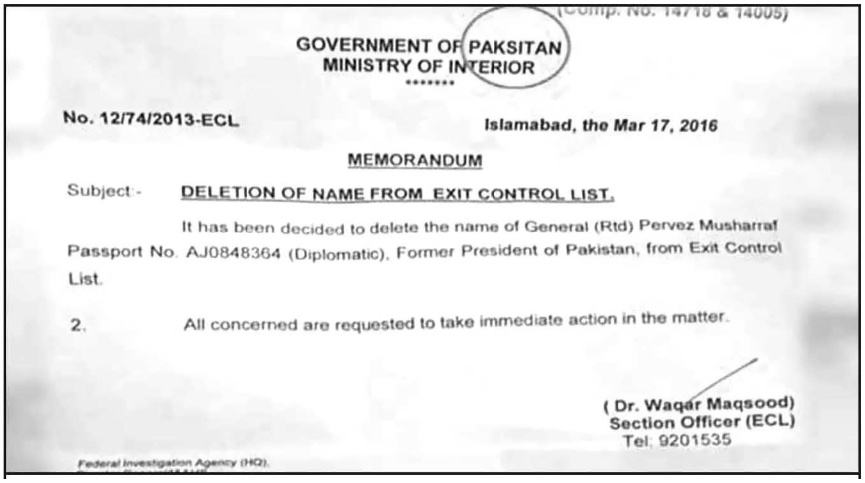

(Comp. No. 14718 & 14005)

GOVERNMENT OF PAKSITAN
MINISTRY OF INTERIOR
****

No. 12/74/2013-ECL Islamabad, the Mar 17, 2016

MEMORANDUM

Subject:- DELETION OF NAME FROM EXIT CONTROL LIST.

It has been decided to delete the name of General (Rtd) Pervez Musharraf Passport No. AJ0848364 (Diplomatic), Former President of Pakistan, from Exit Control List.

2. All concerned are requested to take immediate action in the matter.

(Dr. Waqar Maqsood)
Section Officer (ECL)
Tel: 9201535

Federal Investigation Agency (HQ),

پنجاب حکومت نے وفاقی حکومت سے کہا کہ 12 دسمبر کو ڈالمیال، چکوال میں احمدی عبادت گاہ پر حملے کے ایک مشتبہ فرد کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ (ای سی ایل) میں ڈالا جائے۔ ایک کینیڈین جو گزشتہ 40 برس سے کینیڈا میں مقیم تھا، وقوعہ سے چند ماہ قبل اپنے آبائی گاؤں لوٹا تھا اور اس نے مبینہ طور پر ہجوم کو احمدی جائے عبادت کا محاصرہ کرنے کے لیے متحرک کیا۔

مہمند ایجنسی میں پولیٹیکل ایڈمنسٹریشن نے ترکزئی قبیلے کو کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈز (سی این آئی سی) پاسپورٹ اور ڈومیسائل کے اجرا پر پابندی عائد کی۔ مذکورہ قبیلے پر پابندی اُس وقت عائد کی گئی جب وہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) کی اجتماعی ذمہ داری کی شق کے تحت خاصہ دار فورس کے اہلکار کے قتل کے ملزم کو پولیٹیکل ایڈمنسٹریشن کے حوالے کرنے میں ناکام رہا تھا۔

احتجاجی مظاہرے

حکومت کے خلاف حزب اختلاف اور مذہبی جماعتوں؛ سروس اسٹرکچر کے خلاف ڈاکٹروں، اپنی تنخواہوں کے لیے پیرامیڈکس، کسانوں نے سہولتوں کے لئے معاوضہ جات کے لیے اساتذہ؛ اور نجکاری کے خلاف ریاستی اداروں کے ورکرز کے احتجاجی مظاہروں سے قبل اور اُن کے دوران پیدا ہونے والی کشیدہ صورت حال نے ملک کے مختلف علاقوں میں مسافروں اور ٹرک ڈرائیوروں کے لیے بہت زیادہ مشکلات پیدا کیں۔ اُن علاقوں میں تجارتی مراکز اور پٹرول پمپ بندرہے جبکہ سڑکوں پر پبلک ٹرانسپورٹ بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ انتہائی اہم شخصیات (وی وی آئی پی) کی آمدورفت کے موقع پر بھی سڑکیں عام آمدورفت کے لیے بند کی جاتی تھیں۔ اکثر اوقات یہ صورت حال ہوتی تھی کہ پولیس کے پاس ٹریفک کی بہتر روانی کو یقینی بنانے کے لیے متبادل منصوبہ نہیں تھا اور بڑی شاہراہوں پر ٹریفک کی لمبی قطاریں لگ جاتی تھیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن (پی آئی اے) کے ورکرز نے اُس کی مجوزہ نجکاری کے خلاف احتجاج کیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد ملکی و غیرملکی ایئرپورٹس پر پھنسے رہے۔ مسائل میں گھری پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن کی پروازیں 10 دنوں تک بند رہیں۔

سالانہ پابندی

مزید برآں، اسلامی مہینے محرم میں مجسٹریٹس امن عامہ کے حوالے سے حساس علاقوں میں اُن خطیبوں اور ذاکروں کے داخلے پر پابندی لگا دیتے ہیں جو کہ فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کے حوالے سے معروف ہیں۔

26 ستمبر کو، ضلعی مجسٹریٹ اسلام آباد کے ایک ایسے ہی آرڈر کے تحت وفاقی دارالحکومت میں 16 مذہبی علماء کے داخلے پر دو ماہ کی پابندی عائد کی گئی تاکہ ''محرم کے دوران شہر میں امن عامہ کو برقرار رکھا جاسکے''۔ پابندی کے خلاف پٹیشن دائر کی گئی۔ اکتوبر میں، عدالتِ عالیہ اسلام آباد نے اُس نوٹیفکیشن کو کالعدم قرار دینے سے انکار کر دیا جس میں وفاقی دارالحکومت میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کے داخلے پر دو ماہ کی پابندی عائد کی گئی تھی۔

شدت پسندی اور اس کے انسداد کے لیے کیے گئے اقدامات

عبادت گاہوں اور مزاروں پر جانے والے لوگوں پر ہونے والے تشدد اور اس کے انسداد کے لیے کیے گئے اقدامات نے بھی لوگوں کی نقل وحرکت کے لیے مسائل پیدا کیے تھے۔

نومبر میں کم از کم 54 افراد ہلاک اور 100 سے زائد افراد زخمی ہوئے جب ضلع خضدار کے پہاڑی علاقے میں واقع شاہ نورانی مزار کے لوگوں سے بھرے احاطے میں ایک کمسن خودکش بمبار نے خود کو بم دھماکے سے اڑا دیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق، شدت پسند گروپ، دولتِ اسلامیہ نے حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ شاہ نورانی مزار کے نگران نے بتایا کہ بروز ہفتہ 1,000 سے 1,500 افراد مزار پر آتے تھے اور شام کے وقت مزار میں روایتی صوفی رقص ہوتا تھا۔ ایک اور عہدیدار نے بتایا کہ ملک بھر خصوصاً کراچی جو کہ 250 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، سے 1,000 سے زیادہ افراد مزار پر آئے تھے جو دھماکے کے وقت وہاں موجود تھے۔

خیبر پختونخوا میں پولیس نے 28 جون کو 2,000 سے زائد ''غیر قانونی آبادکار'' افغانوں کی گرفتاری کا اعلان کیا۔ افغانستان کے ساتھ طویل سرحد والے صوبے، جو کہ پاکستان میں مقیم افغان مہاجرین کی اکثریتی آبادی کا میزبان بھی ہے، میں آباد افغان مہاجرین کی نقل و حرکت کی آزادی کے حق پر بھی پابندیاں عائد کی گئیں۔ خیبر پختونخوا حکومت کے ایک ترجمان نے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ یکم جولائی سے تمام افغان مہاجرین کی نقل وحرکت اُن کے کیمپوں تک محدود ہوگی اور اُنہیں صوبے میں آزادانہ نقل وحرکت کی آزادی نہیں دی جائے گی''۔ 29 جون کو خیبر پختونخوا پولیس نے کہا کہ اُنہوں نے کم از کم 500 رجسٹرڈ افغان مہاجرین کو گرفتار کر کے ملک بدر کیا کیونکہ وہ ملک کی ''سلامتی کے لیے خطرہ'' بن سکتے تھے۔ پولیس نے پہلے سے خوفزدہ افغانوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی نقل وحرکت محدود کریں جس کے باعث اُنہیں معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کی تعلیم وروزگار تک رسائی محدود ہوئی۔

طورخم بارڈر پر ویزا کی شرائط نے اُن افغان مریضوں کے لیے صحت کے مسائل پیدا کیے جو پشاور کے نجی ہسپتالوں میں افغانستان سے طبی معائنے کے لیے آتے ہیں۔ ویزے کی شرط سے قبل، افغان شہری بغیر کسی رکاوٹ کے ڈاکٹروں کے پاس آ سکتے تھے۔

سینیٹر تاج محمد نے مطالبہ کیا کہ طورخم بارڈر کے دونوں اطراف رہنے والے لوگوں کو ویزے اور پاسپورٹ سے استثنٰی ملنا چاہیے اور بارڈر کے دونوں طرف آمدورفت کے لیے اُنہیں بارڈر پاس جاری ہونے چاہئیں۔

وفاق کے زیرِانتظام بعض علاقہ جات تک عوام کی رسائی نہیں تھی جہاں فوجی آپریشن چل رہا تھا۔ سکیورٹی فورسز نے فاٹا میں تین بڑے آپریشن کیے تھے: خیبر۔3، آپریشن مچنی اور آپریشن بریخنا۔ سکیورٹی فورسز کا کہنا تھا کہ رجگل کا 100 فیصد علاقہ اُن کے کنٹرول میں ہے کیونکہ دہشت گردوں کو علاقے سے نکال دیا گیا ہے اور قبائلی علاقوں میں اب ایسا کوئی مقام نہیں ہے جہاں جانا ممنوع ہو۔ اُن کا کہنا تھا کہ سکیورٹی فورسز کی کامیاب کارروائیوں کے بعد عارضی طور پر نقل مکانی کرنے والے افراد (ٹی ڈی پی) کی 92 فیصد رضاکارانہ وطن واپسی کا عمل مکمل ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ 673 طویل شاہراہ کی تعمیر کے منصوبے بھی پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔

ایگزٹ کنٹرول لسٹ (ای سی ایل)

2016 کے دوران، بیرون ملک سفر کرنے کی خواہش رکھنے والے بعض افراد کو پاسپورٹ کے اجراء میں تاخیر، ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے بے جا استعمال اور حکومت کی طرف سے بارڈر کنٹرول سسٹم کی اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں۔

جنوری میں، ایک نوجوان نے پاسپورٹ کے اجراء میں تاخیر کی وجہ سے پٹرول پی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی جبکہ ایک اور فرد نے پاسپورٹ کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے پاسپورٹ دفتر کے سامنے خودکشی کی کوشش کی۔ پاسپورٹ ایجنٹ مافیا کے خلاف ہونے والی ملک گیر کارروائی کے باعث سینکڑوں لوگ گرفتار ہوئے۔

اپریل میں، سابق صدر ریٹائرڈ جنرل پرویز مشرف کے بیرون ملک سفر پر پابندی ختم کرتے ہوئے، عدالتِ عظمٰی نے اپنے تفصیلی فیصلے میں کہا، ''آئین کی رو سے نقل وحرکت کی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے جسے پسند یا ناپسند کی بنیاد پر بے جا طور پر محدود یا ختم نہیں کیا جا

پی آئی اے کے ملازمین نے پی آئی اے کی مجوزہ نجکاری کے خلاف احتجاج کیا جس کے باعث ہزاروں مسافر فضائی اڈوں پر پھنسے رہے

سکتا۔ فیصلے میں کہا گیا کہ ''ای سی ایل میں جنرل مشرف کا نام شامل کرنے یا برقرار رکھنے اور نتیجتاً اُن کی نقل وحرکت کو محدود کرنے کے سوال پر غور کرتے وقت، ہم اِس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ آئین کی دفعہ 15 کے تحت نقل وحرکت کی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے اور اسے کسی قانونی جواز کے بغیر محض پسند یا ناپسند کی بنیاد پر بے جا طور پر محدود یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

اس فیصلے سے قبل 16 مارچ کو ایک مختصر آرڈر جاری کیا گیا تھا جس میں ای سی ایل سے جنرل مشرف کا نام حذف کرنے کے عدالتِ عالیہ، سندھ کے 12 جون 2014 کے فیصلے کو برقرار رکھا گیا تھا۔ تاہم، مختصر آرڈر میں وفاقی حکومت اور غداری کے مقدمے کی سماعت کرنے والے تین ججوں کے بنچ کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مشرف کی تحویل کو کنٹرول کرنے یا اُس کی نقل و حرکت کو محدود کرنے کے لیے کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

عدالتِ عظمیٰ کے مختصر آرڈر کے بعد وزارت داخلہ کی طرف سے جنرل مشرف کا نام ای سی ایل سے نکالنے کے فوری بعد وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ وزارت داخلہ نے کہا کہ اُنہوں نے جنرل مشرف کا نام ای سی ایل سے نکالنے کا فیصلہ عدالتِ عظمیٰ کے آرڈر کی روشنی میں لیا تھا۔

عدالتِ عالیہ لاہور نے سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹے موسیٰ گیلانی کا نام ای سی ایل سے نکالنے کا حکم صادر کیا۔ اُن کا نام بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے تین سے زائد برسوں سے ای سی ایل میں تھا۔

جولائی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے ایک درخواست مسترد کردی جس میں ایک خاتون کا ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام شامل کرنے کا کہا گیا جن پر توہین مذہب کا الزام تھا۔

اکتوبر میں، انسداد دہشت گردی عدالت نے پولیس کو ہدایت کی کہ بلدیہ گارمنٹ فیکٹری میں آگ لگنے کے واقعہ میں ملوث دو مفرور ملزموں کا نام ای سی ایل میں ڈالنے کے لیے حکام سے رابطہ کیا جائے۔ تاہم تحقیقاتی افسر نے عدالت کو بتایا کہ دونوں ملزم ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔ جب ستمبر 2012 میں بلدیہ ٹاؤن میں واقع فیکٹری کی کثیر منزلہ عمارت کو آگ لگائی گئی تھی۔ اس میں 250 سے زائد مزدور زندہ جل گئے تھے۔

اکتوبر میں، حکومت نے صحافی سرل المائدہ کا نام ای سی ایل میں ڈالا۔ ڈان نے سول ملٹری قیادت میں تناؤ کے متعلق المائدہ کی خبر شائع کی تھی جس کے بعد حکومت نے یہ اقدام کیا۔ انسانی حقوق اور ذرائع ابلاغ کی ملکی و عالمی تنظیموں، سیاستدانوں، نیز آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی، پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے المائدہ کے سفر پر پابندی کی مذمت کی۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اپنے ایک بیان میں کہا، ''سرل المائدہ کے بیرون ملک سفر پر پابندی اور اُن کے آجر، انتہائی باوقار ڈان اخبار پر دباؤ سے اندرون و بیرون ملک اُن تمام لوگوں کو افسوس ہوگا جو اظہار رائے کی آزادی اور صحافیوں کے حقوق پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ وقت عالمی صحافتی برادری کو پاکستان کے خلاف کرنے کا نہیں ہے۔

''ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ مسٹر المائدہ کا نام ای سی ایل سے نکالا جائے اور اُنہیں اور اُن کے آجروں کو ہراساں کرنے سے گریز کیا جائے۔ ہم یہ بھی پرزور مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے جو معاملات بھی اہمیت کے حامل ہیں، اُن سے نپٹنے کے حوالے سے قانون کی پیروی، اظہار کی آزادی اور شہریوں کے دیگر حقوق، خاص طور پر منصفانہ قانونی کارروائی سے چشم پوشی نہ کی جائے۔''

اکتوبر میں، پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے ''لوگوں کی نقل و حرکت کی آزادی کو محدود کرنے'' کے لیے ای سی ایل استعمال کرنے پر حکومت پر تنقید کی۔

اِس سے پہلے بلاول بھٹو زرداری نے ای سی ایل کے استعمال پر حکومت کو اُس وقت تنقید کا نشانہ بنایا تھا جب دو سابق وزرائے اعظم یوسف رضا گیلانی اور راجہ پرویز اشرف کے

بیرون ملک سفر پر پابندی لگائی گئی تھی۔ بلاول نے ای سی ایل کو 'استحصال کا آلہ' قرار دیا تھا۔

اُن کا تازہ ردِّعمل المائدہ کے خلاف حکومتی اقدام کے بعد سامنے آیا تھا۔حکومت نے المائدہ پر پابندی عائد کرنے کے تین روز بعد ہٹا دی تھی۔

2015 میں کرنسی اسمگلنگ کے ایک مقدمے میں موردِالزام، سُپر ماڈل ایان علی ای سی ایل سے اپنا نام نکلوانے کے لیے پورا برس قانونی جنگ لڑتی رہی۔

سابق آڈیٹر جنرل پاکستان (اے جی پی) بُلند اختر رانا نے ڈائریکٹوریٹ جنرل امیگریشن و پاسپورٹ کے ایک نوٹیفکیشن کو عدالتِ عالیہ اسلام آباد (اے جی پی) میں چیلنج کیا جس کے تحت مئی 2015 میں اے جی پی کے عہدے سے اُن کی برخواستگی کے وقت سے اُن کے بیرون ملک سفر پر پابندی عائد تھی۔ رانا کا کہنا تھا کہ اُنہیں حال ہی میں کسی نے آگاہ کیا ہے کہ اُن کا نام ای سی ایل میں ڈال دیا گیا ہے۔ تب تک وہ اس کے بارے میں لاعلم تھے۔ ڈائریکٹوریٹ کا کہنا تھا کہ رانا نے کینیڈین شہریت چھپا کر پاکستانی پاسپورٹ حاصل کیا تھا۔

رانا کو دو ریفرنسز میں سزا ہوئی تھی اور اُنہیں اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا جب مئی 2015 میں سپریم جوڈیشل کونسل نے اُنہیں بدانتظامی کا مرتکب قرار دیا تھا۔

سندھ ہائی کورٹ نے ڈی آئی جی، حیدرآباد کو اس بات کو یقینی بنانے کی ہدایت کی کہ حیدرآباد ریجن میں 3,270 اشتہاری مجرموں کے نام ای سی ایل میں ڈالے جائیں اور اُن کے کھاتے منجمد ہوں۔

اگست میں، وفاقی تحقیقاتی ایجنسی (ایف آئی اے) نے علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے 12 سالہ لڑکے کو گرفتار کیا کیونکہ اُس کا نام ای سی ایل میں شامل تھا۔ ایف آئی اے کے عہدیداروں کے مطابق، لڑکے کے والدین کے درمیان اُس کی تحویل کے متعلق تنازعہ چل رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا نام اُن افراد کی فہرست میں شامل کیا گیا جن کے بیرون ملک سفر پر پابندی عائد تھی۔ بعدازاں، والدین کے مابین تنازعہ حل ہو گیا تھا۔ تاہم لڑکے کا نام ای سی ایل سے نہیں نکالا گیا تھا اور اسے اُس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ ابوظہبی سے ایئر پورٹ پہنچا۔ ایف آئی اے نے لڑکے کو اُس کے والدین کے حوالے کر دیا۔

غیر محفوظ نقل وحرکت

ریاست پر یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ نقل وحرکت کی آزادی کو نہ صرف سرکار کی مداخلت بلکہ نجی مداخلت سے بھی محفوظ کرے۔ 2016 کے دوران ایسے کئی واقعات پیش آئے جن سے ظاہر ہوا تھا کہ ریاست اس فریضے کی انجام دہی میں ناکام رہی ہے۔

کوئٹہ میں مسلح افراد نے شیعہ برادری کے افراد کی ایک بس پر حملہ کر کے چار خواتین ہلاک کر دیں۔

2016 میں راولپنڈی میں ایک آدمی نے اپنے ''عورت دشمن رویے'' کی وجہ سے 17 خواتین پر تیز دھار آلے سے حملے کیے جن سے ایک خاتون ہلاک ہوگئی۔ پولیس کے مطابق ملزم اپنی سوتیلی ماں کے مظالم کا ''بدلہ'' لینا چاہتا تھا۔ 22 سالہ محمد علی جنوری سے مارچ تک سڑکوں پر راہ چلتی عورتوں کو نشانہ بناتا رہا۔ اُس کے خلاف قتل اور اقدام قتل کے مقدمات درج کیے گئے تھے۔

2016 کے دوران صوبہ خیبر پختونخوا میں خواجہ سراء عورتوں پر متشدد حملوں میں اضافہ ہوا۔ طبی عملہ پولیس متاثرین کی مدد کرنے اور انہیں انصاف فراہم کرنے میں ناکام رہی۔

قرضے کی گرفت میں جکڑے لاکھوں لوگ حقیقی غلامی جیسے حالات کا شکار تھے۔ جبری مشقت، سندھ کی زرعی صنعت میں اور پنجاب اور خیبر پختونخوا میں اینٹوں کے بھٹوں پر عام تھی۔ غلامی کے عالمی گوشوارے 2016 کے مطابق پاکستان اُن ممالک کی فہرست میں پانچویں نمبر پر تھا جہاں غلامی کی حالت میں رہنے والی عالمی آبادی کا 58 فیصد حصہ رہائش پذیر تھا۔

نقل وحمل کی آزادی کو یقینی بنانا ریاست کی ذمہ داری ہے مگر 2016ء کے دوران ریاست نے اپنا یہ فریضہ ادا کرنے میں متعدد بار ناکامی کا مظاہرہ کیا

آفات

2اپریل کوگلگت بلتستان میں سیلابی بارشوں نے تباہی مچائی، 16افراد ہلاک ہوئے، زیادہ تر ہلاکتیں ضلع دیامر میں پیش آئیں۔ اُس کے بعد شاہراہ قراقرم (کے کے ایچ) کئی روز کے لیے ٹریفک کے لیے بند رہی۔

داسو بکمیلا کے علاقے چُوچنگ میں لینڈ سلائیڈنگ کے باعث کے کے ایچ کا ایک حصہ تباہ ہوا جبکہ ایک بڑی لینڈ سلائڈ نے علاقہ کیال میں پُرخطر شاہراہ کو ٹریفک کے لیے بند کر دیا تھا۔ شدید برفباری کے باعث لواری ٹنل بھی بند ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں چترالی پھنسے رہے۔ مزید برآں، جولائی میں لواری ٹنل کے نزدیک زیارت نالے پر کئی گاڑیاں سیلابی ریلے میں بہہ گئیں۔

بے ضابطگی

ایف آئی اے نے اپنی چھاپہ مار کارروائیوں میں ملک کے مختلف علاقوں سے متعدد انسانی اسمگلروں کو گرفتار کیا اور کئی سفری دستاویزات ضبط کیں۔ اُن میں بعض کالعدم تنظیموں کے جعلی دھمکی آمیز خطوط بھی شامل تھے جنہیں بیرون ممالک میں پناہ لینے کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔ حکومت نے ایسے 200 پاسپورٹ منسوخ کیے جو کہ حکومت کے مطابق غیر مجاز افراد کو جاری کیے گئے تھے۔

جولائی میں ایف آئی اے نے اپنے عملے کے ایک رکن کو گرفتار کیا جس نے کسی فرد کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

ایف آئی اے راولپنڈی نے ایک فرد کو گرفتار کیا جو کہ مبینہ طور پر جعلی ویزا ور درخواستوں کی تیاری کے لیے ہر درخواست گزار سے 9,000 ڈالر سے 20,000 ڈالر وصول کرتا تھا۔

سفارشات

☆ پاکستان کے تمام علاقوں میں شہریوں کی نقل و حرکت کی آزادی کی ضمانت دینا ریاست کا فرض ہے۔ ریاست کو اِس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ملک میں کسی قسم کے نو گوایریا زنہ ہوں اور یہ کہ لوگ ملک کے کسی بھی حصے میں سفر کے دوران محفوظ رہیں۔

☆ نقل وحرکت کی آزادی کو نہ صرف سرکاری مداخلت بلکہ نجی مداخلت سے بھی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اِس بات کو یقینی بنانے کے لیے خاص اقدامات کیے جائیں کہ خواتین کے کسی ایک حق کی بھی پامالی نہ ہو جو اُنہیں آئی سی سی پی آر کے تحت حاصل ہیں۔

☆ آئی سی ایل، نیز اس میں کسی فرد کا نام ڈالنے کی وجوہات سے عوام کو آگاہ کیا جائے اور اِس کے بے جا استعمال کو روکا جائے۔ پاسپورٹس کے اجراء میں تاخیر کے مسئلے سے نپٹا جائے۔

☆ اپنی پسند کے کسی بھی مقام پر رہائش اختیار کرنے کے شہریوں کے حق کو تحفظ دینے کے لیے خاص کاوشیں کی جائیں اور اِس مقصد کے لیے اُنہیں جبری گمشدگی کی تمام اشکال سے تحفظ فراہم کیا جائے۔ جبری مشقت کے خلاف بنائے گئے قوانین کا نفاذ یقینی بنایا جائے کیونکہ معاشرے کے انتہائی پسماندہ طبقے حقیقی غلامی جیسے حالات کا شکار ہیں۔

☆ بذریعہ سڑک، ٹرین اور جہاز سفر کو سستا، مؤثر اور محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

بنیادی آزادیاں

فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی

...... پاکستان کے عوام کی خواہش ہے کہ ایک ایسا نظام وجود میں لایا جائے، جس میں بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان حقوق میں سماجی مساوات، مساوی مواقع کی فراہمی، سب کے لیے یکساں قانون، سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، فکر وضمیر اور اظہار رائے کی آزادی، ایمان، عقیدے، عبادت اور تنظیم سازی کی آزادیاں بھی شامل ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے تابع ہوں گی۔ آئین پاکستان

[دیباچہ]

قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، الف: ہر شہری کو اپنے مذہب پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہوگا، ب: ہر مذہبی گروہ، فرقے اور مسلک کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، انھیں برقرار رکھے اور چلائے۔ آئین پاکستان

[آرٹیکل - 20]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں، سب کی عزت اور حق برابر ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل عطا کیے گئے ہیں، انھیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک اور رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل - 1]

ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، اور یہ آزادی بھی، کہ کوئی شخص تنہا یا کچھ افراد مل کر اجتماعی طور پر، نجی حدود میں یا سرعام، تعلیم وتبلیغ، اعمال و عبادات کے ذریعے اپنے مذہب کا اظہار کریں۔ [آرٹیکل - 18]

کسی شخص پر اس طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا کہ اس کا عقیدہ اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی مجروح ہو۔

کسی ریاست، ادارے، افراد کے گروہ یا فرد کی طرف سے کسی شخص کے ساتھ اس کے مذہب اور عقیدے کے باعث کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر ہر طرح کی عدم برداشت اور امتیازی سلوک کے خاتمے لیے اقوام متحدہ کا اعلامیہ

[آرٹیکل : 1 (2) اور 2 (1)]

2016 میں، قدامت پرست عناصر نے کسی اختلافی رائے یا عمل کو پنپنے کی اجازت نہ دی اور یوں اختلافی بیانیے کی عدم موجودگی سے تعصب کے فروغ کی راہ اور زیادہ ہموار ہوئی۔ انصاف کی فراہمی، تعلیمی اداروں اور روزگار کے مقامات پر امتیازی سلوک اور اکثریتی عقیدے کے لوگوں کے اقلیتی عقیدوں کے پیروکاروں کے ساتھ تعصّبات اور ناروا سماجی رویوں کا سلسلہ

جاری رہا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس صورت حال کو معاشرے میں قبولیت کا درجہ مل گیا ہے۔ ریاست نے مکالمے کا میدان مولویوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور عام آدمی کو اُن معاملات پر بات کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی جنہیں مذہبی طبقہ مقدس تصور کرتا ہے۔ بنیاد پرستی کو للکارنے والی آوازوں کا ہمیشہ کے لیے گلا گھونٹ دیا گیا یا پھر خاموش رہنے پر مجبور کیا گیا۔ احمدیوں، مسیحیوں، ہندوؤں اور حال ہی میں کیلاش اور ذکری عقائد جیسی مذہبی اقلیتیں بدزبانی، ٹارگٹ کلنگ اور ہجوم کے تشدد کا نشانہ بنتی رہیں اور اُن کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی بھی بدستور جاری رہی۔ احمدی ملک کے سیاسی نظام میں سرگرم شمولیت سے محروم رہے۔ احمدیوں جیسی مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی قوانین پر عمل درآمد جاری رہا اور ان کے استعمال میں اور زیادہ شدت پیدا ہوئی۔ ان قوانین نے اُنہیں اپنے مذہب پر آزادانہ عمل پیرا ہونے کے حق سے عملی طور پر محروم کر رکھا ہے۔ توہینِ رسالت (رسولؐ کی توہین) کے خلاف قانون مذہبی جنون کے عملی مظاہرے، ذاتی عداوت یا رنجش سے نبٹنے یا مالی مفاد کے حصول کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

توہینِ رسالت کے بعض مقدمات انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں کو منتقل کیے گئے حالانکہ انسداد دہشت گردی ایکٹ میں ایسا کوئی بندوبست نہیں۔ انتہا پسندوں نے ریاست کو دھمکیاں دینے کا سلسلہ جاری رکھا کہ توہین مذہب کے قانون میں کوئی تبدیلی کی گئی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اکثریتی کمیونٹی کے بھی بعض فرقوں کو عدم رواداری اور شدت پسندی کے حملوں کا سامنا رہا۔ شیعہ ہزارہ اُن میں سے ایک ہیں۔ سندھ میں حکومت کو بنیاد پرستوں کے دباؤ کے باعث مذہب کی جبری تبدیلی کے خلاف ہونے والی قانون سازی پر مجبوراً نظرثانی کرنا پڑی۔ سرکاری اعدادوشمار کے مطابق، یورپ اور دیگر ممالک میں پناہ کے خواہش مند پاکستانیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں اقلیتیں مذہبی ایذارسانی اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔

احمدی

2016 بھی احمدیوں کے لیے بہت دشوار سال ثابت ہوا۔ 2016 کے دوران چار احمدی اپنے عقیدے کے باعث مارے گئے جبکہ چکوال میں اُن کی عبادت گاہ پر حملہ کیا گیا اور اُسے آگ لگائی گئی۔ بنیاد پرست عناصر نے احمدیوں، جنہیں تحقیر کے طور پر قادیانی اور مرزائی کہا جاتا ہے، کی تضحیک کا سلسلہ جاری رکھا۔ نفرت، جذباتی تقاریر، کتابوں، پمفلٹس اور مرکزی میڈیا میں چھپنے والے نفرت انگیز مواد کے ذریعے چلائی جانے والی کینہ پرور مہم کے باعث اُن کی سماجی

زندگی شدید مشکلات سے دوچار رہی۔

2016 کے دوران ٹارگٹ کلنگ میں مارے جانے والے چار احمدیوں میں سے تین ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر داؤد احمد کو کراچی میں اُس وقت گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا جب وہ اپنے گھر کے باہر ایک دوست کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر خالق بشیر اپنے کلینک کے باہر کھڑے تھے جب دو موٹر سائیکل سواروں نے اُنہیں نشانہ بنایا۔ 4 جون کو اٹک میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو فائرنگ کر کے قتل کیا گیا جب وہ اپنے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ ایک 35 سالہ احمدی کو کوٹ عبدالمالک، شیخوپورہ میں اُن کے گھر کے باہر تیز دھار آلے کے وار کر کے قتل کیا گیا۔ اُنہیں 2012 اور 2014 میں بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اُنہوں نے پولیس کو اپنے تحفظ کے لیے درخواست جمع کروائی تھی کیونکہ اُنہیں موت کی دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں۔ اُن کے خاندان کو طویل عرصہ سے سماجی بائیکاٹ کا سامنا تھا۔

حالیہ برسوں کے دوران صرف کراچی میں 130 احمدیوں کو عقیدے کی بنیاد پر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے جبکہ ان کے قتل میں ملوث لوگ قانونی کارروائی سے محفوظ رہے جس سے انتہا پسندوں اور مذہبی جنونیوں کو شہہ ملی۔

2016 میں ریاست کے ہاتھوں احمدیوں کی ایذا رسانی میں اور زیادہ شدت پیدا ہوئی۔ ایک سرکاری ادارے، پنجاب ہاؤسنگ و پلاننگ ایجنسی کے جھنگ میں قائم ذیلی دفتر نے ربوہ جسے چناب نگر کہا جاتا ہے، میں اخبارات میں اراضی کے پلاٹوں کی نیلامی کا اشتہار چھپوایا۔ ربوہ میں 95 فیصد آبادی احمدیوں کی ہے۔ نیلامی کے نوٹس میں لکھا ہوا تھا کہ احمدیوں کو نیلامی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔

پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) کی کونسل برائے شکایات نے دو نجی ٹی وی چینلوں کے خلاف احمدیہ برادری کی شکایات کو 'ناقابل سماعت' قرار دے کر مسترد کر دیا، ان درخواستوں کو شکایات دہندگان کے مؤقف کو سُنے بغیر مسترد کیا گیا۔

شکایات کا نوٹس لیتے ہوئے، پیمرا نے دو نجی ٹی وی چینلوں کے میزبانوں کو طلب کیا تھا تاکہ وہ احمدی برادری کے خلاف لوگوں کو تشدد پر اکسانے کے الزامات پر اپنا مؤقف پیش کریں۔ سماعت کے مقررہ وقت پر، ایک ہجوم نے نعروں کی گونج میں پیمرا کے دفتر پر دھاوا بول دیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ شکایات مسترد کی جائیں۔ پیمرا کے دفتر میں موجود شکایت دہندگان کو

چکوال میں احمدیوں کی عبادت گاہ پر حملہ کیا گیا

وہاں سے بحفاظت نکلوانے کے لیے پولیس بلانا پڑی۔ چنانچہ وہ کونسل کے سامنے اپنے بیانات قلمبند نہ کروا سکے۔ پیمرا نے فریقین کا مؤقف سننے کے لیے اُنہیں دوبارہ بلانے کی بجائے شکایات کو ''نا قابل سماعت'' قرار دے دیا۔

5 دسمبر کو، محکمہ انسداد دہشت گردی (سی ٹی ڈی) پنجاب نے ربوہ میں احمدی برادری کے مطبوعات کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ اُنہوں نے وہاں کے چار ملازمین کو گرفتار کیا اور دفتر کا ساز و سامان، موبائل فون اور کئی کتابیں اُٹھا کر لے گئے جبکہ ان چیزوں کی وصولی کی کوئی رسید بھی نہ دی۔

سی ٹی ڈی کی دوسری ٹیم عمارت کی سکیورٹی والے کمرے میں داخل ہوئی، سکیورٹی منیجر پر تشدد کیا اور سی ٹی وی سسٹم کو ناکارہ کر دیا۔ واقعے کے چشم دید گواہوں نے بتایا کہ پولیس افسران نے تلاشی یا گرفتاری کے وارنٹ دکھانے سے انکار کیا تھا۔ بعدازاں 5 اور احمدی ورکروں کے خلاف ضابطہ تعزیرات پاکستان (پی پی سی) کی دفعہ 298-اے 298-بی اور 298-سی اور انسداد دہشت گردی ایکٹ (اے ٹی اے) کی دفعہ (ڈبلیو) 11-9 کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔

ربوہ میں پبلشنگ ہاؤس پر چھاپے پر ردّعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ذرائع ابلاغ کو دیے گئے اپنے ایک بیان میں کہا ''حراست میں لیے گئے چار افراد پر تشدد بلا جواز تھا۔ سی ٹی ڈی اور صوبائی حکام کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ پُرامن اور غیر مسلح شہریوں پر چھاپے کے دوران اتنا سختی سے پیش آنے کی کیا

ضرورت تھی اور گرفتار کیے گئے لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کیوں کی گئی''؟

ملک کی قومی سطح کی اردو صحافت میں احمدیوں کے خلاف ایک منظّم مہم کا سلسلہ جاری رہا۔ اِس اقلیتی برادری کے خلاف ملک بھر میں نفرت انگیز مواد تقسیم کیا جاتا رہا۔ عالمی ختم نبوت کانفرنس (نبوت کا اتمام) کے منتظمین نے احمدیوں کے خلاف زہر اگلنے اور سادہ لوح لوگوں کو احمدیوں کے خلاف تشدد پر اُکسانے کے لیے ربوہ میں عوامی ریلیاں نکالیں اور ان کی اشتعال انگیز تقاریر اور بیانات کو اردو اخبارات میں نمایاں کوریج دی گئی۔

اس تنظیم کو تو ربوہ میں ریلیاں نکالنے اور سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کرنے کی آزادی حاصل ہے مگر احمدیوں کو وہاں اپنے مذہبی اجتماع منعقد کرنے کی اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ بعض اطلاعات کے مطابق، انہیں کھیلوں کے پروگرام منعقد کرنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔

اردو زبان کے ایک نمایاں روزنامہ میں دنیا بھر میں احمدیت کے پھیلاؤ کی روک تھام کے لیے عطیات کی اپیل کا ایک اشتہار شائع ہوا، مگر اخبارات نے جماعت احمدیہ کے وہ اشتہارات بھی شائع کرنے سے انکار کر دیا جن میں انہوں نے انتخابی عمل میں حصہ نہ لینے کی وجوہ بیان کی تھیں۔

بلال منور نامی شہری نے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ لاہور میں شکایت دائر کی کہ بعض افراد کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے ''تجسس کو مطمئن'' کرنے کے لیے جماعت احمدیہ کی کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہے تو اُنہوں نے اسے قتل کی دھمکیاں دیں۔

مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک جیسے 'حساس' معاملات پر بولنا کچھ برسوں سے پُرخطر کام بن چکا ہے اور اِس حقیقت کی نشاندہی سلمان تاثیر اور انسانی حقوق کے کارکن خرم ذکی سمیت بعض ممتاز شخصیات کے قتل سے بھی ہوئی ہے۔ پیمرا نے حمزہ علی عباسی کے ٹاک شو پر پابندی عائد کی۔ پابندی کی وجہ یہ تھی کہ ٹاک شو میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی دوسری آئینی ترمیم کی منطق پر سوال اٹھایا گیا تھا۔ حمزہ عباسی نے علما سے صرف یہ پوچھا تھا: کیا مذہب ریاست کو کسی کو بھی غیر مسلم قرار دینے کی اجازت دیتا ہے؟ حمزہ عباسی فیس بک پر انتہائی مقبول پاکستانی شخصیت ہے جس کے مداحوں کی تعداد تقریباً 40 لاکھ (4 ملین) ہے۔

تنازعہ اُس وقت مزید شدت اختیار کر گیا جب اینکر پرسن شبیر ابو طالب نے مولانا کوکب نورانی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے لوگوں کو حمزہ کے خلاف تشدد کی ترغیب دی۔ پھر پیمرا

کی طرف سے عجیب وغریب حکم نامہ صادر ہوا۔ پیمرا نے حمزہ اور شبیر دونوں پر پابندی لگادی۔ شبیر پر پابندی کا جواز تو نظر آتا ہے کیونکہ اُنہوں نے لوگوں کو ایک فرد پر تشدد کے لیے اکسایا تھا مگر حمزہ پر پابندی سمجھ سے باہر ہے۔ اُن پر پابندی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُنہوں نے ایک حساس موضوع پر بحث شروع کی تھی اور وہ بھی علماء کے ساتھ۔

30 اپریل کو پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کی ایک ریلی میں پارٹی کے سینئر رہنما اور سابق وزیر اعظم پاکستان راجہ پرویز اشرف نے پی پی پی کے سربراہ بلاول بھٹو زرداری کی موجودگی میں بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ پارٹی نے کس طرح 'قادیانیوں (احمدیوں کے لیے تضحیک کے طور پر استعمال ہونے والا لفظ) کی گردن توڑی تھی۔ بعدازاں سوشل میڈیا پر ہونے والی تنقید کے بعد بلاول نے ٹویٹ کیا: ''سیاستدانوں کو لوگوں کے عقیدے پر تبصرہ یا سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عقیدے کو سیاست زدہ کرنے کے خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

پاکستان رؤیت ہلال (چاند کو دیکھنے والی) کمیٹی کے سربراہ مفتی منیب الرحمان نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ قانون سازی کر کے ختم نبوت کو نہ ماننے والوں کے لیے سزائے موت لاگو کی جائے۔ اُنہوں نے یہ مطالبہ 26 ستمبر 2016 کو لالیاں میں ختم نبوت کی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا۔ لالیاں، ربوہ سے چند میل کی مسافت پر واقع ہے جو پاکستانی احمدیوں کی سب سے بڑی تعداد کا مسکن ہے۔

احمدی عقیدے کے مواد کو نیشنل ایکشن پلان (نیپ) کے تحت نفرت انگیز قرار دے کر اُس پر پابندی لگائی گئی۔ پابندی کے بعد انسداد دہشت گردی کی ایک ٹیم نے ربوہ میں 80 سالہ عبدالشکور کو گرفتار کیا۔ اُنہیں انسداد دہشت گردی عدالت میں سماعت کے بعد 8 برس کی سزا سنائی گئی۔ تاہم مولانا یوسف لدھیانوی کی تحریر کردہ 'تحفۂ قادیانیت' کی فروخت بدستور جاری ہے جس میں مصنف نے قارئین سے کہا ہے کہ روئے زمین پر کسی ایک قادیانی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔

22 جون کو میرپور خاص میں جماعت احمدیہ کی ایک تربیتی ورکشاپ منعقد ہوئی جو کہ صرف اُن کے عقیدے کے افراد کے لیے مخصوص تھی۔ تاہم دو اور افراد بھی چھپ کر اُس میں شریک ہو گئے۔ اگلے دن انہوں نے ایک مقامی مولوی کے ذریعے ورکشاپ کے پانچ شرکاء کے خلاف دفعہ 298- سی کے تحت مقدمہ درج کروا دیا۔ پولیس نے مسعود احمد چانڈیو اور عبدالرزاق کو گرفتار کر لیا اور عدالت نے اُنہیں اپنے مسلمان ساتھیوں کو السلام وعلیکم کہنے کے جرم میں

بالترتیب تین برس اورایک ماہ قیدسزا سنائی۔

7 ستمبر 1974 کو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ 7 ستمبر 2016 کو اُس دن کی مناسبت سے معروف اردو اخبارات میں احمدیوں کے خلاف نفرت انگیز مواد کی بہتات تھی۔ کئی مذہبی تنظیموں نے احمدیوں کے لیے مزید سزاؤں کا مطالبہ کیا جن میں انہیں سرکاری عہدوں سے ہٹانے، ٹی وی پر اُن کے بولنے پر پابندی اور اُن کی سزاؤں کو مزید سخت کرنے جیسی سزائیں بھی شامل تھیں۔

ایچ آر سی پی نے سکیورٹی پر مامور افراد اور مذہبی جنونیوں، دونوں عناصر کی طرف سے احمدی شہریوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر تشویش کا اظہار کیا۔ ذرائع ابلاغ کو جاری ہونے والے ایک بیان میں، کمیشن نے ریاست کے مظالم اور ایذا رسانی کے واقعات کی مکمل تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مسیحی

پاکستان میں اس سال بھی مسیحیوں کے خلاف تشدد کے کئی واقعات پیش آئے۔ اُن کے خلاف بعض قوانین کا ناجائز استعمال بھی کیا گیا۔ ان قوانین کے استعمال کا اصل مقصد ذاتی تنازعات سے نبٹنا تھا۔

سال 2016 کا آغاز گرجا گھروں اور مسیحیوں پر حملوں سے ہوا؛ پہلے دو ہفتوں میں پانچ واقعات رپورٹ ہوئے۔

3 جنوری کو، پسرور کے گاؤں نواں پنڈ میں ایک مسلمان نوجوان نے مسیحیوں کی نئے سال کی دعائیہ تقریب میں بدنظمی پیدا کی۔ مقامی پولیس کے ایک افسر نے بتایا کہ گاؤں کی پنچائیت نے معاملہ رفع دفع کروادیا تھا۔

7 جنوری کو، ملتان روڈ لاہور پر گاؤں باٹھ میں واقع نیو اپوسٹولک چرچ کو نئے سال کی تقریب کے دوران مبینہ طور پر آگ لگا دی گئی۔ اُسی دن، مذکورہ وقوعے کو پانچ گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ 80 کلومیٹر دور، گاؤں ساندہ پھاٹک میں واقع وکٹری چرچ میں ایک شخص بائبل کی نقول اور دیگر مذہبی کتابیں جلاتے ہوئے پکڑا گیا۔ یہ گاؤں اس قصبے کے نزدیک واقع ہے جہاں 4 نومبر 2014 کو ایک ہجوم نے توہین مذہب کے الزام پر ایک مسیحی جوڑے کو جلا کر مار ڈالا تھا۔

14 جنوری کو ’کیلا سک‘ گوجرانوالہ میں پولیس کی تحویل میں ایک مسیحی کی موت واقع ہوئی۔ اُسی دن، سیالکوٹ میں ایک خاکروب نذیر مسیح کو اُس وقت فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا جب وہ سڑکوں کی صفائی کر رہا تھا۔

پولیس ریسپانس یونٹ کا ایک ہیڈ کانسٹیبل فضیلہ کالونی، شادمان، لاہور میں واقع یونائیٹڈ چرچ میں جوتوں سمیت گھس گیا اور اتوار کی دعائیہ تقریب میں بد نظمی پیدا کی۔ اُس کے اِس اقدام کی وجہ یہ تھی کہ اُسے شکایت موصول ہوئی تھی کہ دعائیہ تقریب کے لیے گرجا گھر کے بیرونی اسپیکر استعمال ہو رہے ہیں۔ جب پادری نے اُسے بتایا کہ صرف اندرونی اسپیکر استعمال ہو رہے ہیں تو اُس نے انہیں تھپڑ مارا۔ مسیحیوں نے اس واقعہ کے خلاف فیروز پور روڈ، لاہور پر احتجاج کیا۔

دو موٹر سائیکل سواروں نے ڈھپ سڑی، سانده، لاہور میں ایک گرجا گھر پر فائرنگ کر کے اُس کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ کسی شخص کو کوئی جانی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر فائرنگ سے مسیحی برادری میں دہشت پھیل گئی۔

مارچ میں، گلشن اقبال پارک لاہور میں ہونے والے ایک خودکش بم دھماکے کے نتیجے میں کم از کم 72 افراد ہلاک جبکہ 300 زخمی ہوئے۔ زوردار دھماکہ پارک کے انتہائی پُر ہجوم مقام پر ہوا تھا جہاں پر جھولے، ٹرین اور بچوں کی دلچسپی کی دیگر چیزیں تھیں۔ دھماکے کے وقت وہاں موجود لوگوں کا کہنا تھا کہ اُس ہجوم میں بہت سے مسیحی خاندان بھی شامل تھے جو وہاں ایسٹر کی خوشیاں منانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ تحریک طالبان پاکستان کے ایک الگ ہونے والے دھڑے جماعت الاحرار نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ لاہور کے مضافاتی علاقے یوحنا آباد میں 2015 میں ایک ساتھ ہونے والے دو بم دھماکوں کی ذمہ داری بھی اسی گروپ نے قبول کی تھی۔ اُن بم دھماکوں میں کم از کم 25 زندگیاں ضائع ہوئیں اور بعدازاں ملک بھر میں پُر تشدد احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ وزیرِ اعظم نواز شریف نے بم دھماکے کی مذمت کی تھی۔ نواز شریف نے اپنے ایک بیان میں کہا اس حملے میں ’’میرے بچوں، بھائیوں اور بہنوں کو نشانہ بنایا گیا ہے‘‘۔ ویٹیکن نے بھی حملے کی مذمت کی تھی اور اِسے ’’مسیحی اقلیت پر بہیمانہ تشدد‘‘ قرار دیا جبکہ اقوام متحدہ (یو این) کے سیکرٹری جنرل بانکی مون نے اسلام آباد سے مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔

راہباؤں نے لاہور کے پارک میں تباہ کن خودکش بم دھماکے کے متاثرین سے اظہار یکجہتی کے لیے شمعیں روشن کیں

مئی 2016 میں، منڈی بہاؤالدین پولیس نے چک نمبر 144 میں مسیحی برادری کے تحفظ کے لیے پولیس کا دستہ تعینات کیا کیونکہ وہاں ہجوم نے اُن کے گھروں کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اُس ہجوم کا دعویٰ تھا کہ مسیحی برادری نے عمران مسیح کو اُن کے حوالے نہیں کیا جس پر اُس کے ساتھ کام کرنے والے بعض لوگوں نے موبائل فون پر تضحیک مذہب کی وِیڈیو دیکھنے کا الزام عائد کیا تھا۔ عمران کو اُن لوگوں نے مارا پیٹا بھی تھا اور اس کا فون توڑ دیا تھا۔ جب یونین کونسل کے وائس چیئرمین نے عمران کے والد کو کہا کہ وہ تین روز کے اندر عمران کو اُن کے حوالے کریں تو وہ اور اُس کا خاندان علاقے سے فرار ہو گئے۔

پولیس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ عمران پر الزام لگانے والوں میں سے کسی نے بھی وِیڈیو نہیں دیکھی تھی۔ ساتھ والی پولیس چوکی کے انچارج، اسسٹنٹ سب انسپکٹر (اے ایس آئی) محمد نواز نے کہا کہ ''اُن میں سے ہر ایک نے شہادت دینے کی ذمہ داری (عمران کے خلاف الزامات کی شہادت) دوسروں پر ڈالی۔'' بعدازاں نتیجہ یہ نکلا کہ الزامات بے بنیاد تھے۔

جون میں، پھیری لگا کر آئس کریم بیچنے والے خلیل مسیح کو تقریباً 20 لوگوں کے ہجوم نے مارا پیٹا اور اُس کی بائیسکل توڑ دی اور آئس کریم ضائع کر دی۔ خلیل مسیح کے بقول، اُس کے ساتھ یہ سلوک مسلمان خواتین اور بچوں کو آئس کریم بیچنے کی پاداش میں کیا گیا۔ اُس نے بتایا کہ مقامی پولیس نے بے دلی کے ساتھ اُس کی شکایت درج کی اور یہاں تک کہ علاقے کے بااثر

مسلمان رہنماؤں نے بھی اُس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ وقوعے پر خاموش رہے اور اپنی شکایت واپس لے۔

19 اکتوبر کو، ضلع شیخوپورہ کے علاقے فاروق آباد میں تقریباً 50 افراد نے جائیداد کے تنازعے پر پادری مائیکل رابرٹ کے گھر پر حملہ کیا اور پورے خاندان پر تشدد کیا۔ پادری کو دھمکیاں دی گئیں کہ اگر اُس نے اپنا گھر خالی نہ کیا تو اُسے توہین مذہب کے مقدمے میں ملوث کیا جائے گا۔

2016 میں توہین مذہب کے 15 ملزموں میں سے 5 مسیحی تھے اور اُن پانچ میں سے چار پر سوشل میڈیا پر توہین مذہب کا مواد دیکھنے، پوسٹ کرنے، پسند کرنے یا شیئر کرنے کا الزام عائد تھا۔

28 جون کو، گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے انجم ناز سندھو اور جاوید ناز کو توہین رسالت کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی۔ گوجرانوالہ میں ایک اسکول کے مالک انجم نے جاوید کو میٹرک کے امتحان کے پرچے افشاء کرنے پر اسکول سے نکال دیا تھا۔ بعدازاں، جاوید نے سندھو کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا اور یہ کہہ کر بھتہ مانگا کہ انہوں نے اسکول میں سندھو کے ایک خطاب کی ریکارڈنگ کر رکھی ہے جس میں اُس نے توہین مذہب والی باتیں کی تھیں۔ سندھو نے اُنہیں بھتے کے طور پر 20,000 روپے دیے مگر جب اُنہوں نے مزید رقم کا تقاضہ کیا تو اُس نے پولیس سے رابطہ کیا جس نے ناز اور اُس کے ساتھی جعفر علی کو بھتہ لینے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ناز اور علی نے پولیس کو بتایا کہ اُن کے پاس سندھو کی جانب سے توہین رسالت کے ارتکاب کی شہادت ہے جو کہ پولیس نے ناز کے گھر سے حاصل کی اور پھر ریاست کی مدعیت میں سندھو کے خلاف توہینِ رسالت کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ بالآخر انجم سندھو اور جاوید ناز کی مدعیت میں بالترتیب توہین رسالت کرنے اور اُسے اپنے فون پر ریکارڈ کرنے جبکہ جعفر علی پر بھتہ طلب کرنے کا مقدمہ درج کیا گیا۔ بعد میں تینوں کو سزائے موت سنائی گئی۔

سزائے موت کی قیدی، آسیہ بی بی کی اپیل مؤخر کر دی گئی کیونکہ بنچ میں شامل ایک جج نے مقدمے کی سماعت سے انکار کر دیا تھا۔ جج نے آسیہ بی بی کے مقدمے میں مفاد کے تصادم (Conflict of Interest) کو وجہ قرار دیتے ہوئے خود کو آسیہ بی بی کے مقدمے کی سماعت سے الگ کیا۔ فساد کی صورت حال پر کنٹرول پانے والے سینکڑوں پولیس اہلکاروں کو عدالتِ عظمیٰ

کی عمارت کے اردگرد تعینات کیا گیا تھا۔ 2015 میں عدالتِ عظمیٰ نے آسیہ بی بی کی اپیل کی درخواست منظور کرتے ہوئے اُس کی سزائے موت معطل کر دی تھی۔ سماعت کی نئی تاریخ ابھی مقرر نہیں ہوئی تھی۔ وہ توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت پانے والی پہلی خاتون ہے۔ پانچ بچوں کی ماں پہلے ہی سات برس جیل میں گزار چکی ہے جبکہ مقدمے کو خوف و ہراس کی فضا نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ لال مسجد کے بنیاد پرست مولویوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر اُسے رہا کیا گیا تو وہ سڑکوں کا رُخ کریں گے۔ تاہم تشدد کے خطرے میں اُس وقت خاطر خواہ کمی آئی جب تین ججوں پر مشتمل بنچ کے ایک جج جسٹس حمید الرحمٰن نے خود کو مقدمے سے الگ کر لیا۔

اُنہوں نے عدالت کو بتایا، ''میں سلمان تاثیر والے مقدمے کی سماعت کرنے والے بنچ کا حصہ تھا اور یہ مقدمہ اُس سے متعلقہ ہے۔'' ترقی پسند صوبائی گورنر سلمان کو 2011 میں اسلام آباد میں گولیاں مار کر قتل کیا گیا کیونکہ اُنہوں نے آسیہ کی حمایت میں آواز اٹھائی تھی۔ اُن کے قاتل ممتاز قادری کو 29 فروری کو پھانسی دی گئی جس پر بنیاد پرستوں نے آسیہ کی پھانسی کے مطالبے کے لیے سڑکوں کا رُخ کیا۔ انسانی حقوق کے گروہوں کی شکایت ہے کہ اِس متنازعہ قانون کا استعمال ذاتی تنازعات کے تصفیے کے لیے کیا جاتا ہے، اور اس کا زیادہ تر ناجائز استعمال مسیحیوں کے خلاف ہوتا ہے۔ پاکستان کے توہین مذہب قانون کے نفاذ پر کئی وجوہ کی بناء پر تنقید کی جا رہی ہے۔ 2015 میں، عدالتِ عظمیٰ نے کہا کہ توہین مذہب قوانین کے غلط استعمال کے خلاف حفاظتی انتظامات کی عدم موجودگی میں توہین مذہب کے ملزموں کو ''بہت زیادہ یا ناقابل تلافی تکلیف'' اٹھانا پڑتی ہے۔ حقوق کی تنظیموں نے آسیہ کی اپیل کی سماعت کی تاخیر پر افسوس کا اظہار کیا کیونکہ اسے پہلے ہی سکیورٹی وجوہات کے باعث قید تنہائی میں رکھا جا رہا تھا۔

ہندو

پاکستان میں ہندو برادری، جن کی اکثریت سندھ میں مقیم ہے، کو زمین ہتھیانے، حملوں اور اغواء کاریوں کے واقعات کا سامنا ہے، جبکہ سڑ کنڈ، گھوٹکی اور ننگر پارکر سے اُن کے مذہب کی جبری تبدیلی، مندروں کی بے حرمتی، جنسی تشدد اور قتل کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ ہندو نوجوانوں کی شکایت تھی کہ تعلیم اور روزگار کے مواقع میں اُن کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔

21 جنوری کو، کراچی چڑیا گھر کے نزدیک واقع کوارٹرز میں ایک متوسط طبقے کے ہندو خاندان کے چھوٹے سے گھر میں واقع رشتالا ماتا مندر میں دورگا پوجا کی تقریب جاری تھی کہ تین

مسلح افراد نے مندر پر دھاوا بولا اور تمام افراد کو مندر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ واقعے میں ہونے والے جھگڑے میں دیوی بھوانی ماتا کے مجسمے کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ عباس ٹاؤن، کراچی میں الکوحل کی ایک دوکان پر بلا اشتعال فائرنگ کے نتیجے میں تین افراد ہلاک ہوئے جن میں دو ہندو شامل تھے۔

80 برس سے زائد عمر کے ہندو شخص، گوکھل داس کو سندھ کے دور افتادہ گاؤں حیات پتافی میں رمضان کے دوران کھانے کی پاداش میں دو پولیس اہلکاروں نے مارا پیٹا، اِس عمر اور صحت کے حامل مسلمانوں کے لیے بھی روزے کا حکم نہیں ہے۔ داس کی تصویر کو جس پر زخموں کے نشان نمایاں تھے، سوشل میڈیا پر بہت زیادہ تشہیر ملی اور اس بوڑھے آدمی کے لیے انصاف کی مہم نے سندھ پولیس کے سربراہ کو داس پر تشدد کرنے والے پولیس اہلکاروں کی گرفتاری کا حکم صادر کرنے پر مجبور کیا۔

26 جولائی کو گھوٹکی میں امر لعل نامی ہندو کے خلاف توہین مذہب کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق ایک مقامی مسلمان نے اُسے قرآن کی بے حرمتی کرتے ہوئے پکڑا تھا۔ وقوعے کے بعد، میر پور ماتھیلو میں مقامی مسلمانوں نے اپنی دوکانیں بند کر دیں اور ضلع میں کاروبارِ زندگی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ مظاہرین نے قومی شاہراہ بند کر دی اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا اور جب ہجوم نے انتشار پھیلایا اور دو ہندوؤں کو گولیاں ماریں جن میں سے ایک ہلاک ہو گیا تو ہندوؤں نے اپنی زندگیاں بچانے کے لیے خود کو اپنے گھروں میں محصور کر لیا۔ لعل کو گرفتار کر لیا گیا

حیات پتافی میں پولیس اہلکاروں نے ایک عمر رسیدہ ہندو کو تشدد کا نشانہ بنایا

اور اُس کی ذہنی صحت کے معائنے کے لیے ایک طبی بورڈ قائم کیا گیا۔

57 برس کی ناقابل عذر تاخیر کے بعد، کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) نے اسلام آباد میں ہندوؤں کے لیے ایک مندر اور شمشان کے لیے اراضی مختص کی۔ اسلام آباد میں تقریباً 800 ہندو مقیم ہیں مگر وہاں ان کی عبادت کے لیے کوئی مندر نہیں اور نہ ہی کوئی شمشان گھاٹ ہے۔ وہ اپنے مُردوں کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے سندھ جانے پر مجبور رہیں جو کہ گرمیوں کے سخت موسم میں اُن کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ 17 فروری کو سینیٹ کے اجلاس میں اس مسئلے کو اجاگر کیا گیا اور بالآخر اس کا حل ڈھونڈا گیا۔

کیلاش

کیلاش قبیلے کے لوگ صدیوں سے اپنے قدیم مذہب اور رسومات پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تقریباً 3,000 افراد کی یہ چھوٹی سی پرامن برادری اپنے اسلام سے پہلے والے مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ ماضی میں اُن کے مذہب کی جبری تبدیلی کی اطلاعات منظر عام پر آتی رہتی تھیں مگر بعدازاں یہ سلسلہ رُک گیا تھا۔ تاہم دور افتادہ وادی کیلاش سے ایک مرتبہ پھر ایسی اطلاعات میڈیا پر سامنے آئیں۔ مسلمانوں نے کیلاش کے لوگوں کے گھروں پر اُس وقت حملہ کیا جب ایک کمسن لڑکی نے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق 14 سالہ کیلاش لڑکی نے اسلام قبول کر کے مسلمان خاندان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد میں وہ اپنے گھر لوٹ گئی اور شکایت کی کہ اُس کا مذہب زبردستی تبدیل کیا گیا تھا۔ اِس سے علاقے کے مسلمان غصے میں آ گئے اور اُنھوں نے کیلاش گھروں پر دھاوا بول دیا۔ حکام نے مداخلت کی اور دونوں فریقین نے لڑکی کی مرضی قبول کرنے کی حامی بھری۔ رینا نے عدالت میں بیان دیا کہ اُس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا تھا۔

ہندو میرج ایکٹ

سندھ اسمبلی نے فروری 2016 میں ہندو میرج بل منظور کیا تاکہ ہندوؤں، سکھوں اور زرتشتیوں کو بھی اپنی شادی رجسٹر کروانے کا حق مل سکے۔ 33 لاکھ افراد پر مشتمل ہندو آبادی جو کہ پاکستان کی دوسری بڑی مذہبی اقلیتی ہے، پاکستان میں گزشتہ 69 برسوں سے شادی کے قانونی اندراج کے حق سے محروم تھی۔ اس قانون سے پہلے، ہندوؤں کے پاس اپنی ازدواجی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی قانونی دستاویز نہیں تھیں اور اُنہیں اپنی شادی کو ثابت کرنے

کے لیے مقامی پنچائیت سے سٹرٹیفکیٹ لینا پڑتا تھا اور وہ کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ (سی این آئی سی) لینے کے لیے نادرا کو یہ سٹرٹیفکیٹ جمع کرواتے تھے اور خاوند کے خاندانی نام سے جاری ہونے والا شناختی کارڈ دیگر تمام درخواستوں کے کام آتا تھا۔

اسی سے ملتا جلتا بل پنجاب اسمبلی میں زیر التوا ہے جبکہ قومی اسمبلی سے اس قسم کا ایک بل پہلے ہی منظور ہو چکا ہے۔ بل کی دفعہ 2 متنازعہ ہے جس کے مطابق اگر میاں بیوی میں کوئی ایک مذہب تبدیل کرلے تو اُن کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ خدشہ ہے کہ شادی شدہ خواتین کا مذہب جبراً تبدیل کرنے کے لیے اِس دفعہ کا ناجائز استعمال کیا جائے گا جیسا کہ کمسن لڑکیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اِس قانون کے ذریعے اقلیتوں کو مستند قانونی درجہ دینے اور اُن کی زندگیاں سہل بنانے پر ملکی و عالمی سطح پر اس قانون کی منظوری کو قابل ستائش قرار دیا گیا۔

مذہب کی جبری تبدیلی

نوجوان ہندو لڑکیوں کے مذہب کی جبری تبدیلی اور مسلمان مردوں کے ساتھ اُن کی زبردستی شادی کا معاملہ، بالعموم پورے ملک کے ہندوؤں جبکہ خصوصاً سندھ کی ہندو برادری کے لیے انتہائی تشویش کا موجب بنا رہا ہے۔ اس طرح کی بہت زیادہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ اقلیتی برادری کی 12 سے 25 برس کی لڑکیوں کو اغوا کیا جاتا ہے، مارا، پیٹا جاتا ہے، دھمکایا جاتا ہے، اُن سے زبردستی اسلام قبول کروا کر مسلمان مردوں کے ساتھ اُن کی شادی کر دی جاتی ہے۔ جب متاثرہ خاندان پولیس کو ان اغواء کاریوں کی رپورٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پولیس عموماً ایف آئی آر درج کرنے سے گریز کرتی ہے اور اگر ایف آئی آر درج ہو جائے تو اغواء کار عموماً لڑکی کے ایما پر ایک جوابی ایف آئی آر درج کروا دیتے ہیں جس میں لڑکی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے آئی تھی، اسلام قبول کیا تھا اور اپنی خوشی سے شادی کی تھی۔ مزید برآں، وہ متاثرہ خاندان پر لڑکی کو ہراساں کرنے اور اس پر اپنا سابقہ مذہب قبول کرنے کا دباؤ ڈالنے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ مقدمے کی تحقیقات جاری ہوتی ہیں جبکہ اُس دوران لڑکی اغواء کاروں کی تحویل میں ہوتی ہے جو اُس کی ذہن سازی کرتے اور اُسے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ لڑکی اُن کے اثر میں آ چکی ہے تو وہ اُسے عدالت میں پیش کرتے ہیں جہاں وہ بیان دیتی ہے کہ اُس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا تھا اور یہ کہ اُس کا خاندان اُس پر دوبارہ

اپنا سابقہ مذہب قبول کرنے پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ چنانچہ مقدمے کی کارروائی رُک جاتی ہے اور لڑکی واپس اپنے اغواء کاروں کے پاس چلی جاتی ہے۔

ایک گونگی اور بہری لڑکی عاصمہ مسیح کو اُس کے ہمسائے غلام حسین نے اغوا کیا جس نے بعد میں اُسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ وہ اگست 2016 میں کسی طرح اپنے گھر واپس لوٹنے میں کامیاب ہوئی۔ حسین کو جب معلوم ہوا کہ عاصمہ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے تو اُس نے موت کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ مسلمان مولوی اُس کی حمایت کر رہے تھے جنہوں نے فتویٰ دیا کہ عائشہ (اسلام قبول کرنے کے بعد عاصمہ کا نام) اپنے مسیحی خاندان کے ساتھ نہیں رہ سکتی کیونکہ وہ اب مسیحی نہیں رہی۔ ان دھمکیوں کے بعد، عاصمہ کے والد گلزار مسیح نے مقامی پولیس سے رجوع کیا، مگر پولیس نے گلزار کی مدد کرنے کی بجائے اُس پر اپنی بیٹی غلام حسین کے حوالے کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔

عمرکوٹ میں، ایک ہندو لڑکی اغوا ہوئی۔ اُس کے خاندان نے ایف آئی آر درج کروائی۔ ایک ہفتہ بعد، مقامی پولیس نے کہا کہ لڑکی نے ایک مسلمان شخص سے اپنی رضامندی سے شادی کر لی ہے۔

سندھ حکومت نے نومبر میں اقلیتوں کے تحفظ کا ایکٹ 2015 منظور کیا۔ تاہم مذہبی گروہوں کی تنقید اور دباؤ کے بعد، حکمران جماعت پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) نے کہا کہ اس پر نظر ثانی ہو سکتی ہے۔ ہندو برادری کے لوگوں نے بل کی مخالفت پر مذہبی سیاسی جماعتوں پر تنقید کی۔ قانون نے مذہب کی تبدیلی کی کم از کم عمر 18 برس مقرر کی اور مذہب کی جبری تبدیلی کو جرم قرار دیا تھا۔ ہندو برادری کے مطابق، سندھ میں ہندو لڑکیوں کا اغوا اور زیادہ تر مذہبی مدارس کے طلبا کے ساتھ اُن کی زبردستی شادی معمول کا کام ہے اور پھر اُن لڑکیوں کے پاس خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ کمسن ہندو لڑکیوں کے اغوا اور اُن کے مذہب کی جبری تبدیلی کے واقعات بڑھ رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بل انتہائی ضروری تھا۔ تاہم، دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں بشمول اسلامی نظریاتی کونسل نے بل کو غیر آئینی و غیر اسلامی قرار دیا۔ دائیں بازو کی جماعتوں، بشمول مذہبی جماعتوں نے بل کی مخالفت کی کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ 18 برس سے کم عمر کوئی بھی فرد یہاں تک کہ اپنی رضامندی سے بھی اسلام قبول نہیں کر سکتا/سکتی۔ قانون کی دفعہ میں اس چیز کو خاص طور پر یقینی

بنایا گیا ہے کہ کسی بھی کمسن فرد پر کوئی دوسرا مذہب قبول کرنے کے لیے دباؤ نہ ڈالا جائے یا اِس مقصد کے لیے اُس کی ذہن سازی نہ کی جائے۔ بل کی مخالفت کرنے والوں کی دلیل یہ تھی کہ یہ دفعہ اسلام کی تعلیمات اور پاکستان کے آئین کے منافی ہے۔ بل کے مطابق، مذہب کی جبری تبدیلی کی کوشش کرنے والے کو سات سال قید جبکہ اس عمل میں مدد کرنے والے کو پانچ برس قید کی سزا ہوگی۔ بل میں یہ بھی درج تھا کہ ایسے بالغ افراد جو مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، اُنہیں 21 دن کے لیے دارالامان رکھا جائے گا تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ اُنہوں نے بغیر کسی دباؤ کے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے۔

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ نے اقلیتی طالب علموں کے لیے نصاب میں اسلامیات (مطالعہ اسلام) کے متبادل اخلاقیات کے نام سے ایک نئی کتاب شامل کی۔ اقلیتی طالب علم پہلے اسلامیات کا مضمون پڑھنے پر مجبور تھے۔ نئی کتاب کے مندرجات میں مسیحیت، ہندومت، سکھ مت، نیز صوفیانہ کلام سمیت کئی مذاہب کی تعلیمات شامل ہیں۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ تمام اقلیتی و اکثریتی طالب علموں کے لیے ایک ہی کتاب ہونی چاہیے جس میں تمام مذاہب کی تعلیمات شامل ہوں۔

توہینِ مذہب

اُن عناصر نے اقلیتوں کے خلاف توہین مذہب کے قانون کا ناجائز استعمال جاری رکھا جو سمجھتے تھے کہ وہ اپنے ذاتی جھگڑے نبٹانے کے لیے توہینِ مذہب کا الزام عائد کر سکتے ہیں اور اُنہیں سزا بھی نہیں بھگتنی پڑے گی۔

لاہور میں واقع ایک تحقیقی و ایڈووکیسی ادارے، 'مرکز برائے سماجی انصاف' کے مطابق، 1987 سے 2016 کے دوران، کم از کم 62 افراد کو توہینِ مذہب کے محض شک کی بنیاد پر قتل کیا جا چکا ہے۔ 1987 سے 2016 کے دوران جن 1,472 افراد پر توہینِ مذہب کا الزام عائد کیا گیا، خاص طور پر دفعہ 295-بی، 295-سی، اور 298 کے تحت، اُن میں سے 730 مسلمان، 501 احمدی، 205 مسیحی اور 26 ہندو تھے۔ دیگر افراد کے مذہب کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کسی قسم کی قانونی کارروائی شروع ہونے سے قبل ہی مارے جا چکے تھے۔

نومبر 2015 میں 'عالمی کمیشن برائے ماہرین قانون' (آئی سی جے) کی ایک تحقیق کے مطابق دفعہ 295- سی کے تحت رہا ہونے والے 25 افراد میں سے 15 افراد کو عدالتِ عالیہ

نے یہ کہہ کر بری کیا کہ اُن کے خلاف شکایات بے بنیاد اور بدنیتی پر مبنی تھیں یا ذاتی جھگڑوں کا نتیجہ تھیں۔ نو ملزمان کو تفتیش کے دوران قواعد و ضوابط کی خامیوں اور دو کو ذہنی معذوری کی بنا پر رہا کیا گیا۔

'لیگل ایڈ سوسائٹی' کراچی کی ایک تحقیق کے مطابق، توہین مذہب کے زیادہ تر مقدمات غلط الزامات پر مبنی تھے اور ان مقدمات میں توہین مذہب کا کوئی حقیقی واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ اِن کی بنیاد جائیداد کے تنازعات یا دیگر ذاتی یا خاندانی جھگڑے تھے اور اِن واقعات کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری برادری ہجوم کے تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ درج ذیل مثالیں اِن حقائق کی توثیق کرتی ہیں۔

محمود کوٹ میں ایک مسلمان اسکول ٹیچر پر اُس کے طالب علموں نے توہین مذہب کا الزام عائد کیا جس پر اسکول کے عہدیداران اور انسانی حقوق کے کارکنوں کو شدید تشویش ہوئی جن کا کہنا تھا کہ اِس قانون کو ذاتی جھگڑے نبٹانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ عربی کے ٹیچر جبریل احمد کو چھٹی جماعت کے دو بھائیوں کو بروقت سکول نہ آنے پر مبینہ طور پر پیٹنے پر 14 مئی کو جنوبی پنجاب کے ایک اسکول سے گرفتار کیا گیا۔ طالب علموں کے والدین نے ضلع مظفر گڑھ میں واقع گورنمنٹ ہائی اسکول گورمانی میں شکایت کی تھی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ "40 سالہ ٹیچر کو انکوائری کے بعد معطل کر دیا گیا تھا۔ تاہم مقامی حکام کے مطابق، اصل شکایت کے چار دن بعد، والدین نے پولیس کو شکایت کی کہ ٹیچر جبران نے توہین مذہب کا ارتکاب کیا ہے۔ اسکول کا کہنا تھا کہ پولیس کو دی گئی شکایت سے پہلے والدین نے توہین مذہب کا کسی قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ چھٹی جماعت کے طالب عالموں کے والد، بلال کی شکایت کے بعد، پولیس نے محمود کوٹ پولیس اسٹیشن میں توہین مذہب کی ایف آئی آر درج کی۔ ڈی پی او مظفر گڑھ، اویس ملک نے ذرائع ابلاغ کو بتایا: "ہم نے مقدمے کا اندراج اس کی زندگی بچانے کے لیے کیا تھا"۔

گوجرنوالہ میں انسداد دہشت گردی عدالت نے دو مسیحیوں اور ایک مسلمان (ملزم اور مدعی) کو توہین رسالت کے الزامات میں سزائے موت سنائی۔

جنوری میں عدالتِ عالیہ، لاہور نے توہین مذہب کے ایک ملزم کو بری کیا۔ ملزم غلام علی اصغر چار برسوں سے جیل میں سڑ رہا تھا۔

توہین مذہب کے ایک مقدمے میں عدالتِ عظمٰی کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے، جسٹس عباد الرحمٰن لودھی نے کہا کہ "توہین مذہب کے زیادہ تر مقدمات غلط الزامات پر مبنی تھے اور

اِن کی بنیاد توہین مذہب کے حقیقی الزامات کی بجائے جائیداد کے تنازعات یا دیگر ذاتی یا خاندانی جھگڑے پر تھی۔ اُن کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری کمیونٹی ہجوم کے تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔''

عدالت نے کہا ''2002 میں عدالتِ عالیہ لاہور نے پولیس کو توہین مذہب کے مقدمات سے نبٹنے کے لیے ہدایات دی تھیں۔ تاہم، 2011 میں درج ہونے والے ایک مقدمے میں تحقیقاتی ایجنسی نے کسی ایک ہدایت پر بھی عملدرآمد کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اِس مقدمے کی تحقیقات مؤثر اور جامع انداز میں نہیں کی گئی تھیں۔''

''توہین مذہب کے مقدمات کے اندراج میں اضافے اور اِس معاملے میں شرانگیزی کے غالب امکان کی موجودگی سے تفتیشی افسران کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔ مذہب کے بارے میں زیادہ علم نہ رکھنے والے شہریوں کے ایک طبقے کو یہ اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنے ذاتی جھگڑے نبٹانے کے لیے توہین مذہب کے قانون کا استعمال کریں۔''

تکنیکی لحاظ سے ناقص توہین مذہب قوانین کی موجودگی میں نفرت انگیز تقریر اور اقلیتوں کی ایذارسانی کے خلاف جنگ جیتنا ناممکن ہے۔

رواں برس کے دوران، ایک سکھ اور ایک ہندو نے سکھ پگڑی کی بے حرمتی کرنے اور ہندوؤں کے مذہبی نشان اوم والے جوتے فروخت کرنے کے الزام میں چند مسلمانوں کے خلاف توہین مذہب کے مقدمات درج کروائے۔ مہندر پال سنگھ کی درخواست پر، پولیس نے چھ افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا، جنہیں بعد میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ضلع ٹنڈو آدم میں پولیس نے ایک دوکاندار کو توہین مذہب کے الزامات میں گرفتار کیا کیونکہ وہ ایسے جوتے فروخت کر رہا تھا جن پر ہندوؤں کے مذہبی نشانات نقش تھے۔ اُس کا تمام سامان بھی ضبط کر لیا گیا۔

جنوری میں، ساندہ پھاٹک، قصور میں، اظہر نامی شخص کو بائبل کی نقول جلانے پر گرفتار کیا گیا۔

15 جنوری کو ضلع اوکاڑہ کے مقام حجرہ شاہ مقیم میں ایک 15 سالہ لڑکے نے اس شبے میں اپنا ہاتھ کاٹ دیا کہ اُس سے توہین رسالت سرزد ہوئی ہے۔ ایک امام مسجد نے گاؤں کی مسجد میں مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ رسول محمد ﷺ سے محبت کرنے والے نماز کی ادائیگی میں کبھی بھول چوک نہیں کرتے اور پھر اس کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ آپ میں سے کس نے نماز کی

ادائیگی چھوڑ دی ہے۔ 15 سالہ محمد انور کو سوال کی صحیح طرح سمجھ نہیں آئی تھی اور اُس نے غلط فہمی میں اپنا ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ہجوم نے فوری طور پر اُس پر توہین رسالت کا الزام عائد کر دیا۔ وہ گھر گیا اور اپنا وہ ہاتھ کاٹ دیا جو اُس نے اٹھایا تھا، کٹا ہوا ہاتھ پلیٹ میں رکھا اور اُسے مولوی کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

7 جولائی کو، گجرات میں، ندیم جیمز کو گرفتار کیا گیا۔ اُس پر الزام تھا کہ اُس نے واٹس ایپ کے ذریعے ایک مسلمان شخص کو توہین مذہب والا پیغام بھیجا تھا۔ 25 مئی کو شیخوپورہ میں عثمان لیاقت کو سوشل میڈیا پر توہین مذہب والا مواد پوسٹ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔

نبیل مسیح کو سوشل میڈیا پر کعبہ کی ایک نازیبا تصویر کو پسند کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔

گجرات میں ایک مولوی نے ایک مسیحی خاندان پر الزام لگایا کہ اُنہوں نے اس بینر پر کھانا رکھ کر کھایا جس پر محمدﷺ کا نام نقش تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ایسا کوئی نام نقش نہیں تھا اور بینر پر صرف مقامی سیاستدانوں کی تصویریں تھیں مگر مولوی بضد رہا کہ مذکورہ خاندان کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔ پھر پولیس نے اُس خاندان کو مشورہ دیا کہ اگرچہ اُنہوں نے کوئی جرم نہیں کیا مگر مولوی اور اُس کے حمائتیوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اُن سے معافی مانگیں۔

مثبت پیش رفتیں

2016 میں چند مثبت پیش رفتیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ گزشتہ برسوں کی نسبت، پولیس نے بعض واقعات میں اقلیتوں کو درپیش خطرات پر بروقت مناسب اقدامات کیئے۔ عدالتِ عالیہ، لاہور نے کرسچین طلاق ایکٹ 1869 کی ایک دفعہ بحال کی جس سے مسیحی مردوں کو اپنی بیویوں کو پُر وقار انداز میں طلاق دینے کا حق ملا۔ دفعہ 7 کو 1981 میں فوجی آمر جنرل ضیاالحق نے ایک آرڈیننس کے ذریعے ختم کر دیا تھا جس کے باعث مسیحی مردوں کے پاس زنا کاری کے الزامات کے علاوہ اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

قومی اسمبلی نے اقلیتوں کے تحفظ کا بل 2016 منظور کیا تا کہ مذہب کی جبری تبدیلی کے معاملے سے نبٹا جا سکے۔ تاہم، اِسے ابھی تک سینیٹ نے منظور نہیں کیا۔

قومی اسمبلی میں پیش ہونے والے ایک اور بل کا مقصد پاکستان کی اقلیتوں کے حقوق کا کمیشن قائم کرنا ہے۔ کمیشن ایک آزاد و بااختیار ادارہ ہوگا جو اقلیتوں کی فلاح کے لیے آزادانہ طور پر کام کرے گا اور اس کے ذریعے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خاتمہ نہیں تو اُن میں کمی

ضرور ہوگی۔

سندھ حکومت نے ہندوؤں کے رنگوں کے تہوار ’ہولی‘ پر سرکاری چھٹی کا اعلان کیا۔

24 جون کو، پی پی پی کے سربراہ بلاول بھٹو نے عمرکوٹ میں ہولی کی تقریب میں شرکت کی۔ غیر مسلموں کے لیے مساوی حقوق کی حمایت کرتے ہوئے، اُنہوں نے کہا: ’’ہندوستان کا صدر اگر ایک ہندوستانی مسلمان بن سکتا ہے تو پھر پاکستان کا صدر ایک غیر مسلم پاکستانی کیوں نہیں ہو سکتا‘‘۔ اُنہوں نے ٹویٹ بھی کیا: ’’میں اپنی زندگی میں پاکستان کا مسیحی وزیر اعظم دیکھنا چاہتا ہوں‘‘۔

وزیر اعظم نواز شریف نے قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کا نام نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر رکھا۔ کئی افراد نے اس فیصلے کو سراہا مگر اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی آئی) کے اپنے آخری صدارتی اجلاس کے دوران، مولانا محمد خان شیرانی نے قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کا نام پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر رکھنے کی تجویز کی شدید مذمت کی۔

سی آئی آئی کے اجلاس کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شیرانی نے کہا کہ شعبہ کے نام کی تبدیلی ایک اچھی مثال ثابت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا ’’ہمیں اِس کے (شعبہ فزکس) نام کی تبدیلی پر تحفظات ہیں کیونکہ یہ پہلے قابلِ احترام ڈاکٹر ریاض کے نام سے جانا جاتا تھا‘‘

معروف مسیحی رہنما دیوان بہادر ایس پی سنگھا کی پاکستان کی تشکیل میں نمایاں خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اُن کے نام سے ڈاک مہر جاری کی گئی۔

حکومتِ پاکستان نے کرسمس کے موقع پر مسیحی برادری کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے ایک خصوصی امن ٹرین چلائی۔ مسیحی برادری کی امداد کے لیے صوبہ پنجاب کے مختلف مقامات پر کرسمس بازار لگائے گئے۔

نفیس نگر، کراچی میں ایک مقامی غیر منافع بخش تنظیم (این جی او) کی اطلاع پر پولیس نے دو کمسن ہندو لڑکیوں کو زبردستی کی شادی سے بچایا۔

فرقہ وارانہ تشدد

2016 کے دوران 30 سے زائد حملوں میں، شدت پسندوں نے مختلف مسلمان فرقوں، خاص طور پر سنیوں، شیعوں بشمول ہزارہ اور بوہرا برادری کے لوگوں کو اور عبادت گاہوں

اور مزاروں کو نشانہ بنایا۔ ان حملوں میں تقریباً 110 لوگ مارے گئے اور 162 زخمی ہوئے۔ 2016 میں زیادہ تر فرقہ وارانہ ہلاکتیں خضدار، بلوچستان میں ایک مزار پر اور فاٹا میں ایک مسجد پر خودکش حملے اور کراچی میں ہونے والے ٹارگٹ حملوں میں ہوئیں۔ خضدار میں شاہ نورانی مزار پر خودکش حملے میں کم از کم 54 افراد ہلاک اور 102 زخمی ہوئے۔

16 ستمبر کو مہمند ایجنسی، فاٹا میں جمعہ کی نماز کے دوران ایک خودکش بمبار نے خود کو دھماکہ خیز مواد سے اڑایا جس کے نتیجے میں کم از کم 36 افراد ہلاک اور 37 سے زائد زخمی ہوئے۔ 30 اکتوبر کو، لندن سے تعلق رکھنے والے نیاز مہدی زیدی اور اُن کے دو بھائی اُس وقت فائرنگ کا نشانہ بن کر ہلاک ہوگئے جبکہ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں دو موٹر سائیکل سواروں نے اہل تشیع کے ایک اجتماع پر فائرنگ کی۔ حملے میں ایک خاتون سمیت دو دیگر افراد بھی ہلاک ہوئے جبکہ چھ لوگ زخمی ہوئے تھے۔ 4 نومبر کو کراچی میں 5 افراد گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہوئے۔ اہل سنت والجماعت (اے ایس ڈبلیو جے) کے ترجمان نے کہا کہ پانچوں افراد کا تعلق اُن کی تنظیم سے تھا۔

2016 کے دوران فرقہ واریت کے دیگر مرکزی مقام ڈیرہ اسماعیل خان (ڈی آئی خان)، پشاور اور کوئٹہ تھے جہاں سے تین، تین فرقہ وارانہ حملے رپورٹ ہوئے۔ جبکہ حیدر آباد، چکوال، بونیر اور بدین جیسے نسبتاً پرامن شہروں میں بھی فرقہ وارانہ حملے ہوئے جن میں اُن لوگوں کو نشانہ بنایا گیا جو آسان ہدف سمجھے جاتے ہیں۔

ہزارہ شیعہ، ذکری اور بوہرا برادری کے لوگ بھی نشانہ بننے والوں میں شامل تھے۔ 4 اکتوبر کو، کوئٹہ میں نامعلوم مسلح افراد نے ایک بس پر فائرنگ کی جس کے باعث 4 ہزارہ شیعہ خواتین ہلاک اور ایک زخمی ہوئی۔ 9 ستمبر کو، نارتھ ناظم آباد، کراچی میں بوہرا برادری سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر حاکم فیروز کو فائرنگ کرکے مارڈالا گیا جبکہ ایک شخص زخمی ہوا۔

اکتوبر میں، کیچ میں ذکری برادری کے روحانی رہنما سید مُلا اختر ملائی کو قتل کیا گیا۔ ایک کالعدم شدت پسند تنظیم نے ذمہ داری قبول کی تھی۔

یہ صورت حال غیر محفوظ سمجھے جانے والے طبقوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ریاستی ناکامی کی عکاسی کرتی ہے۔ سلامتی کے امور پر تحقیق کرنے والے ادارے 'پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز' نے کہا، ''پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد کا خطرہ اُس وقت تک موجود رہے گا جب تک فرقہ

وارانہ دہشت گرد گروہ سرگرم ہیں اور فرقہ وارانہ مدارس کی تعلیمات سمیت فرقہ وارانہ نفرت انگیز بیانیے کا سلسلہ جاری ہے۔''

سفارشات

- ☆ عقیدے کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے والے قوانین منسوخ ہونے چاہئیں۔
- ☆ ذاتی جھگڑے نبٹانے کے لیے توہین مذہب قوانین کا ناجائز استعمال بند ہونا چاہیے۔
- ☆ مذہبی اشتعال، چاہے وہ فرقوں کے درمیان ہو یا غیر مسلموں کے خلاف، اس حوالے سے سخت قوانین نافذ کیے جائیں۔ کسی بھی مذہبی کمیونٹی کی تذلیل یا مذہبی بنیادوں پر کسی شخص یا گروہ کی اشتعال انگیز ملامت کرنے والے سزا سے ہرگز نہیں بچنے چاہئیں۔ حکومت کو ایک خودمختار کمیٹی قائم کرنی چاہیے جو اسکول کے نصاب کو مذہبی تعصب والے مواد سے پاک کرے۔
- ☆ احمدیوں کو بھی مشترکہ رائے دہندگان والے نظام کا حصہ بنایا جائے تاکہ وہ بھی قومی دھارے میں مساوی شراکت کے قابل ہو سکیں۔
- ☆ جبر کے ذریعے مذہب کی تبدیلی کی کسی بھی قسم کے حالات میں اجازت نہ دی جائے۔ ہندو کونسل کی اس سفارش پر سنجیدہ غور کیا جائے کہ مذہب کی رضا کارانہ تبدیلی کرنے والے ہر شخص کے لیے بنیادی شرط ہونی چاہیے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے قبل چھ ماہ تک اسلام کا مطالعہ کرے۔

بنیادی آزادیاں

اظہار رائے کی آزادی

ہر شہری کو تقریر کرنے اور آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ پریس آزاد ہوگا۔ یہ آزادیاں ان معقول پابندیوں کے تابع ہوں گی، جو عظمت اسلام، ملک کی سالمیت یا ملکی دفاع یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات یا امن عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ یا توہین عدالت یا جرم کے ارتکاب کو روکنے، یا اس کی ترغیب کے امکانات کے پیش نظر قانون کے مطابق عائد کی جائیں گی۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل - 19]

قانون کے ذریعے عائد کردہ ضابطے اور مناسب پابندیوں کے تابع، ہر شہری کو عوامی اہمیت کے تمام معاملات کی معلومات تک رسائی کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل - 19(الف)]

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور ظاہر کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ، بغیر کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہ سکے اور جس ذریعے سے بھی چاہے، ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر خیالات و معلومات کی جستجو کر سکے، وصول کر سکے، ارسال کر سکے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل - 19]

سال 2016ء شہریوں اور صحافیوں دونوں کی آزادئ اظہار کے لیے خوفناک رہا۔ چھ صحافیوں اور ایک بلاگر کی ہلاکت اور ایک انگریزی اخبار میں سول ملٹری تعلقات کے بارے میں شائع ہونے والی ایک خبر نے نہ صرف ذرائع ابلاغ میں خوف کی فضاء کو جنم دیا بلکہ اس کے نتیجے میں میڈیا کی جانب سے خود ساختہ سنسر شپ میں بھی اضافہ ہوا۔ حزب اختلاف کی جماعتوں، سول سوسائٹی اور میڈیا کی مسلسل مخالفت کے باوجود، پارلیمنٹ کی جانب سے الیکٹرانک سائبر جرائم کی روک تھام کے بل (پیکا) 2016ء کی منظوری نے اس دباؤ میں مزید اضافہ کیا۔ اس قانون کا مقصد نہ صرف حکام پر کی جانے والی تنقید کا دائرہ محدود کرنا ہے بلکہ یہ قانون حکام کو صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور حقوق کے کارکنوں کے ذرائع ابلاغ میں غیر قانونی مداخلت کا غیر معمولی اختیار بھی دیتا ہے۔ 2016ء کے موسم خزاں میں سول سوسائٹی کے کارکنوں کو امن اور

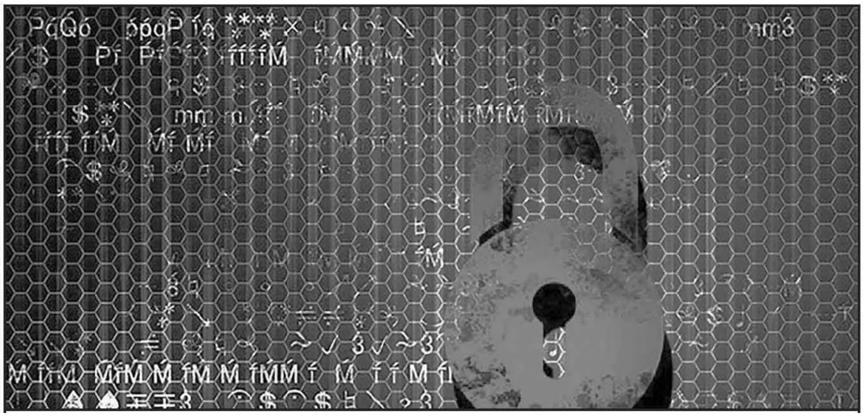

سائبر کرائم قانون نے سرکاری عہدیداروں پرتنقید پر پابندیوں کا تقاضا کیا اور حکام کو شہریوں کی آن لائن گفت وشنید کی جاسوسی کرنے کا اختیار دیا

مذاکرات کی حمایت کرنے پر سوشل میڈیا پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے معاملے پر چند قدامت پسندوں اور معلموں، دانشوروں اور ترقی پسند تبصرہ نگاروں کے درمیان تناؤ بڑھ گیا۔ سوشل میڈیا پر نامعلوم عناصر نے مصنفہ اور سیاسی و دفاعی تجزیہ نگار عائشہ صدیقہ پر سنگین الزامات لگاتے ہوئے انہیں غدار اور ہندوستانی ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس بڑھتے ہوئے تناؤ کے ماحول میں ان کی زندگی کو جسمانی تشدد کے خطرے سے دوچار کر دیا۔

ان پیش رفتوں اور اقدامات کا مقصد اعلیٰ ترین جبری حربوں اور قواعد وضوابط سے متعلق مخفی اثر کے ذریعے میڈیا کو خود ساختہ سنسر شپ پر مجبور کرنا تھا۔ پارلیمان کی جانب سے 2015ء کے شروع میں منظور کیے گئے قومی ایکشن پلان (نیپ)، جس پر عمل درآمد سال بھر جاری رہا، کے تحت فوج کی جانب سے شدت پسندی اور دہشت گردی کے خلاف نہایت وسیع کریک ڈاؤن نے میڈیا کی رپورٹنگ کے لیے مسائل پیدا کیے۔ اگرچہ نیپ کا ہدف میڈیا نہیں تھا، تاہم اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ میڈیا کی جانب سے شدت پسندی اور دہشت گردی کے خلاف کریک ڈاؤن سے متعلق مخالفانہ رپورٹنگ پر حکام صبر کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھے اور انہوں نے تنقید اور اختلاف رائے پر پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک طرف میڈیا اور اس سے منسلک لوگوں کو حکام، بشمول سکیورٹی اداروں اور پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، تو دوسری طرف اسے کالعدم جنگجو اور فرقہ وارانہ گروہوں نے بھی اپنی ان پُرتشدد کارروائیوں کی رپورٹنگ نہ کرنے پر نشانہ بنایا جن کی رپورٹنگ پر نیپ، جو کہ ''تشدد کی ستائش'' اور

نفرت انگیز تقریر' کی رپورٹنگ کی ممانعت کرتا ہے، کے تحت پابندی ہے۔

رپورٹنگ سے متعلق اس بڑھتے ہوئے امتناعی ماحول میں، پیمرا نے فوج اور سعودی عرب پر تنقید اور کالعدم تنظیموں سے متعلق رپورٹنگ پر نیوز ٹی وی چینلز کو درجنوں عام اور خصوصی نوٹس جاری کیے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اگرچہ چند کالعدم تنظیمیں عوامی مقامات میں کام کرسکتی ہیں، تاہم عوامی مقامات پر ان کالعدم تنظیموں کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کی آزادانہ رپورٹنگ نہیں کی جاسکتی۔ رپورٹنگ پر عائد اس پابندی نے کالعدم گروہوں کو مشتعل کردیا اور انہوں نے اس بنا پر میڈیا سے منسلک افراد پر متعدد حملے کیے کہ میڈیا ان کے عوامی مظاہروں کی تو کوریج کرتا ہے لیکن ان کی سرگرمیوں، مطالبات اور مقاصد کی مناسب براہ راست کوریج نہیں کرتا۔ مارچ 2016ء میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں اس وقت تشدد دیکھنے میں آیا جب ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد نے ممتاز قادری کی پھانسی، جسے 2011ء میں مبینہ توہین مذہب پر گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو قتل کرنے پر سپریم کورٹ نے سزا سنائی تھی، کے خلاف سڑکوں پر آکر احتجاج کیا۔ حکام نے فوری طور پر رازداری سے میڈیا کو ممتاز قادری کی تدفین کی کوریج یا وسیع رپورٹنگ سے روک دیا تھا۔ راولپنڈی میں ممتاز قادری کی تدفین کی کوریج کرنے والے متعدد صحافیوں پر تشدد کیا گیا اور ان کے آلات توڑ دیے گئے۔ 28 مارچ 2016ء کو ممتاز قادری کی یاد میں منعقد کی گئی ایک تقریب ایک بڑے ہجوم میں تبدیل ہوگئی جو ملحقہ شہر راولپنڈی سے اسلام آباد میں داخل ہوگیا اور اس نے پارلیمان کے سامنے کئی دنوں تک دھرنا دیا۔ اس پُرتشدد واقعے کو میڈیا کی جانب سے کم کوریج دیے جانے پر ایک مرتبہ پھر خواتین رپورٹرز سمیت متعدد صحافیوں پر تشدد ا ور انہیں ہراساں کیا گیا۔

سال 2016ء کے دوران مذہبی گروہوں کی جانب سے میڈیا ہاؤسز، ٹی وی چینلز اور اخباروں کے دفاتر پر حملوں میں بھی تشویشناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا۔ لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان، حیدرآباد، پشاور اور کراچی سمیت پاکستان کے کئی شہروں میں میڈیا کی املاک پر حملے کیے گئے اور انہیں لوٹا گیا۔ دو ٹی وی چینلز اسلام آباد میں اے آر وائی ٹی وی اور فیصل آباد میں دنیا ٹی وی کو خام بم اور کریکر کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد اور کراچی پریس کلب پر بھی حملے کیے گئے جس کے نتیجے میں حیدرآباد پریس کلب کے ایک بڑے حصے کو نقصان پہنچا اور کراچی پریس کلب میں کئی صحافی زخمی ہوئے۔

میڈیا پر حملے اور صحافیوں کی سلامتی

2016ء میں پاکستانی میڈیا کے لیے ایک اہم مسئلہ یہ رہا کہ صحافیوں کو نشانہ بنانے والوں کو سزا سے استثنا کے خاتمے کے لیے ایک مخصوص قانونی اور انتظامی طریقہ کار تشکیل نہ دیا جاسکا اور نہ ہی متاثرہ صحافیوں اور میڈیا کے ملازمین کے لیے انصاف کا انتظام و انصرام کیا جاسکا۔ حکومت، جو کہ 2014ء سے میڈیا کی سلامتی سے متعلق قانون سازی کرنے کی پابند ہے، سال کے دوران متعدد اجلاسوں کے باوجود، 2016ء میں ایک متفقہ مسودے کی تیاری کے حوالے سے فریقین کے ساتھ مشاورت کا عمل مکمل کرنے میں ناکام رہی۔ فعال صحافیوں کی تنظیموں جیسے کہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (پی ایف یو جے)، آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (اے پی این ایس) اور پاکستان براڈ کاسٹرز ایسوسی ایشن (پی بی اے)، کے نمائندوں کے ساتھ مشاورت کے چند بے ترتیب مرحلے کسی ٹھوس نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایک اہم رکاوٹ وفاقی اور صوبائی حکام، میڈیا مالکان اور صحافیوں کی انجمنوں کی جانب سے صحافیوں اور میڈیا ملازمین کو تحفظ فراہم کرنے سے متعلق ذمہ داری کی تقسیم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میڈیا کی عمارتوں کو تحفظ فراہم کرنے سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو محدود کرنا چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ میڈیا ہاؤسز صحافیوں اور میڈیا ملازمین کی مکمل سکیورٹی کا بندوبست خود کریں۔ میڈیا ہاؤسز کا خیال ہے کہ جان و مال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ وفاقی وزارت برائے اطلاعات ونشریات کی جانب سے میڈیا کی سلامتی سے متعلق مسودہ قانون کی تیاری پر مشاورت کا عمل تکلیف دہ حد تک سست روی کا شکار ہے۔

اگرچہ ملک کو 2000ء سے اب تک اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران جاں بحق ہونے والے 100 صحافیوں اور میڈیا ملازمین کے خاندانوں کو انصاف کی فراہمی کے لیے ایک طویل سفر طے کرنا ہے، تاہم 2016ء میں ایک معمولی سی کامیابی اس وقت دیکھنے کو ملی جب ایک عدالت نے خیبر پختونخوا کے شہر کرک میں صحافی ایوب خٹک کے مبینہ قاتل کو عمر قید اور پچاس لاکھ جرمانے کی سزا سنائی۔ یہ سزا 16 مارچ 2016ء کو سنائی گئی اور ایسا صرف تیسری مرتبہ ہوا ہے کہ پاکستان میں کسی صحافی کے قاتل کو قصوروار قرار دیا گیا ہو۔ تقریباً دو سال تک جاری رہنے والی سماعت کے بعد، ضلع کرک کی ضلعی و سیشن عدالت کے جج کمال شاہ نے ملزم امین اللہ کو 11 اکتوبر 2013ء کو ایوب خٹک کو قتل کرنے کا قصوروار قرار دیا۔ ایوب خٹک کرک کے ایک

اخبار کرک ٹائمز کا رپورٹر تھا۔ ایوب خٹک کے بھائی مختیار خان کی جانب سے پولیس کو درج کرائی گئیں رپورٹس کے مطابق ملزم منشیات کا کاروبار کرتا تھا اور اس نے ضلع میں ملزم کے منشیات کی سمگلنگ میں ملوث ہونے کی اطلاع دینے پر ایوب کو قتل کیا۔

پس وہ کونسی چیز تھی جس نے 2016ء میں پاکستان میں میڈیا پر نسبتاً زیادہ خود ساختہ دباؤ کی راہ ہموار کی؟ کچھ لوگ اس کا ذمہ دار نہ صرف رسمی اور غیر رسمی حکومتی کنٹرول بلکہ میڈیا کی ملکیت کے اجارہ داری پر مبنی نظام، کمزور قانونی نظام اور صحافیوں کے لیے حفاظتی بندوبست کی عدم موجودگی کو بھی ٹھہراتے ہیں۔ جنگجو گروہوں کی بڑی تعداد میں موجودگی سے صحافیوں پر دباؤ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ یا تو وہ ان کی اطاعت کریں یا پھر حکم عدولی کا خمیازہ بھگتیں۔ پاکستان میں صحافیوں کو جن خطرات کا سامنا ہے وہ کسی حد تک وہی ہیں جو دیگر شہریوں کو درپیش ہیں: امن و امان کی صورتحال اتنی خراب ہے کہ کسی بھی شخص کو ان گنت خطرات سے مکمل تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ 2014ء پاکستان میں صحافیوں کے لیے بدترین سال تھا جس کے دوران 16 صحافی ہلاک ہوئے اور 2015ء میں زیادہ تر صحافی بلوچستان میں ہلاک ہوئے جہاں علیحدگی پسندوں اور سکیورٹی اداروں کے درمیان برسوں سے جاری خونی کشمکش کے نتیجے میں قانون کی عملداری کمزور ہو چکی ہے۔

5 مارچ 2016ء کو ایچ آر سی پی نے سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قاتل کی پھانسی کے خلاف ایک ہجوم کے احتجاج کے چند دن بعد میڈیا کی تنظیموں اور صحافیوں پر ہونے والے حملوں پر شدید تشویش کا اظہار کیا۔ کمیشن نے مطالبہ کیا کہ ذرائع ابلاغ کو خوف زدہ کر کے تشدد کا پرچار اور ارتکاب کرنے والوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ اگرچہ وزیراعظم، وزیراعلیٰ پنجاب، وزیراعلیٰ سندھ اور دیگر عہدے داران کی جانب سے ان حملوں کی مذمت اور ان کا ذرائع ابلاغ کی آزادیوں کو تحفظ فراہم کرنے کا عزم قابل ستائش ہے، تاہم محض الفاظ سے پاکستانی ذرائع ابلاغ کے خوف کو کم نہیں کیا جاسکتا جو برسوں سے کئی عناصر کے حملوں کا شکار ہے۔'' لاہور اور کراچی میں ذرائع ابلاغ پر حملے دراصل اظہار رائے کی آزادی کو کچلنے کی ایک کوشش ہے۔ ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا کہ تشدد کے ذریعے میڈیا کو کچھ کہنے یا نہ کہنے کا حکم دینے والے ان عناصر نے دھاوا بولا ہو۔ ایچ آر سی پی ریاستی یا غیر ریاستی عناصر کی ہر اس کوشش کا مخالف ہے جس کا مقصد ذرائع ابلاغ کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے اسے

اثرورسوخ یا خوف کا نشانہ بنانا ہو۔ یہ حملے محض سرکاری حلقوں کی تنقید کے مستحق نہیں ہیں۔ ہم حکام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جمعہ کے روز ذرائع ابلاغ پر حملوں کی سازش کرنے اوراس پر عمل درآمد کرنے والے تمام افراد کے خلاف قانون کے تحت کارروائی کی جائے۔ ذرائع ابلاغ کو اس قسم کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے درکار اقدامات بھی ذرائع ابلاغ اور صحافیوں کی تنظیموں کی مشاورت سے کیے جائیں۔ ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی کو اپنے کام کی بدولت ان نئے خطرات کے خلاف منظم ہونے کی ضرورت ہے''۔

2016ء میں پیش آنے والے صحافیوں کے قتل، حملوں اور انہیں ہراساں کیے جانے اور میڈیا کے اداروں پر حملوں کے واقعات کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہے۔

صحافیوں اور بلاگر کی ہلاکت

☆ **15** جنوری، **2016**: خیبر پختونخوا کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعے میں ایک مقامی اخبار ڈیرہ نیوز کے رپورٹر عمر کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ حملہ آوروں کی شناخت نہیں ہو سکی۔

☆ **19** جنوری، **2016**: قبائلی علاقے میں خیبر ایجنسی کے علاقے جمرود میں ہونے والے ایک بم دھماکے میں 13 افراد ہلاک ہوئے جن میں قبائلی صحافی محبوب شاہ بھی شامل تھے۔ وہ باڑہ کی قبائلی یونین آف جرنلسٹس کے صدر تھے۔

☆ **7** مئی، **2016**: کراچی میں نامعلوم حملہ آوروں نے سابق ٹی وی صحافی اور بلاگر خرم زکی کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ انہوں نے انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ تشدد کے خلاف ایک مہم چلا رکھی تھی۔

☆ **11** مئی، **2016**: پنجاب کے ضلع لودھراں میں ایک مقامی صحافی اجمل جوئیہ کو قتل کر دیا گیا۔ اپنے قتل سے پہلے انہوں نے ایک جوڑے پر رپورٹ لکھی تھی جس نے گھر سے فرار ہو کر پسند کی شادی کی تھی۔

☆ **8** اگست، **2016**: بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں وکلاء کے ایک گروہ پر ہونے والے خودکش حملے میں 72 افراد ہلاک ہوئے جن میں ٹی وی چینل آج نیوز کے کیمرہ مین شہزاد احمد بھی شامل تھے۔

☆ **8** اگست، **2016**: بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں وکلاء کے ایک گروہ پر ہونے والے

خودکش حملے میں 72 افراد ہلاک ہوئے جن میں ٹی وی چینل ڈان نیوز کے کیمرہ مین محبوب خان بھی شامل تھے۔

☆ **26 نومبر، 2016**: پنجاب کے ضلع ساہیوال میں نامعلوم حملہ آوروں نے ساہیوال سے تعلق رکھنے والے صحافی خالد محمود بٹ اور ان کے بیٹے کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔

صحافیوں پر حملے

☆ **2 فروری، 2016**: کراچی میں پولیس، رینجرز اور پی آئی اے ملازمین کے درمیان جھڑپوں کے دوران متعدد صحافی زخمی ہوئے۔

☆ **6 فروری، 2016**: بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں ہونے والے ایک خودکش حملے میں ٹی وی صحافی بشریٰ قمر زخمی ہو گئیں۔ وہ حملے کا ہدف تو نہیں تھیں لیکن ایک عوامی تقریب میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں۔

☆ **31 مارچ، 2016**: پاک سرزمین پارٹی کی سیاسی ریلی کی کوریج کے دوران ڈی ایس این جی وین کا ڈرائیور اور دو رپورٹرز زخمی ہو گئے۔

☆ **9 اپریل، 2016**: لاہور میں پولیس اہلکاروں نے وقت نیوز کے کیمرہ مین محمد سرفراز پر اس وقت تشدد کیا جب وہ پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی کے ینگ ڈاکٹرز کے احتجاج کی فلم بندی کر رہے تھے۔

☆ **24 اپریل، 2016**: لاہور میں پاکستان تحریک انصاف کے کارکنوں نے اے آر وائی نیوز کے رپورٹر واصف محمود پر اس وقت تشدد کیا جب وہ ایک سیاسی جماعت کی ریلی کی کوریج کر رہے تھے۔

☆ **13 مئی، 2016**: بلوچستان کے سرحدی علاقے چمن میں پولیس نے وائس آف امریکا دیوا ریڈیو اور ایکسپریس نیوز چینل کے لیے کام کرنے والے ایک مقامی صحافی نعمت سرحدی پر تشدد کیا جس کے نتیجے میں انہیں چند خراشیں آئیں اور ان کے زخموں سے معمولی سا خون بھی بہتا رہا۔

☆ **19 مئی، 2016**: لاہور میں حکومت کے خلاف احتجاج کرنے والے کسانوں نے احتجاج کی کوریج نہ کرنے پر صحافیوں پر حملہ کیا۔

☆ **15 جولائی، 2016**: ضلع ہنگو میں پولیس اہلکار اور سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد قبائلی

ڈان نیوز ٹی وی چینل کے کیمرہ مین محمود خان اور آج نیوز ٹی وی چینل کے کیمرہ مین شہزاد احمد ان 72 افراد میں شامل تھے جو کوئٹہ میں وکیلوں پر ہونے والے حملے میں مارے گئے تھے

صحافی خان زمان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ دو دن بعد واپس لوٹے۔ انہیں بری طرح مارا پیٹا گیا تھا اور خبردار کیا گیا تھا کہ وہ رپورٹنگ سے باز رہیں۔

☆ **2 اگست، 2016**: پنجاب کے ضلع خوشاب میں مسلح افراد نے نامور صحافی طالب حسین بھٹی پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں ان کی ٹانگوں اور ہاتھوں پر زخم آئے۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ حملہ آوروں کو پنجاب کے ایک وزیر نے بھیجا تھا کیوں کہ انہوں نے مذکور وزیر کے بارے میں ایک رپورٹ لکھی تھی۔

☆ **17 اگست، 2016**: کراچی میں مسلح افراد نے ڈان نیوز ٹی وی کے دو ملازمین کو فائرنگ کر کے زخمی کر دیا۔ ان میں سے ایک کو گہرے زخم آئے۔

☆ **22 اگست، 2016**: متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کی جانب سے میڈیا کے اداروں پر ''جانبداری'' کا الزام لگائے جانے کے بعد پارٹی کے حامیوں نے کراچی پریس کلب اور اے آر وائی نیوز کے دفتر پر حملہ کر کے حالات حاضرہ اور خبروں کے چھ مرکزی چینلز کے دو رپورٹروں اور چار کیمرہ مینوں کو زخمی کر دیا۔

☆ **13 نومبر، 2016**: 13 نومبر 2016 کو رات 10 بجے پیراملٹری فورس رینجرز کے اہلکاروں نے حب پریس کلب کے صدر میر الیاس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔

انہوں نے وارنٹ کے بغیر تقریباً آدھے گھنٹے تک گھر کی مکمل تلاشی لی اور میر الیاس کے خاندان کو دہشت میں مبتلا کر کے، کوئی وضاحت دیے بغیر واپس چلے گئے۔

☆ **20 نومبر، 2016:** پنجاب کے شہر لاہور میں ٹی وی چینل جاگ نیوز کے رپورٹر کی موٹر سائیکل اقبال ٹاؤن کے علاقے میں پولیس وین سے ٹکرا گئی جس کے بعد پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ مشتعل پولیس اہلکاروں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں پوری رات حوالات میں رکھا۔ جاگ ٹی وی کی جانب سے ان کی گرفتاری کی خبر چلائے جانے اور ان کے خلاف دفعہ 186 کے تحت مقدمہ درج کیے جانے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔

☆ **21 نومبر، 2016:** قبائلی علاقہ جات کی کرم ایجنسی میں صحافی اور سڈا پریس کلب کے رکن انور خان اورکزئی کو پولیٹیکل انتظامیہ نے ان کے گھر سے گرفتار کر لیا اور انہیں غیر قانونی طور پر کرم میں زیر حراست رکھا۔ انور خان نے کچھ ایسی رپورٹس شائع کی تھیں جس سے پولیٹیکل انتظامیہ ناخوش تھی۔ انہیں اگلے روز تنبیہ کر کے رہا کر دیا گیا۔

☆ **23 نومبر، 2016:** راول پنڈی سے تعلق رکھنے والے مقامی ٹی وی چینل کے صحافی یاسین ہاشمی کو راول پنڈی پولیس کے سینیئر سپرنٹنڈنٹ نے سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ یاسین ہاشمی نے پولیس کی کارکردگی سے متعلق رپورٹنگ کی تھی جو ان کی نظر میں منفی تھی۔ مذکور پولیس افسر نے چند دنوں کے لیے صحافی کے دفتر میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی۔

میڈیا کے دفاتر اور اداروں اور عمارتوں پر حملے

☆ **13 جنوری، 2016:** اسلام آباد میں موٹر سائیکل سواروں نے اے آر وائے کے دفتر پر ہینڈ گرنیڈ سے حملہ کیا اور فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے جس کے نتیجے میں ایک شخص زخمی ہو گیا۔ واقعے کی ذمہ داری ''داعش افغانستان'' نے قبول کی۔

☆ **7 فروری، 2016:** لاہور میں نامعلوم مسلح افراد نے سٹی 42 ٹی وی کے دفتر پر فائرنگ کی۔

☆ **4 مارچ، 2016:** ایک ہجوم میں شامل نامعلوم حملہ آوروں نے حیدر آباد پریس کلب پر حملہ کر دیا اور وہاں لوٹ مار کی۔

☆ 4مارچ، 2016: کراچی میں سنی تحریک گروپ کے حامیوں نے سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کی تدفین کی کم کوریج پر احتجاج کرتے ہوئے آج ٹی وی کے دفتر پر حملہ کر دیا۔

☆ 4مارچ، 2016: کراچی میں مشتعل ہجوم نے ایکسپریس نیوز کی ڈی ایس این جی وین پر حملہ کیا۔

☆ 27مارچ، 2016: جمعیت طلباء اسلام (اے ٹی آئی) کے اراکین نے کراچی پریس کلب پر فائرنگ کی اور اس پر بوتل بموں سے حملہ کیا جس کے نتیجے میں ٹی وی چینل جاگ نیوز کے رپورٹر عبدالرحمان اور ان کے کیمرہ مین زخمی ہوگئے، جبکہ جاگ نیوز کی ڈی ایس این جی وین کو نقصان پہنچا۔ جاگ نیوز کے تین کیمرہ مینوں کے کیمرے بھی چھین لیے گئے۔

☆ 22 اگست، 2016: متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کی جانب سے میڈیا کے اداروں پر ''جانبداری'' کا الزام لگائے جانے کے بعد پارٹی کے حامیوں نے کراچی پریس کلب اور اے آر وائے نیوز کے دفتر پر حملہ کر کے حالات حاضرہ اور خبروں کے چھ مرکزی چینلز کے دو رپورٹروں اور چار کیمرہ مینوں کو زخمی کر دیا۔

☆ 28اگست، 2016: کراچی میں ہجوم نے 92 نیوز کے سیٹلائٹ انجینئر سمیت عملے پر اس وقت حملہ کیا جب وہ ایم کیو ایم پارٹی کے ''غیر قانونی'' دفتر کی مسماری کی کوریج کر رہے تھے۔ چینل کی رپورٹ کے مطابق ہجوم نے چینل کی ڈی ایس این جی وین کو بھی نقصان پہنچایا۔

☆ 19 ستمبر، 2016: لاہور پریس کلب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ایک کارکن نے صحافی نواز طاہر پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ پریس کلب انتظامیہ کو پولیس کو طلب کرنا پڑا جس نے حملہ آور کو گرفتار کر لیا۔

صحافیوں اور کارکنوں کو دھمکیاں دینے اور ہراساں کیے جانے کے واقعات

☆ 12 جنوری، 2016: اسلام آباد میں پنجاب رینجرز نے نیو یارک ٹائمز کے نمائندے سلمان مسعود کے گھر پر وارنٹ کے بغیر چھاپہ مارا۔

☆ 26مارچ، 2016: سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں سندھ ایکسپریس نیوز کے لیے کام

کرنے والے صحافی رحمت اللہ بھٹو کو مبینہ طور پر ایک رکن صوبائی اسمبلی کے کہنے پر دہشت گردی کے الزام میں انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ 6 کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ یہ دفعہ بھتہ خوری سے متعلق ہے۔

☆ **29 مارچ، 2016:** طالبان سے علیحدگی اختیار کرنے والے ایک گروہ، جماعت الاحرار نے لاہور میں ہونے والے ایک بم دھماکے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اسی دن میڈیا پر حملوں کی دھمکی دی۔ اس بم دھماکے میں 72 افراد ہلاک ہوئے تھے۔

☆ **8 فروری، 2016:** سندھ کے شہر کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے بلدیہ فیکٹری میں لگنے والی آگ پر ہونے والی بحث کی کوریج پر میڈیا سے وابستہ افراد کو اشاروں کنایوں میں دھمکی دی۔

☆ **14 فروری، 2016:** 'شوریٰ فدائین اسلام' نے کوئٹہ پریس کلب کے چار صحافیوں کو ''مسیحیت کی تبلیغ'' کرنے پر دھمکیاں دیں۔

☆ **24 اپریل، 2016:** تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے ریاست پاکستان کے ساتھ جنگ کا فریق ''بننے'' پر میڈیا کو خبردار کیا۔

☆ **26 اپریل، 2016:** ایکسپریس نیوز چینل کے قیصر خان کو فوجداری قوانین کی دفعات 500، 506، 384، اور 386 کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ان کی گرفتاری کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک تصویر دکھائی تھی جس میں ایک پولیس افسر کو پنجاب کے ایک اشتہاری مجرم کے ساتھ بیٹھے دکھایا گیا تھا۔

☆ **29 اپریل، 2016:** کراچی میں پولیس نے اے آر وائے نیوز کے پروگرام سرعام کے میزبان اقرار الحسن اور ان کے عملے کو اس بنا پر گرفتار کرلیا کہ انہوں نے حکام کی توجہ سندھ اسمبلی کی ناقص سکیورٹی کی جانب مبذول کرانے کے لیے ایک سٹنگ آپریشن کیا تھا۔ ان کے خلاف تھانہ آرام باغ میں دفعہ 452 (نقصان پہنچانے، حملہ کرنے یا غیر قانونی مزاحمت کی غرض سے بے جا مداخلت کرنا)، دفعہ 188 (سرکاری ملازم کی جانب سے باضابطہ طور پر جاری کیے گئے حکم کی خلاف ورزی کرنا) اور دفعہ 34 (عام ارادہ) کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔

☆ **30 اپریل، 2016:** کراچی میں نامور صحافی شعیب الحسن کو سادہ کپڑوں میں ملبوس

افراداور پولیس کی وردی میں ملبوس افراد نے ان کی رہائش گاہ سے اٹھالیا۔انہیں چھ گھنٹوں تک زیرحراست رکھنے کے بعدرہا کردیا گیا۔

- ☆ 24مئی،2016: سپریم کورٹ آف پاکستان نے پیمرا کو حکم دیا کہ وہ ٹی وی چینلز کو عدالتوں اورججوں پرتنقید سے روکے۔
- ☆ 25مئی،2016: پاکستان نے تاریخ کی سب سے بڑی آن لائن سنسرشپ کا آغاز کرتے ہوئے''فحاشی'' کی روک تھام کے نام پر چار لاکھ ویب سائٹس کو بلاک کرنے کی کوشش کی۔
- ☆ 27مئی،2016: پیمرا نے ٹی وی چینلز کو وارننگ جاری کرتے ہوئے فوج،عدلیہ اور پارلیمنٹ پرتنقید پرمکمل پابندی عائدکردی۔
- ☆ 28مئی،2016: سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات ونشریات کے ارکان نے پاکستان میں میڈیا پرمزیدسخت پابندیوں کا مطالبہ کیا۔
- ☆ 11جون،2016: بلوچ صحافی منظوراحمد کورہا کردیا گیا۔وہ7نومبر2014ءکوکوئٹہ سے لاپتا ہوئے تھے۔
- ☆ 18جون،2016: وزیرداخلہ نثارعلی نے پیمرا سے کہا کہ وہ میڈیا کو مشتبہ افراد کے بیانات نشرکرنے سے روکے۔
- ☆ 4جولائی،2016: سپریم کورٹ آف پاکستان نے پیمرا سے کہا کہ وہ''توہین عدالت'' پرنجی ٹی وی چینلز کے خلاف تعزیری کارروائی کریں۔
- ☆ یکم اگست،2016: قانون نافذکرنے والےاداروں نے کوئٹہ میں بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کےصدرحمداللہ رند کے گھرپرسرچ آپریشن کیا۔
- ☆ 11اگست،2016: قومی اسمبلی نے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ(پیکا)2015ءکی منظوری دی جو پاکستان میں انٹرنیٹ پرآزادی اوراظہار رائے کی آزادی کے لیےایک دھچکا ثابت ہوا۔
- ☆ 22اگست،2016: متحدہ قومی موومنٹ کے قائدالطاف حسین پراپنے حامیوں کو میڈیا اداروں اورصحافیوں کے خلاف تشدد پراکسانے اورریاست اورجرنیلوں کے خلاف نفرت انگیزتقریر کا الزام عائد کیے جانے کے بعدپاکستان ٹیلی کمیونی کیشن

اتھارٹی نے پارٹی کی ویب سائٹ پر پابندی عائد کرنے کا حکم دیا۔

☆ 28 اگست، 2016: پیمرا نے عمران خان کی تیسری شادی کی مبینہ ''جھوٹی خبر'' نشر کرنے پر 13 ٹی وی چینلز پر جرمانہ عائد کیا۔ ہر چینل پر 500,000 روپے جرمانہ عائد کیا گیا۔

☆ 6 ستمبر، 2016: پیمرا نے امریکا میں پاکستان کے سفیر کے بارے میں ''جھوٹی خبر نشر کرنے'' پر جیو نیوز کو نوٹس جاری کیا۔

☆ 8 ستمبر، 2016: بین الصوبائی وزارتی اجلاس میں تجویز دی گئی کہ ایف آئی اے سائبر جرائم کی تحقیقات کرے۔

☆ یکم نومبر، 2016: میڈیا تجزیہ نگار اور دانشور عائشہ صدیقہ کے بارے میں جاری ہونے والی ایک قابل مذمت ویڈیو نے ان کی سکیورٹی سے متعلق خدشات کو جنم دیا۔ اس ویڈیو میں ان پر ہندوستانی انٹیلی جنس ایجنسی را کے لیے کام کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

☆ 2 نومبر، 2016: لندن میں پاکستانی دانشوروں کے اجتماع سے متعلق جاری ہونے والی متعدد ویڈیو کلپس اور تصاویر میں ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ ہندوستان کی حمایت میں ملک کے خلاف کام کر رہے ہیں جس کے باعث ان میں سے متعدد کی سلامتی کو خطرات لاحق ہو گئے۔

میڈیا کو کنٹرول کرنے سے متعلق انضباطی پابندیاں

2016ء کے دوران قانونی محاذ پر چند پریشان کن پیش رفتیں دیکھنے میں آئیں جس کا نتیجہ نہ صرف آزادی اظہار پر مزید پابندیوں کی صورت میں نکلا بلکہ اس سے ملک میں آزادی اظہار پر منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ اس حوالے سے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ (پیکا) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا ایکٹ (پیکا)

پیکا قومی اسمبلی میں 2015ء کے موسم بہار کے دوران پیش کیا گیا۔ اس مسودہ قانون کو پاکستان میں اور بین الاقوامی سطح پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے تحت آن لائن آزادیء اظہار کو جرم قرار دیا گیا تھا، اس میں صارف کے کوائف کو ذخیرہ کرنے سے متعلق راہنما اصول شامل کیے گئے تھے، اور اس عمل میں شفافیت کا فقدان تھا۔ سول سوسائٹی اور

حزب اختلاف کی جماعتوں کی شدید مخالفت کے باوجود، اگست 2016ء میں آخر کار اسے منظور کر لیا گیا۔ 2016ء میں پورا سال اسے اس خدشے کی بنا پر منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا کہ اس سے اظہار رائے کی آزادی اور معلومات تک رسائی کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پاکستان کی سکیورٹی اور انٹیلی جنس ایجنسیاں ایک طویل عرصے سے پاکستان کے اندر شہریوں کے ذاتی کوائف تک رسائی کا مطالبہ کرتی رہی ہیں، اور یہ ان اداروں کے ساتھ سختی سے پیش آتی رہی ہیں جنہوں نے مذکور کوائف فراہم کرنے سے انکار کیا ہو۔ اس مطالبے کے نتیجے میں کینیڈا کی سمارٹ فون اور انٹر پرائز سروس کمپنی بلیک بیری کو 2015ء کے آخر میں ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا کیوں کہ اس نے پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) کو اپنی خفیہ بلیک بیری انٹر پرائز سروسز تک رسائی دینے سے انکار کیا تھا۔ میڈیا پر احتجاج کے بعد، پی ٹی اے نے وقتی طور پر یہ فیصلہ واپس لے لیا جس سے بلیک بیری کو 2016ء میں اپنا کام جاری رکھنے کا موقع ملا لیکن غیر یقینی کے بادل اب بھی افق پر موجود ہیں۔

وفاق کا معلومات تک رسائی کا قانون

وفاق کا معلومات تک رسائی کا قانون ایک اور ایسا مسئلہ ہے جو 2016ء کے شروع سے لے کر آخر تک زیر بحث رہا۔ اس قانون کا مسودہ سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات و نشریات کی ایک ذیلی کمیٹی نے تین سال سے زائد عرصہ تک غور و خوض کرنے کے بعد تیار کیا تھا۔ اسے ایک حکومتی بل کے طور پر پارلیمان میں پیش کرنے اور اسے قانون کی شکل دینے کے لیے اس پر وفاقی کابینہ کی منظوری ضروری ہے۔ بدقسمتی سے، وفاقی کابینہ کے اجلاس میں تاخیر کے باعث یہ بل ابھی تک کابینہ سے منظور نہیں کرایا جا سکا۔ اس بل کے نفاذ سے پہلے مزید تاخیر متوقع ہے۔

میڈیا کے تحفظ کا بل

صحافیوں اور میڈیا ہاؤسز کا تحفظ گزشتہ چند سالوں کے دوران پاکستان میں ایک انتہائی اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ میڈیا کے ملازمین کی جانب سے خصوصی قانون سازی کے لگاتار مطالبات بے فائدہ ثابت ہوئے۔ اس حوالے سے، سینیٹر خورشید احمد اور 21 دیگر ارکان سینیٹ نے 2011ء میں ایک پرائیویٹ ممبر بل پیش کیا تھا۔ ہاؤس بزنس ایڈوائزری کمیٹی نے اپنے 2015ء میں منعقد کردہ اجلاس میں اس بل کو قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات و نشریات کے سپرد کیا۔ کمیٹی نے ایک ذیلی کمیٹی قائم کی اور حکومت کے رکن سینیٹ مشاہد اللہ کو اس کا کنوینر مقرر کیا۔ ذیلی

کمیٹی فریقین کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی ہے تاکہ ایک جامع مسودہ قانون پر اتفاق کیا جا سکے۔ وزارت اطلاعات ونشریات کے ایک عہدیدار نے اکتوبر 2016ء میں یونیسکو کی جانب سے اسلام آباد میں منعقد کیے گئے فریقین کے اجلاس میں بتایا کہ جب تک ایک اہم فریق، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (پی ایف یو جے) سے بل کے متعلق رائے نہیں لی جاتی، حکومت اس بل کی منظوری کے لیے تیار نہیں، اور حکومت کے مطابق ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پی ایف یو جے کے تمام دھڑے متحد ہو کے انتخاب منعقد نہیں کراتے، جو کہ 2017ء سے پہلے ممکن نہیں تھے۔ دریں اثنا، صحافی اور میڈیا کے ملازمین ایک قانونی ڈھانچے کے منتظر ہیں جو صحافیوں کو نشانہ بنانے والوں کو سزا سے استثنا کا موثر طور پر مقابلہ کرنے میں ان کی مدد کرے۔

میڈیا کا مضبوط تر ضابطہ

2012ء کے بعد پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) ایک طویل عرصے سے چیئرمین کے بغیر کام کرتا رہا ہے۔ اس عرصہ کے دوران پیمرا شعبہ میڈیا کے سہولت کار کے طور پر ابھرنے میں ناکام رہا ہے جس کے باعث کئی اہم فیصلے ادھورے رہے ہیں جن میں براڈ کاسٹ کو ڈیجیٹلائز کرنا اور ڈی ٹی ایچ نظام پر منتقل ہونا شامل تھا۔ دسمبر 2015ء میں حکومت نے آخر کار ایک کل وقتی چیئرمین کا تقرر کیا۔ تاہم، ان کی تقرری کے بعد سے، پیمرا کی تقریباً ساری توجہ میڈیا اور ٹی وی چینلز کے مواد کے انتظام وانصرام کی جانب منتقل ہو چکی ہے۔ ان کی تقرری کے پہلے دس ماہ کے دوران پیمرا نے پیمرا قوانین اور ضابطہ اخلاق کی مبینہ خلاف ورزی پر ٹی وی چینلز کو درجنوں نوٹس بھیجے۔ بہت زیادہ تنقید کرنے پر متعدد چینلز پر جرمانے بھی عائد کیے گئے۔ چینلز کو حالات حاضرہ اور صحافت سے متعلق مواد کے حوالے سے خود ساختہ سنسرشپ عائد کرنے پر مجبور کرنے کے رجحان میں بھی نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا۔

الیکٹرانک میڈیا کے لیے پابندیوں کی تشکیل

حکومت نے 19 اگست 2015ء کو ملک میں الیکٹرانک میڈیا کے لیے ایک نیا ضابطہ اخلاق جاری کیا۔ اس ضابطے کا جارحانہ نفاذ 2016ء میں دیکھنے میں آیا جب پیمرا نے مواد، تبصروں، آراء اور رپورٹنگ کی بنا پر ٹی وی چینلز کے خلاف سنسرشپ کا حد سے زیادہ استعمال کیا۔ نئے ضابطے نے سابقہ ضابطہ اخلاق، جو پیمرا اضوابط 2009ء کا حصہ تھا، کی اس کے شیڈول اے کے طور پر جگہ لی۔ چونکہ نئے ضابطے کا نوٹیفکیشن اور اس کے نفاذ کے بعد اس سوال نے جنم لیا کہ آیا

میڈیا کو ایسا ضابطہ خود بنانا چاہیے یا پھر یہ ریاست کے زیر انتظام ہونا چاہیے۔ اسی طرح اس ضابطہ اخلاق کا جواز اور ملکیت بھی ایک سوالیہ نشان ہے کیوں کہ اسے حکومت نے تیار اور جاری کیا تھا اور پیمرا سے کہا تھا کہ وہ اسی کا نفاذ کرے۔ اس کے باوجود، یہ ضابطہ ملک میں آزادی اظہار کی بگڑتی صورتحال کے لیے شدید خطرے کا باعث ہے۔

یہ ضابطہ پروگراموں کی نشریات کے حوالے سے کئی بنیادی اصول فراہم کرتا ہے۔ یہ ضابطہ الیکٹرانک میڈیا کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ یہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 19 اور پیمرا قوانین سمیت دیگر قوانین میں مذکور پابندیوں کے علاوہ نئے تصورات اور نظریات کا احترام کرے۔ مثال کے طور پر یہ ضابطہ اخلاق لائسنس داروں کو ایسا کسی بھی قسم کا مواد نشر کرنے سے روکتا ہے جو ''اسلامی اقدار، نظریہ پاکستان یا قوم کے بانیوں بشمول قائداعظم (محمد علی جناح) اور ڈاکٹر علامہ اقبال کے نظریات خلاف ہو''۔ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ ''اسلامی اقدار'' میں کون سی چیزیں شامل ہیں اور قوم کے بانیوں کے نظریات کیا ہیں۔ سماجی کارکن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان مبہم اصطلاحات کے بارے میں ایک سے زیادہ نقطہ ہائے نظر ہو سکتے ہیں اور ان کی موضوعی طور پر تشریح کی جا سکتی ہے۔ اس لیے، ایسے ابہام آزدیٔ اظہار کی آئینی ضمانت کو میڈیا ضابطہ کار کی موضوعی تشریح کے تابع کر سکتے ہیں۔

ضابطہ اخلاق کے ''بنیادی اصول'' مزید کہتے ہیں کہ لائسنس دار اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ ایسا کوئی بھی مواد نشر نہ کیا جائے جو: ''آئین پاکستان کے حکم کے برخلاف ہو جمہوری نظام کے خاتمے پر اکسائے یا اس عمل کی حمایت کرے؛ پاکستان کی سلامتی، سکیورٹی اور دفاع کے خلاف ہو؛ عدلیہ یا افواج پاکستان کے خلاف الزامات پر مبنی ہو؛ اور ہتک آمیز ہو جیسا کہ فی الوقت نافذ العمل قانون میں واضح کیا گیا ہے''۔ یہ ''بنیادی اصول'' بظاہر آئین اور دیگر قوانین میں مذکور پابندیوں کے علاوہ آزادی اظہار پر مزید پابندیاں عائد کرتے ہیں اور سنسر شپ کو فروغ دیتے ہیں۔ اسی طرح، ضابطہ اخلاق کی شق نمبر 4 کی دفعات بظاہر خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں میں معروضیت، صداقت، اور حقیقت پسندی کا تقاضہ کرتی ہیں۔ اس کے باوجود، پیمرا ان دفعات کو جواز بنا کر سیاسی مباحث اور مفاد عامہ کے مقدمات سے متعلق عدالتی کارروائیوں اور فیصلوں کے تنقیدی تجزیات پر پابندی عائد کر سکتا ہے۔ یہ دفعات ملک میں فی الوقت نافذ العمل توہین عدالت کے قانون اور ہتک عزت کے قانون کے علاوہ ہیں۔

2016ء میں ٹی وی چینلز کے خلاف پیمرا کے احکامات اور کارروائیوں کے تناظر میں صورتحال زیادہ سنگین تھی۔ ان واقعات میں ، دیگر متعدد واقعات کے علاوہ، ''دوست ریاستوں'' جیسے کہ 2015ء میں مناء میں مچنے والی بھگدڑ کے معاملے میں سعودی عرب کے خلاف پروگرام نشر کرنے، یمن کے معاملے کی کوریج اور الطاف حسین کی فوٹیج نشر کرنے پر پابندی شامل تھی۔ ان میں سے زیادہ تر احکامات اس ضابطہ اخلاق کے نوٹیفکیشن سے پہلے جاری کیے گئے تھے۔ پیمرا نے ضابطہ اخلاق کے نوٹیفکیشن کے بعد، متوقع طور پر، 2016ء کے دوران متعدد ٹی وی چینلز کو ضابطہ اخلاق کی مبینہ خلاف ورزی پر کئی تنبیہات جاری کیں۔

ضابطہ اخلاق، اپنی نوعیت کے لحاظ سے، ایک قانونی دستاویز ہے۔ اب یہ پیمرا کے قانون کا حصہ ہے اور، پیمرا آرڈیننس کی دفعہ 30 کے مطابق لائسنس دار کی جانب سے پیمرا آرڈیننس، ضوابط یا ضابطے کی خلاف ورزی لائسنس کی منسوخی پر منتج ہوسکتی ہے۔ مزید برآں، پیمرا آرڈیننس کی دفعہ 33 کے تحت، اگر کوئی لائسنس دار پیمرا کے قانون کی کسی بھی دفعہ کی خلاف ورزی کرتا ہے یا اس کی ترغیب دیتا ہے تو اس پر ایک کروڑ روپے تک کا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے۔ دوبارہ خلاف ورزی کی صورت میں لائسنس دار کو تین سال قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

سنسرشپ: اختلاف رائے اور اظہار رائے کی آزادی

حکومتی اجلاس، سرکاری یادداشتیں

پاکستان میں ریاست کی جانب سے عائد کردہ سنسرشپ کا معاملہ کتنا سنگین ہو چکا ہے، اس کا ڈرامائی اظہار 2016ء میں اس وقت ہوا جب وفاقی وزیر برائے اطلاعات ونشریات سینیٹر پرویز رشید کو نواز شریف حکومت کی وفاقی کابینہ میں سے اس بنا پر برطرف کر دیا گیا کہ وہ ڈان اخبار میں صحافی سرل المیڈا کی ایک نیوز رپورٹ کی اشاعت کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ 7 اکتوبر 2016ء کو شائع ہونے والی یہ خبر اس وقت سے متنازعہ بن چکی ہے اور اس کی اشاعت کے بعد چند ایسے اقدامات دیکھنے میں آئے ہیں جو تنقید اور اختلاف رائے سے متعلق ریاست کی عدم برداشت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں المیڈا کے پاکستان چھوڑنے پر کچھ دن کے لیے پابندی عائد کرنا، وزیر اطلاعات ونشریات کی برطرفی اور لاہور ہائی کورٹ کے ایک سابق جج کی سربراہی میں تمام اہم فوجی اور سول انٹیلیجنس ایجنسیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن کا قیام شامل تھا جس کا مقصد اس بات کی تحقیقات کرنا تھا کہ پاکستان کی سکیورٹی اور خارجہ پالیسیوں کے معاملے

پر سینیئر فوجی اور سول قائدین کے درمیان پائے جانے والے مبینہ اختلاف کی خبر ''افشاء'' کیسے ہوئی۔ سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے آئی ایس پی آر کے دفتر کے ذریعے جاری کیے گئے ایک بیان میں خبر کو ''من گھڑت'' قرار دیا، لیکن یہ مطالبہ کیا کہ اس معلومات کو ''افشاء'' کرنے کے ذرائع، جس کے بارے میں اسے شک تھا کہ یہ کابینہ کے بالائی زینوں میں موجود ہیں، کو بے نقاب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔ حکومت جو کہ بہت سے لوگوں کے مطابق غیر رضامند اور دباؤ کا شکار تھی، کی جانب سے کیے گئے یہ امتیازی اقدامات یقینی طور پر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پاکستان میں سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ پر تنقید کی گنجائش بتدریج کم ہو رہی ہے۔

المیڈا کی رپورٹ میں ایک مبینہ محاذ آرائی کا ذکر کیا گیا تھا جس میں سینیئر حکومتی قائدین نے فوج کی اہم ترین قیادت کو خبردار کیا تھا کہ اگر فوج نے پُرتشدد اسلامی گروہوں کے خلاف کارروائی نہ کی تو پاکستان بین الاقوامی سطح پر تنہائی کا شکار ہو جائے گا۔

رپورٹ کے مطابق وزیر اعلیٰ نے شکایت کی کہ فوج حکومت کی طرف سے گرفتار کیے گئے شدت پسندوں کو آزاد کر دیتی ہے۔ فوجی حکام کی جانب سے دباؤ ڈالے جانے پر، ڈان کے ایڈیٹر ظفر عباس نے ڈان کے فیس بک کے ایک صفحے پر اس خبر کی حمایت میں ایک بیان جاری کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ یہ خبر ''تصدیق شدہ، نظر ثانی شدہ اور حقائق پر مبنی'' تھی۔ مذکور اخبار نے آزادانہ اور بااصول صحافت کی اعلیٰ ترین روایات کو برقرار رکھتے ہوئے معلومات کے ذرائع کو افشاء نہیں کیا۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ ''منتخب حکومت اور ریاستی اداروں کو پیغام رساں کو نشانہ بنانے اور ملک کے سب سے قابل احترام اخبار کو قربانی کا بکرا بنانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔''

11 اکتوبر 2016ء کو ایچ آر سی پی نے مطالبہ کیا کہ صحافی سرل المیڈا کے بیرون ملک سفر پر عائد تمام پابندیاں فوری طور پر ختم کی جائیں اور اگر حکام کو ان سے کوئی شکایات ہیں تو ان کا ازالہ قانون میں معین طریقہ کار اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ آزادی اظہار کے تناظر میں کیا جائے۔ ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''سرل المیڈا کو بیرون ملک سفر سے روکنا اور انتہائی معتبر اخبار ڈان کے مالکان پر دباؤ ڈالنا ملک کے اندر اور باہر ان لوگوں کے لیے تشویش کا باعث بنے گا جو آزادی رائے اور صحافیوں کے حقوق پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی صحافی برادری کو پاکستان پر تنقید کا موقع دینے کا وقت نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکام سرل کی اس رپورٹ پر بے جا ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں جس کا تعلق مشکل حالات میں صحافیوں کی ذمہ داریوں سے

ہے۔ایچ آر سی پی کا ماننا ہے کہ سول ملٹری تعلقات کا موضوع صحافیوں یا عوام سے بالاتر نہیں ہے۔اپنی مرضی کے تحت ای سی ایل میں نام شامل کرنا ایک طویل عرصے سے موضوع بحث بنا رہا ہے اوراس معاملے پر نظر ثانی کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ کسی بھی شخص کا نام ای سی ایل میں ڈالنے سے پہلے اس کا موقف جاننا ضروری ہے۔ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ پاکستان مشکل دور سے گزر رہا ہے لیکن ہم اس بات کے پہلے سے زیادہ قائل ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی کو دبانے کی بجائے اس کا احترام کرنا ہی دانش مندی ہے کیوں کہ صحافیوں میں قربانی کا بکرا تلاش کرنے سے نہ تو قومی ہم آہنگی حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی نظم ونسق کے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ایچ آر سی پی حکام سے مطالبہ کرتا ہے کہ سرل کا نام فی لفور ای سی ایل سے خارج کیا جائے اور انہیں ہراساں کرنے اور اخبار کے مالکان کو دھمکانے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ہم اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ کوان سے جو بھی شکایات ہیں ان سے قانون کے مطابق نمٹا جائے اور ان کی آزادی اظہار اور دیگر حقوق، بالخصوص وہ جن کا تعلق معین قانونی طریقہ کار سے ہے، کا خیال رکھا جائے۔

سول سوسائٹی کے کارکنان، دانشوروں اور حقوق کے محافظین کو نشانہ بنانا

اگر چہ بگڑتے ہوئے سول ملٹری تعلقات کے بارے میں شائع ہونے والی المیڈا رپورٹ نے ذرائع ابلاغ میں خوف کی فضاء کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں میڈیا کی جانب سے خود ساختہ سنسر شپ میں اضافہ ہوا، تاہم میڈیا پر دباؤ میں اس وقت بھی اضافہ ہوا جب 2016ء کے موسم خزاں میں سول سوسائٹی کے کارکنوں کو نشانہ بنایا گیا۔اس کی ایک مثال اکتوبر 2016ء میں دیکھنے کو ملی جب سیاسی اصلاحات اور ترقی پسند پالیسیوں پر سب سے زیادہ آواز اٹھانے والے پاکستان کے نامور دانشوروں کو لندن میں ایک اجلاس منعقد کرنے پر، جس کا مقصد پاکستان کے ایک ترقی پسند مستقبل سے متعلق بحث کرنا تھا، نشانہ بنایا گیا اور انہیں سوشل میڈیا پر منظم حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ایسے ہی آن لائن حملوں کا سامنا مصنفہ اور سیاسی وسکیورٹی تجزیہ نگار عائشہ صدیقہ آغا کو بھی کرنا پڑا جنہیں غدار اور ہندوستانی ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا ااور ان پر راء اور ہندوستانی مشیر برائے قومی سلامتی کے ساتھ تعلقات کا الزام عائد کیا گیا۔ بڑھتے ہوئے تناؤ اور سرکاری پالیسیوں سے اختلاف اور ان پر تنقید کے حوالے سے پائی جانی والی عدم برداشت کے ماحول میں، ان مہمات نے عائشہ صدیقہ اور سول سوسائٹی کی تنظیموں، دونوں کو جسمانی تشدد کے

خطرے سے دوچار کیا۔ 2016ء کے دوران عدم برداشت اور جنون کے اس ماحول نے خدشات میں اضافہ کیا جو انسانی حقوق کی آوازوں اور عقل کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

7 نومبر 2016ء کو ایچ آر سی پی نے الیکٹرانک و سوشل میڈیا پر ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کے خلاف چلنے والی مہم کو شرمناک قرار دیتے ہوئے اسے ایک جمہوری اور روادار معاشرے کی اقدار کے منافی قرار دیا۔ ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ڈاکٹر عائشہ کو افغانستان میں ایک حالیہ کانفرنس میں شرکت کے بعد سے ذرائع ابلاغ، خاص طور پر سوشل میڈیا کردارکشی کا نشانہ بنا رہا ہے جو انتہائی شرمناک بات ہے۔ ڈاکٹر عائشہ پر غداری کا لیبل چسپاں کرنے کی مہم اس میں ملوث ذرائع ابلاغ کے اداروں اور اس عمومی ماحول کی عکاسی کرتی ہے جہاں حب الوطنی کی اجارہ داری کا دعویٰ کرنے والے عناصر ہر اس فرد کو غدار کہنے میں کبھی دیر نہیں کرتے جو پاکستان کی پالیسیوں میں موجود خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ مانا کہ پاکستان مشکل دور سے گزر رہا ہے اور اسے کئی محاذوں پر چیلنجوں کا سامنا ہے لیکن اس کو جواز بنا کر نہ تو رواداری اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہیے اور نہ ہی شہریوں کو ان کی اظہار رائے اور فکر کی آزادی سے محروم کرنا چاہیے۔ اس بات کا تصور کرنا مشکل نہیں کہ عام شہری بھی پاکستان کے مسائل کا حل تجویز کر سکتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر عائشہ صدیقہ اور ان تمام لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جو زیر عتاب ہیں۔ لیکن ہمیں زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ عدم رواداری اور جنون کی موجودہ فضاء انسانی حقوق اور عقل و دانش کا گلا گھونٹ دے گی اور یہ قوم کو اہم فیصلوں سے متعلق ان کی قیمتی رائے سے محروم کر دے گی۔ حکام، جو آج کل سائبر سپیس کے استعمال کے بارے میں کچھ زیادہ ہی فکرمند ہیں، انہیں اس معاملے کا نوٹس لینا چاہئے۔ ایسے حربوں کی عوامی مذمت بھی نہایت ضروری ہے تا کہ عقل و دانش اور اظہار رائے کی آزادی پر ہونے والے اس حملے کی مذمت کی جا سکے۔

پیغام رسانی پر پیغامبر کو الزام دینا

2016ء میں آزادی اظہار کے لحاظ سے ایک اور جو پریشان کن پیش رفت دیکھنے کو ملی وہ یہ تھی کہ دہشت گردی کی کوریج پر میڈیا کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اسے دہشت گردی کے فروغ کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور پریشان کن بات یہ تھی کہ ایک عدالتی تحقیقاتی کمیشن نے حکومت سے میڈیا کے خلاف کارروائی کرنے کی سفارش کی۔ اگست 2016ء میں کوئٹہ میں وکلاء پر کیے گئے جان لیوا حملے، جس میں 60 وکلاء اور دو صحافی ہلاک ہوئے تھے، کی تحقیقات کے لیے

قائم کیے گئے کمیشن نے حملوں کا ذمہ دار نہ صرف حکومتی اداروں کی جانب سے انٹیلیجنس اور سکیورٹی کی ناکامی کو قرار دیا بلکہ اس نے میڈیا کو بھی مسئلے کا حصہ قرار دیا۔ کمیشن نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ میڈیا ''بعض اوقات دہشت گردی کے واقعات کی رپورٹنگ کرتے وقت دہشت گردوں کی تعظیم کرتا ہے۔ صحافی خبروں کی اشاعت سے پہلے ان کی تصدیق نہیں کرتے اور دہشت گرد انہیں جو حکم دیتے ہیں وہی چھاپ دیتے ہیں، حالانکہ وہ جھوٹ ہوتا ہے، اور دہشت گردوں کے ہاتھوں بے رحمی سے مارے جانے والے شہیدوں اور ان کی وجہ سے ان کے ورثاء، پیاروں اور دوستوں کو پہنچنے والے دکھ کا لحاظ نہیں کرتے۔'' کمیشن نے تجویز کیا کہ: ''اگر میڈیا دہشت گردوں کے نظریات کی اشاعت کرتا ہے تو ایسا کرنے والوں کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیئے۔'' یہ ایک سخت تنقید ہے، اور حکومت کو دی گئی ہدایات انتہائی سخت گیر ہیں کہ وہ میڈیا کے خلاف کاروائی کرے کیوں کہ عام مقامات پر دہشت گردوں کی کارروائیوں کے بارے میں جاننا عوام کا حق ہے اور میڈیا کی یہ ذمہ داری ہے کہ پیشہ ورانہ صحافتی اخلاقیات کے مطابق ان کی کوریج کرے۔ کالعدم گروہوں کی کارروائیوں کی کوریج پر میڈیا کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیوں کہ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی کارروائیاں ہونے ہی نہ دے۔

شہریوں کی جانب سے آن لائن تنقید پر سرکاری عدم رواداری

ایک اور پریشان کن پیش رفت ریاست کے سب سے اعلیٰ قانونی افسر کی جانب سے 28 دسمبر 2016ء کو وزارت داخلہ اور وفاقی انفارمیشن ٹیکنالوجی ڈویژن کو بھیجا گیا سرکاری پالیسی نوٹ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سائبر سپیس میں عدلیہ کے خلاف ہونے والی ''توہین آمیز تنقید'' کے خلاف سختی سے نپٹا جائے۔ انہوں نے سوشل میڈیا پر عدلیہ کو ''نشانہ'' بنانے والے شہریوں یا گروہوں کے خلاف فوجداری کارروائی کی سفارش کی۔ اس جرم کی سزا دو سے پانچ سال قید ہوسکتی ہے۔ وسیع پیمانے پر شیئر کی گئیں دو تصاویر، جن میں دو ججوں کو سیاست دانوں سے ملاقات کرتے دکھایا گیا تھا اور جنہیں غیر شائستہ اور بہتان پر مبنی قرار دیتے ہوئے حکومت سے اپنی رائے کا آن لائن اظہار کرنے والے شہریوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا گیا تھا، کا حوالہ دیتے ہوئے اٹارنی جنرل کے نوٹ میں وزارت داخلہ اور آئی ٹی ڈویژن سے سفارش کی گئی کہ وہ ''سوشل میڈیا پر انفرادی صارفین اور گروپ اکاؤنٹس اور جھوٹے دعوے، الزامات، غلط بیانی یا توہین آمیز دعووں کے تحت تصاویر جاری کرنے والی ویب سائٹس کے خلاف فوجداری کارروائی کرے۔'' ان

احکامات کے تحت، جنہیں بظاہر عدلیہ کی حمایت حاصل ہے، اگر کوئی کارروائی کی گئی تو اس کے اظہار رائے کی آن لائن آزادی پر خوفناک اثرات مرتب ہوں گے۔

یوٹیوب سے پابندی اٹھالی گئی

2016ء میں پاکستان میں سنسر شپ سے متعلق واحد روشن پہلو یہ تھا کہ حکومت نے یو ٹیوب پر تین سالوں سے عائد پابندی اٹھالی۔ 19 جنوری 2016ء کو حکومت نے اس وقت یوٹیوب سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا جب گوگل کی زیر ملکیت اس ویڈیو شیئرنگ ویب سائٹ نے ایک مقامی ورژن متعارف کرایا جو حکومت کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ ایسے کسی بھی مواد کو حذف کرنے کا مطالبہ کرے جسے یہ توہین آمیز تصور کرتی ہو۔ پاکستان نے یوٹیوب پر ستمبر 2012ء میں پابندی عائد کی تھی جب اس سائٹ پر ایک اسلام مخالف فلم ''مسلمانوں کی معصومیت'' اپ لوڈ کی گئی تھی، جس کے بعد ملک کے بڑے شہروں میں پرتشدد واقعات پیش آئے تھے۔ وزیر برائے انفارمیشن ٹیکنالوجی و ٹیلی کام نے بتایا کہ یوٹیوب کے نئے ورژن کے تحت، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) توہین آمیز مواد کو بلاک کرنے کے لیے اس تک رسائی کی درخواست کرسکتا ہے۔ تاہم گوگل کا کہنا ہے کہ یہ جائزہ لیے بغیر خود بخود کسی مواد کو حذف نہیں کرے گا، اور یہ کہ مواد نظر ثانی کا طریقہ کار وہی ہوگا کہ یوٹیوب کے مقامی ورژنز کے حوالے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ حکومت کی مواد حذف کرنے سے متعلق درخواستوں کی عام اطلاع دی جائے گی۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران انٹرنیٹ تک رسائی میں اضافہ ہوا ہے اور حکومت نے ایسے ہزاروں ویب پیج بلاک کیے ہیں جو اس کی نظر میں قابل اعتراض تھے۔ لیکن سماجی کارکنوں کا کہنا ہے کہ بعض اوقات حکومت لبرل اور تنقیدی آوازوں کو خاموش کرنے کے لیے بھی ویب سائٹس بلاک کرتی ہے۔

سفارشات

1۔ وفاقی حکومت کو اہم متعلقہ فریقین یعنی فعال صحافیوں کے ساتھ مشاورت کے بعد فوری طور پر صحافیوں کے تحفظ سے متعلق ایک خصوصی قانون وضع کرنا چاہیے تاکہ ان کے تحفظ کے لیے ایک قانونی طریقہ کار تشکیل دیا جاسکے۔

2۔ چونکہ امن و امان ایک صوبائی موضوع ہے اور چونکہ میڈیا اور میڈیا کے ملازمین ملک بھر میں موجود ہیں، اس لیے چاروں صوبوں کو چاہیے کہ وہ صحافیوں کے تحفظ سے

متعلق صوبائی سطح پر بھی قانون وضع کریں تاکہ مقامی سطح پر تلافی سے متعلق زیادہ قابل رسائی طرائق کار فراہم کیے جاسکیں۔

3۔ ملک بھر کے میڈیا اداروں کو عملے کے تحفظ سے متعلق اپنی ذاتی پالیسیاں اور معاہدے وضع کرنے چاہئیں جن کا مقصد صحافیوں کو درپیش خطرات پر قابو پانا اور خطرہ مول لینے کے کلچر کی روک تھام ہو۔

4۔ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ معلومات فراہم کرنے والوں کے تحفظ کے لیے ایک ایکٹ متعارف کرائے تاکہ صحافیوں اور حکومتی عہدیداروں دونوں کو ایسی معلومات استعمال کرنے کی بنا پر قانونی کارروائی یا نقصان سے تحفظ فراہم کیا جاسکے جو ٹیکس دینے والوں کے پیسوں سے چلنے والے دفاتر کی شفافیت کو فروغ دیتی ہو، جبکہ اسی دوران سٹریٹیجک سکیورٹی یا انٹیلیجنس کے معاملات میں مخصوص کیسز میں استثنا بھی دیا جاسکتا ہے۔

5۔ 2016ء میں وضع کیے گئے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کے ایکٹ (پیکا) پر فوری طور پر نظرثانی کی ضرورت ہے تاکہ آن لائن آزادی اظہار کو جرائم کی فہرست میں سے خارج کیا جاسکے، صارف کے کوائف محفوظ رکھنے سے متعلق راہنما اصولوں کو حقیقت پسندانہ بنایا جاسکے اور ایسی دفعات شامل کی جاسکیں جو اس ایکٹ کے نفاذ کے طریقہ کار میں نگرانی اور شفافیت کو یقینی بنائیں۔

بنیادی آزادیاں

اجتماع کی آزادی

ہر شخص کو پرامن طور پر بغیر کسی ہتھیار کے' اجتماع کرنے کا حق حاصل ہوگا' بشرطیکہ اس سلسلے میں مفاد عامہ کے پیش نظر کوئی معقول قانونی پابندی عائد نہ کردی گئی ہو۔
آئین پاکستان
[آرٹیکل - 16]

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آزادی سے پرامن اجتماع منعقد کرے اور تنظیم بنائے۔
انسانی حقوق کا عالمی منشور
[آرٹیکل - 20 (1)]

پُرامن اجتماع کا حق جمہوری نظام کی بنیادی خصوصیت ہے اور اظہار اور انجمن سازی کی آزادی کے ساتھ اس کا انتہائی قریبی تعلق ہے۔ ایک روادار اور تکثیری معاشرے کے قیام کے لیے اس حق کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ اگرچہ پاکستان کے آئین میں اجتماع کی آزادی کی ضمانت دی گئی مگر اس پر قوانین کے ذریعے عائد کردہ پابندیاں شہری وسیاسی حقوق کے عالمی میثاق کی عائد کردہ معقول پابندیوں کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہیں۔

حکومت کی طرف سے تشدد کا بے جا استعمال اور ضابطہ تعزیرات پاکستان (پی پی سی) کی دفعہ 144 جو کہ چار سے زائد افراد کے اجتماع کی ممانعت کرتی ہے، کے غیر ضروری نفاذ سے پتہ چلتا ہے کہ 2016 میں پرامن اجتماع کے حقوق کو کس طرح پامال کیا جاتا رہا۔ طاقت پر حکومتی انحصار سے ظاہر ہوا کہ حکومت میں ہجوم کو کنٹرول کرنے کی اہلیت کا فقدان تھا۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی بندش سے عوام کا عام شاہراہوں کے استعمال کا بنیادی حق متاثر ہوا۔

حکومت نے احتجاجی مظاہروں کے لیے سرکاری اجازت نامے کی شرائط لاگو کیں۔ شفاف نظام کے تحت شہریوں کو حکام کو مظاہرے کے اوقات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ حکام کو انہیں مظاہرہ کرنے کی اجازت دینا ہوتی ہے۔ پُرامن اجتماع اور انجمن کے حق پر اقوام متحدہ کے خصوصی رپورٹیئر مائنا کیائے کے مطابق اجازت لوگوں کے اجتماع کے ''حق'' کو ''مراعات'' میں بدل دیتی ہے اور مراعات دینے سے حکومت انکار کرسکتی ہے یا اُسے محدود کرسکتی ہے۔ اجازت

دینے کا عمل بعض خاص گروہوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا سبب بن سکتا ہے۔

اِس قسم کے واقعات بھی پیش آئے کہ مظاہرین نے تشدد کا ارتکاب کیا، سڑکوں کی بندش سے لوگوں کی نقل وحرکت کا حق متاثر ہوا اور بروقت طبی امداد نہ ملنے پر کئی مریض ہلاک ہوئے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مظاہرین نے اپنی حمایت میں کوریج لینے کے لیے صحافیوں کو ڈرایا دھمکایا

مگر، کیا ئے کے بقول، ایسے لوگوں کی موجودگی سے اُن لوگوں کا حق ختم نہیں ہو جاتا جو پُرامن اجتماع کرتے ہیں، چنانچہ، پولیس کو اپنی گرفتاریاں اور سزا اُن لوگوں تک محدود رکھنی چاہئیں جو قانون کا لحاظ نہیں رکھتے۔

اجتماع کے حق کے عملی مظاہرے

2016 کے دوران ملک میں کئی احتجاج، ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے، جن میں سے بعض پرامن جبکہ بعض پُرتشدد تھے۔ امن عامہ کی مخدوش صورتِ حال، دہشت گردی کے واقعات مثال کے طور پر کوئٹہ میں پیش آنے والا واقعہ، ٹارگٹ کلنگ کے واقعات، قانون نافذ کرنے والوں کی تحویل میں مشتبہ افراد کا قتل، جنسی تشدد، اغوا اور ہندو لڑکیوں کے مذہب کی جبری تبدیلی کے خلاف ملک کے مختلف شہروں میں ریلیاں نکلیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ، اوکاڑہ، قصور اور حیدرآباد میں کسانوں نے شوگر ملوں کی طرف سے واجبات کی عدم ادائیگی کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے۔ اوکاڑہ کے 19 دیہاتوں کے کسانوں نے نہری پانی کی عدم دستیابی پر ریلی نکالی۔ جولائی میں، گجرات۔ سرگودھا شاہراہ کے گردونواح کے مختلف دیہاتوں کے درجنوں کسانوں اور زمینداروں نے سروکی اور شیخ سُکھا کے درمیان صنعتی اسٹیٹ کے فیز II کی تعمیر کے لیے زرعی اراضی حاصل کرنے کی تجویز کے خلاف احتجاج کیا۔

ملک میں لوگوں کو گیس، پانی اور بجلی کی قلت کے خلاف احتجاج کے لیے سڑکوں کا رُخ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ گیس اور بجلی کی قلت سے صنعتیں بند ہونے سے ہزاروں افراد بیروزگار ہوئے جس کے نتیجے میں ملک کے مختلف حصوں میں کئی احتجاجی مظاہرے ہوئے۔

اساتذہ، کلرکوں، محکمہ ریونیو، واٹر مینجمنٹ اور زکوٰۃ وعشر کے ملازمین نے تنخواہوں کی ادائیگی میں تاخیر، ترقیاں نہ ہونے، مستقل ملازم کا درجہ نہ ملنے، متنازعہ تقرریوں، نجکاری اور اغوا کاریوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے۔

توانائی، قومی ائیر لائن اور پاکستان اسٹیل ملز کے ملازمین نے اپنے اداروں کی مجوزہ

دیامر میں وفاقی ٹیکسوں کے خلاف ریلی۔ ملک کے مختلف شہروں میں امن وامان کی خراب صورتحال،
ٹیکسوں، گیس، پانی اور بجلی کی کمی اور نجکاری کے خلاف ریلیاں نکالی گئیں

نجکاری کے خلاف احتجاج کیا۔ ہائیڈرو الیکٹرک کے ملازمین نے اپنے دو مزدوروں کی ہلاکت کے خلاف احتجاج کیا۔ اورنج لائن ٹرین منصوبے پر کام کرنے والی ایک کرین بجلی کی تاروں سے ٹکرائی تھی جس کے نتیجے میں اِن مزدوروں کی موت واقع ہوئی تھی۔ گڈانی میں شپ بریکنگ یارڈ میں کام کرنے والے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد نے اُن مزدوروں کے اہل خانہ کو معاوضہ کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جو یکم نومبر کے حادثے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مزدوروں نے یوم مزدور منانے کے لیے بھی مختلف شہروں میں ریلیوں اور دیگر تقاریب کا اہتمام کیا۔ جنوری میں، سینکڑوں بھٹہ مالکان نے بھٹوں پر بچوں کی مشقت کے خاتمے کی حکومتی کاوشوں کے خلاف صوبہ پنجاب کے کئی شہروں میں احتجاجی مظاہرے کیے۔

اسلام آباد، کوئٹہ، لاہور، پشاور، کراچی، فیصل آباد، بنوں اور بعض دیگر شہروں میں ڈاکٹروں اور پیرامیڈکس نے احتجاجی مظاہرے کیے اور دھرنے دیے، وہ ملازمت کے ضوابط اور اسٹرکچر، الاؤنسز اور مریضوں کے لواحقین کی بدسلوکی کے معاملات پر احتجاج کر رہے تھے۔

قبائلیوں نے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے خاتمے اور فاٹا کو خیبر پختونخوا میں شامل کرنے کے حق میں وانا اور جنوبی وزیرستان میں احتجاجی مظاہرے کئے۔ لنڈی کوتل کے ذُگا خیل قبیلے کے لوگوں نے شاہراہوں کی بندش اور تاجروں کی نقل وحرکت پر پابندیوں کے خلاف طورخم بارڈر پر احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اُس علاقے میں کسٹمز ایکٹ 1969 کے نفاذ کے خلاف مالاکنڈ ڈویژن میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتال کی۔ جولائی میں قبائلی تاجروں سمیت ہزاروں قبائلیوں نے

افغانستان کی جانب سے وزیرستان کے مقام پر پاک افغان سرحد بند ہونے کے خلاف وانا اور انگور اڈہ بازار میں احتجاج کیا۔

جنوری اور فروری میں گلگت بلتستان بھر میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتال ہوئی۔ گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کا تعین کیے بغیر وفاقی حکومت کی جانب سے مقامی لوگوں پر ٹیکس کا نفاذ اس احتجاج کی وجہ تھا۔

مختلف سیاسی جماعتوں نے احتجاجی ریلیاں نکالیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ بحیرہ عرب میں پاکستان کے جنوب میں گوادر بندرگاہ کو چین کے مغرب میں شنجیانگ سے جوڑنے والی چین۔ پاک معاشی راہداری میں اُن کے صوبوں کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

مقامی حکومت کے نمائندوں نے صوبائی حکومتوں کی جانب سے مقامی حکومت کو انتظامی و مالیاتی اختیارات کی منتقلی نہ ہونے پر احتجاجی ریلیاں نکالیں۔ مئی میں، جماعت اسلامی نے بدعنوانی کے خلاف پشاور سے ایک ٹرین مارچ کا اہتمام کیا۔ ٹرین نے کراچی پہنچنے میں 48 گھنٹے لیے اور وہ راستے میں خیبر پختونخوا، پنجاب اور سندھ کے کئی شہروں میں رُکی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں پولیس کے ساتھ تصادم میں، طاہر القادری کی پاکستان عوامی تحریک (PAT) کے 14 کارکنوں کے قتل کے دو برس بعد، PAT نے مقدمے میں کوئی پیش رفت نہ ہونے کے خلاف مال روڈ پر دھرنا دیا۔

مارچ میں، جیے سندھ قومی موومنٹ (جے ایس ایم کیو) نے اپنے دو کارکنوں کی دوسری برسی پر ریلیاں نکالیں۔ 2014 میں ایک اور فرد سمیت اُن دو کارکنوں کی جلی ہوئی نعشیں جلی ہوئی کار سے برآمد ہوئی تھیں۔ اپریل میں، مکلی بائی پاس پر، دو نقاب پوش موٹر سائیکل سواروں نے جیے سندھ تحریک کے ایک دھڑے کے سربراہ شفیع محمد کرنانی کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا جس پر کئی سیاسی جماعتوں اور قوم پرست گروہوں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔

اگست میں، بلوچستان سے متعلق ہندوستانی وزیراعظم نریندر مودی کے بیانات نے صوبہ بھر میں احتجاجی مظاہروں کو جنم دیا۔ اکتوبر میں، دائیں بازو کی قدامت پسند جماعتوں اور کالعدم شدت پسند گروہوں کی تنظیم دفاع پاکستان کونسل نے ہندوستان کے زیرانتظام کشمیر میں تشدد کے خلاف احتجاجی ریلیاں نکالیں۔

جنوری میں، مظفر گڑھ میں سینکڑوں خواتین نے محمود کوٹ میں کوئلے سے توانائی پیدا کرنے والے مجوزہ پلانٹ کے خلاف احتجاج کیا اور اس منصوبے کو واپس نہ لینے کی صورت میں

احتجاجی مظاہروں میں ایک بس اسٹیشن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ مظاہرین کی طرف سے تشدد کے کئی واقعات سامنے آئے

خودسوزی کی دھمکی دی۔ جون میں، پی پی پی کی خواتین کارکنوں نے مطالبہ کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی سی) میں خواتین کی 50 فیصد نمائندگی ہونی چاہیے۔

بعض مذہبی جماعتوں نے پنجاب اسمبلی کی جانب سے خواتین پر تشدد کے خلاف بننے والے قانون کے خلاف احتجاج کیا۔ قانون میں خواتین کے لیے غیر معمولی حفاظتی بندوبست اور مجرموں کے لیے سزاؤں کا تعین کیا گیا تھا۔

خواجہ سراؤں کے خلاف تشدد اور اُن کے حقوق سے حکام کی لاپرواہی احتجاجی مظاہروں کا سبب بنی۔ کارکنوں کا کہنا تھا کہ گزشتہ دو برسوں میں، صرف خیبر پختونخوا میں 45 خواجہ سراء مارے جا چکے ہیں۔

جنوری اور دسمبر میں، لاہور، جھنگ اور پاک پتن میں نابینا افراد نے احتجاج کیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ پنجاب حکومت نابینا افراد کو روزگار دے اور عارضی بنیادوں پر تعینات نابینا ملازمین کی ملازمت کو مستقل کرے۔

فروری میں، ہندوؤں نے کراچی پریس کلب میں، اپنے مندر کی بے حرمتی کے خلاف احتجاج کیا۔ ستمبر میں، مسیحی برادری کے لوگوں نے، مسیحی کالونی پشاور میں شدت پسندوں کے حملے کے خلاف احتجاج کیا اور حکومت سے اقلیتوں کو مؤثر سکیورٹی دینے کا مطالبہ کیا۔ مارچ میں، سندھ اور خیبر پختونخوا کے درجنوں ڈنڈا بردار سکھوں نے پارلیمان کے بیرونی دروازے کو دھکا دے کر

کھولا اور پارلیمان کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ وہ شکارپور میں اپنی عبادت گاہوں پر حملوں اور سکھ برادری کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کی مبینہ بے حرمتی کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔

لاہور میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے طالب علموں نے اپنی تعلیمی اسناد کی توثیق نہ ہونے کے خلاف احتجاج کیا۔ پاک ۔ترک انٹرنیشنل اسکولز و کالج کے طالب علموں نے اپنے تدریسی و غیر تدریسی عملے کے ہمراہ مختلف شہروں میں احتجاجی مظاہرے کیے۔ وہ اس تعلیمی پراجیکٹ کے ساتھ منسلک تمام ترکوں کو پاکستان چھوڑنے کے حکومتی احکامات کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) سمیت سول سوسائٹی کی تنظیموں نے معروف ادیب اور شاعر عبدالواحد بلوچ سمیت دیگر لوگوں کی جبری گمشدگی، ایذا رسانی، 'غیرت' کے نام پر قتل، کے خلاف اور محنت کشوں، خواتین اور انسانی حقوق کے معاملات پر ریلیاں نکالیں۔

مشکلات

واقعات کی ایک طویل فہرست سے ثابت ہوتا ہے کہ پُرامن اجتماع کا حق، حکومت کی مرضی کے تابع تھا اور یہ حق پولیس کی دھونس سے پامال ہوا۔ پُرامن اجتماع پر پابندیاں لگانے، احتجاج کو جرم قرار دینے، لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے اور اختلاف رائے کو خاموش کرنے کے لیے کئی قوانین اور ضوابط بروئے کار لائے گئے اور اُن کا ناجائز استعمال جاری رہا۔ قوانین نے انسانی حقوق کے محافظین اور اراضی کے حقوق کے کارکنوں جیسے گروہوں کی اجتماع کی آزادی کے حق کو شدید متاثر کیا۔ ایسے کئی واقعات پیش آئے جن میں پولیس نے جائز احتجاجی مظاہروں کو روکنے کے لیے بہت زیادہ طاقت استعمال کی۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز، اساتذہ، نابینا افراد جیسے طبقوں کو اس قسم کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ شہریوں کو پرامن احتجاج میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے حراست میں لینے کی پالیسی سامراجی انتظامیہ کی اُس پالیسی کو دوام بخشنے کے مترادف ہے جس کے تحت کسی بھی قسم کے اختلاف کو قانونی حکومت کے خلاف مایوسی پھیلانے کی سازش تصور کیا جاتا ہے۔

حکومت نے سکیورٹی وجوہات کو بنیاد بنا کر سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو اسلام آباد میں احتجاج کرنے سے روکے رکھا۔

حکومت نے عمومی طور پر سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو ریڈ زون میں جمع ہونے کی اجازت نہ دی
تاہم بنیاد پرست مظاہرین نے سکیورٹی کے حصار کو توڑ ڈالا تھا

حکومت نے ریڈ زون، جہاں سفارتی علاقہ اور سرکاری عمارتیں واقع ہیں، میں عوامی ریلیوں اور اجتماعات پر پابندی عائد کی۔ تاہم، مارچ میں، بنیاد پرست مظاہرین، سکیورٹی زون میں گھس گئے، اُنھوں نے ممتاز قادری کی حمایت میں ریلی نکالنے کے لیے احتجاجی مظاہرے پر عائد پابندی کی پرواہ نہ کی۔ ممتاز قادری کو سلمان تاثیر، جنھوں نے توہین مذہب کے قانون میں اصلاح کا مطالبہ کیا تھا، کو قتل کرنے کے جرم میں 29 فروری کو پھانسی دی گئی تھی۔

مظاہرین، آسیہ بی بی، توہین رسالت کے مقدمے میں سزائے موت کی قیدی ایک مسیحی خاتون جس کی حمایت میں سلمان تاثیر بولے تھے، کی پھانسی کا مطالبہ لے کر، ممتاز قادری کے چہلم پر پہلے راولپنڈی جمع ہوئے تھے جس کے بعد اُنہوں نے اسلام آباد کا رُخ کیا اور وہاں چار دن تک دھرنا دیے رکھا اور اُس وقت ہی منتشر ہوئے جب بقول ایک حکومتی وزیر کے ''اُنہیں تسلی دی گئی کہ حکومت کا توہین مذہب قانون میں تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں''۔

اسلام آباد آنے والے مظاہرین نے ٹرکوں اور شپنگ کنٹینرز کو آگ لگائی اور اسلام آباد کی مرکزی شاہراہ پر نئے تعمیر ہونے والے بس اسٹیشنوں کو تباہ کیا جبکہ پولیس نے بڑے شپنگ کنٹینرز سے سڑکیں بند کر رکھی تھیں اور مظاہرین پر آنسو گیس پھینکا گیا۔ انتشار کو پھیلنے سے روکنے کے لیے، حکام نے اسلام آباد کے بڑے حصے میں موبائل فون سروس بھی بند کر دی جس سے اس شہر کے 20 لاکھ باشندوں میں سے متعدد کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔

مارچ میں، سنی اتحاد کونسل کے مظاہرین نے ممتاز قادری کی پھانسی کے خلاف لاہور میں ریلی نکالی اِس دوران اُنہوں نے بعض پولیس اہلکاروں اور وکیلوں کو مارا پیٹا، اسمبلی چیمبرز پر ایک پولیس چوکی اور ایک نجی ٹیلی ویژن چینل کی ڈی ایس این جی گاڑی کو نقصان پہنچایا اور مال روڈ پر نصب صوبائی حکومت کے اشتہارات اتار دیے۔

تاہم پاکستان تحریک انصاف کے اراکین، جن میں اراکین پارلیمان بھی شامل تھے، کو پُرامن اجتماع کے حق کے استعمال سے روکنے کے لیے بہیمانہ طاقت استعمال کی گئی اور بے جا طور پر وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ یہ لوگ وزیراعظم نواز شریف کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے اسلام آباد آرہے تھے۔حکومت نے 2 نومبر کے لانگ مارچ سے قبل، ہر قسم کے سیاسی اجلاس، ریلی اور احتجاج پر پابندی لگادی۔ حکام نے مظاہرین پر غیر ضروری طور پر بہت زیادہ طاقت کا استعمال کیا اور اُنہیں آنسو گیس اور ربڑ کی گولیوں کا نشانہ بنایا۔

ایک طرف راولپنڈی اور دیگر جگہوں پر پی ٹی آئی کے کارکن اور پولیس دست و گریبان تھے جبکہ دوسری طرف کالعدم گروہ، اہل سنت والجماعت (اے ایس ڈبلیو جے) نے اسلام آباد کے مرکزی حصے میں ریلی نکالی۔ دفعہ 144 کے نفاذ کے باوجود، جسے حکومت نے پی ٹی آئی کے کنونشن کو منعقد ہونے سے روکنے کے لیے استعمال کیا تھا، اے ایس ڈبلیو جے نے بڑے سکون کے ساتھ اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کی اور حکومت پر دوغلی پالیسی اختیار کرنے کا الزام عائد کر کے متعدد لوگوں کو حکومت کے خلاف اکسایا۔

پی ٹی آئی کے احتجاج سے قبل، خیبر پختونخوا عملی طور پر ملک کے دیگر حصوں سے کٹ کر رہ گیا تھا کیونکہ حکام نے اسلام آباد۔ پشاور موٹروے سمیت تمام دیگر مرکزی سڑکوں پر شپنگ کنٹینرز اور بلاک رکھ کر اُنہیں آمدورفت کے لیے بند کر دیا تھا۔فوج کا ایک اعلیٰ درجے کا افسر سڑک کے کنارے کھائی میں گر کر ہلاک ہوگیا جبکہ دوسرا زخمی ہوگیا۔ وہ راولپنڈی سے نوشہرہ جانے والے ایک فوجی قافلے کی قیادت کر رہے تھے۔

جڑواں شہروں کے لوگوں کو ریلیوں اور دھرنوں کے اثرات بھگتنا پڑے۔ میٹرو بس سروس پورا دن بند رہی اور لوگوں کو کئی میل پیدل سفر کرنا پڑا۔

پاکستان تحریک انصاف کے 2 نومبر کے مجوزہ احتجاج کے خلاف 13 پٹیشنوں کی سماعت کرتے ہوئے عدالتِ عالیہ اسلام آباد (آئی ایچ سی) کے جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے

پرامن اجتماعات کو روکنے کے لیے کنٹینرز لگا کر سڑکیں بلاک کی گئیں

کہا کہ اجتماع، نقل وحرکت اور اظہار کی آزادی شہری کا بنیادی حقوق ہیں جن کی آئین میں ضمانت دی گئی مگر یہ حقوق بے لگام نہیں ہیں۔

اسلام آباد ہائیکورٹ کے فیصلے میں کہا گیا ہے کہ اگر احتجاج کرنا ہر شہری کا حق ہے تو احتجاج نہ کرنا بھی ہر شہری کا حق ہے۔ کسی بھی فرد کو وہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کی قانون اجازت نہیں دیتا اور کسی کو بھی کوئی ایسا کام کرنے سے روکا نہیں جا سکتا جس کی قانون اجازت دیتا ہے۔

اسلام آباد ہائیکورٹ کے بنچ نے کیپٹل ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کو ہدایت کی کہ وہ مظاہرین کو جمہوری پارک وتقریر کارز (ڈی پی ایس سی) پر جمع ہونے دے تاہم شہر کو بند کرنے کی کوشش کی صورت میں قانونی کارروائی کرے۔

جولائی میں، اسلام آباد پولیس نے تحریک نفاذ جعفریہ کے نوجوانوں کی تنظیم مختار آرگنائزیشن (ایم او) کے 400 اراکین کے خلاف ریلی نکالنے، سڑکیں بند کرنے اور دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرنے پر مقدمہ درج کیا۔ پولیس نے کہا کہ شہر میں دفعہ 144 نافذ تھی اور ریلی کے منتظمین نے مقامی انتظامیہ سے اجازت نہیں لی تھی۔

دیگر کئی احتجاجی مظاہروں نے بھی مختلف شہروں میں سڑکیں بند کر کے مسافروں کو پریشان کیا اور لوگوں کی زندگی کو متاثر کیا۔ جنوری میں، دن بھر جاری رہنے والے احتجاجی

مظاہروں سے سنٹرل لاہور میں تقریباً آٹھ گھنٹوں تک ٹریفک کی آمدورفت بند رہی۔ ٹریفک کی بندش سے اسکولوں اور کالجوں سے پلٹنے والے طالب علم بھی بروقت گھر نہ پہنچ سکے۔ راستوں کی بندش کے باعث کئی ایمبولینس بھی پھنسی رہیں۔ بعض جگہوں پر لوگوں کا کہنا تھا کہ جب اُنہوں نے مظاہرین سے کہا کہ اُنہیں گزرنے کی اجازت دی جائے تو جواب میں مظاہرین نے اُن کے ساتھ بدسلوکی کی۔ مظاہرین نے رنگ روڈ پر ایک احتجاجی کیمپ لگایا جس کے باعث افغانستان چیزیں نہ تو بھیجی جاسکیں اور نہ ہی وہاں سے لائی جاسکیں۔ مظاہرین بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے اپنی ڈیوٹی کا بائیکاٹ کر کے دھرنے دیے جس کے باعث مریضوں کو علاج معالجے کی سہولت نہ ملنے کے باعث شدید پریشانی برداشت کرنا پڑی۔ اطلاعات کے مطابق، دو مریض بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ راولپنڈی میں ایک حاملہ خاتون ایمبولینس میں موت کا شکار ہوئی۔ خاتون ایمبولینس میں ہسپتال جا رہی تھی مگر ہسپتال کو جانے والے راستے شپنگ کنٹینرز سے بند تھے اور پولیس کسی کو بھی آگے جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ لاہور میں، ایک کم عمر لڑکا ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں زندگی کی بازی ہار گیا کیونکہ سڑک کی بندش سے وہ بروقت ہسپتال نہیں پہنچ سکا تھا۔ نومبر میں، دل کا دورہ پڑنے والا ایک مریض میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے باہر فوت ہوگیا کیونکہ وہاں احتجاج پر بیٹھے ڈاکٹرز نے اُسے ہسپتال داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

ڈاکٹروں، طالب علموں، نرسوں، وکیلوں، کسانوں اور رئیل اسٹیٹ کے ایجنٹوں کے احتجاج سے سڑکیں بند ہونے سے مال روڈ، لاہور پر کاروباری سرگرمیاں شدید متاثر ہوئیں۔ تاجروں اور کاروباری لوگوں نے ان احتجاجی مظاہروں کے خلاف عدالتِ عالیہ، لاہور سے رجوع کیا۔ عدالت نے ضلعی انتظامیہ کو کہا کہ مال روڈ پر احتجاجی مظاہروں کی روک تھام کے لیے کوئی پالیسی وضع کی جائے۔

مظاہرین اپنی حمایت میں کوریج کے لیے صحافیوں کو ڈراتے دھمکاتے رہے۔

اگست میں، کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے لوگوں نے پارٹی اراکین کی گرفتاری کے خلاف چھ روزہ بھوک ہڑتال کو میڈیا کوریج نہ ملنے پر ٹی وی اسٹیشنوں پر حملہ کیا اور پولیس کے ساتھ دست وگریبان ہوئے جس کے نتیجے میں ایک فرد کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا

موٹروے پر سڑک بلاک کی گئی۔ پرامن اجتماع کا حق حکومت کی مرضی کے تابع تھا

جبکہ ایک میڈیا ورکر سمیت آٹھ افراد زخمی ہوئے۔ مظاہرین نے تین گاڑیوں کو آگ لگا کر جلا دیا تھا۔ پولیس نے آنسو گیس پھینکی اور 12 افراد کو گرفتار کیا۔ جنوری میں، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے باشندوں نے نصف صدی قدیم درختوں کو اکھاڑے جانے کے خلاف پُرامن احتجاج کیا مگر صورت حال اُس وقت خراب ہوگئی جب ڈی ایچ اے کی وِیجیلنس کمیٹی نے ان پر طاقت کا استعمال کیا۔ ایک نجی ٹی وی چینل کے کیمرہ مین پر ڈی ایچ کی وِیجیلنس ٹیموں نے حملہ کیا اور اُسے کئی گھنٹوں تک حراست میں لیے رکھا جبکہ کیمرہ اور اُس میں موجود مظاہرے کی تصویریں ضبط کر لیں۔ فروری میں، گوجرانوالہ میں پہلوانوں کے ایک گروہ نے ضلعی انتظامیہ کی سرگرمیوں کے بائیکاٹ پر بعض مقامی صحافیوں اور ٹی وی چینلوں کے کیمرہ مینوں پر تشدد کیا۔

جناح ٹرمینل کراچی پر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے ملازمین احتجاج کر رہے تھے جن کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج، ربڑ کی گولیوں، واٹر کینن اور آنسو گیس کا استعمال کیا گیا۔ دو مظاہرین گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہوئے۔ رینجرز اور پولیس نے ''مظاہرین پر تشدد'' کرنے اور جائے وقوعہ پر فائرنگ کی اطلاعات کی تردید کی تھی۔ احتجاج کے دوران دیگر افراد کے علاوہ ڈان نیوز کے کیمرہ مین شفیق دلشاد بھی زخمی ہوئے کیونکہ سکیورٹی اہلکاروں نے احتجاج کی کوریج کرنے والے صحافیوں کو بھی منتشر کیا تھا۔ ایکسپریس نیوز کا کیمرہ مین آغا شفیق بھی زخمی ہوا جبکہ ایکسپریس ٹریبون کے بزنس رپورٹر پر بھی لاٹھی چارج کیا گیا۔

اگست میں،ضلع راجن پور کے ایک قصبے داجل میں ڈکیتی کی واردات میں ایک شخص کا قتل ہو گیا جس کے بعد مقامی لوگوں کا پولیس اہلکاروں کے ساتھ تصادم ہوا، اُنہوں نے پولیس اہلکاروں کو یرغمال بنالیا اور کئی سرکاری گاڑیوں کو آگ لگادی جس کے باعث داجل میں معمول کی زندگی شدید متاثر ہوئی۔ راجن پور پولیس نے پولیس کی پانچ گاڑیاں جلانے کے الزام میں انسداد دہشت گردی ایکٹ (اے ٹی سی) کے تحت 1300 سے زائد افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا۔ اطلاعات کے مطابق پولیس کے چھاپوں کی وجہ سے کئی لوگوں کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنا گھر بار چھوڑ کر دیگر جگہوں پر منتقل ہونا پڑا۔

فروری میں، بدین میں کالعدم جیے سندھ متحدہ محاذ (جے ایس ایم) اور جیے سندھ لبریشن فرنٹ نے ''سندھ میں باہر کے لوگوں کی آبادکاری'' کے خلاف ریلی نکالی جس کے بعد پولیس نے کئی قوم پرست جماعتوں کے 45 کارکنوں کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔ پولیس نے ریلیوں کے شرکا کو منتشر کرنے کے لیے اُن پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا جس کے باعث 90 افراد بے ہوش اور کئی زخمی ہوئے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ریلی کے شرکا نے اُن پر پتھراؤ کیا، اُن کی چوکیاں توڑیں اور شہر میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔

مارچ میں، کئی اساتذہ اپنے سروس سٹرکچر میں بہتری کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ جب اُنہوں نے وزیر اعلیٰ ہاؤس کی طرف پیش قدمی کی تو اُن پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ پولیس نے مظاہرین کو ریڈ زون سے دور رکھنے کے لیے واٹر کینن استعمال کی جس کے نتیجے میں پانچ اساتذہ زخمی ہوئے جبکہ چھ اساتذہ کو حراست میں لے لیا گیا۔

اپریل میں قصور میں پولیس کی حراست میں ایک شخص کی ہلاکت کے بعد احتجاج شروع ہو گیا۔ مظاہرین نے ریلوے لائن کے قریب کوٹ رادھا کشن چوک بند کر دیا اور پولیس پر پتھراؤ کیا۔ پولیس اور مظاہرین کی لڑائی بھی ہوئی جس میں دو پولیس اہلکار زخمی ہوئے۔ احتجاجی مظاہرے کے بعد، چار پولیس اہلکاروں پر مظاہرین پر تشدد کرنے کا مقدمہ درج کر کے اُنہیں جیل میں ڈالا گیا۔

یکم مئی کو، لاہور میں پاکستان تحریک انصاف کی 50 سے زائد خواتین کی قابل مذمت جنسی ایذا دہی نے نہ صرف افسوس ناک سماجی رویے کی نشاندہی کی بلکہ سیاسی جلسوں میں مؤثر سکیورٹی کے انتظامات کے فقدان کو بھی اجاگر کیا۔ اُس سے قبل، اسلام آباد اور ملتان میں پی ٹی

کئی مقامات پر شہریوں نے شکایت کی کہ سڑک کی بندش کے موقع پر جب انہوں نے گزرنے کے لیے راستہ مانگا تو مظاہرین نے ان سے بدتمیزی کی

آئی کی ریلیوں میں بھی خواتین پر حملے ہوئے تھے۔ پی ٹی آئی کے سربراہ عمران خان نے پی ٹی آئی خواتین کارکنوں کی ایذادہی پر افسوس کا اظہار کیا۔ خواتین کے پاس سیاسی عمل میں شرکت کا حق ہے۔ ریاست کو چاہیے کہ وہ ملک میں خواتین کے خلاف پائے جانے والے بیانیے پر قابو پانے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔

تحریک حسینی کے کارکنوں نے پاراچنار کے قریب قومی شاہراہ پر دھرنا دیا۔ حکام نے پشاور کے دو علماء کے پاراچنار میں داخلے پر پابندی عائد کی تھی جس کے ردّعمل میں یہ دھرنا دیا گیا تھا۔ احتجاج کے دوران سکیوٹری فورسز اور مظاہرین کے درمیان تصادم ہوا جس کے باعث تین افراد ہلاک ہوئے اور لیویز فورس کے ایک اہلکار سمیت 11 افراد زخمی ہوئے۔

12 مئی کو، دادو میں، پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے اُن پر لاٹھی چارج کیا جس سے 12 افراد کو معمولی چوٹیں آئیں۔ مظاہرین کا کہنا تھا کہ حکام ناجائز تجاوزات کے خلاف جاری مہم میں امتیازی سلوک کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

مئی میں، لاہور اور دیگر جگہوں پر تعینات پولیس کے دستوں نے اوکاڑہ کے ملٹری فارمز کے مزارعین کا احتجاج کو روکنے کی کوشش کی۔ اطلاعات کے مطابق، سنٹرل پنجاب میں اراضی کی ملکیت کے حق کی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے انجمن مزارعین پنجاب کے 50 کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔

مظاہرین کے احتجاج کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک کی آمدورفت معطل ہوئی

مارچ میں ڈیرہ رحیم پولیس نے ہڑپہ بائی پاس روڈ بند کرنے اور پنجاب حکومت کی 'ناقص' زرعی پالیسی کے خلاف نعرے لگانے کے الزام میں پاکستان کسان اتحاد (پی کے آئی) کے ضلعی صدر محمد حسین سمیت 260 کسانوں کے خلاف مقدمہ درج کیا۔ کسانوں کے خلاف 16 یم پی او، پی پی سی کی دفعہ 341، 148، 149 اور پنجاب ساؤنڈ سسٹم ریگولیشن ایکٹ 2015 کے تحت مقدمہ درج کیا گیا۔ دسمبر میں، بھکر میں چنے کی فصل کے کاشتکاروں کی پولیس کے ساتھ چپقلش ہوئی۔ کاشتکاروں کا کہنا تھا کہ قطر کے شاہی خاندان نے اُن کے علاقے میں تلور کے شکار کے دوران اُن کی فصلوں کو نقصان پہنچایا تھا۔

جون میں، مال بردار گاڑیوں کے مزدوروں نے لاڑکانہ۔نوشہرو فیروز بائی پاس پر دھرنا دیا۔اطلاعات کے مطابق مظاہرین نے رینجرز پر پتھراؤ کیا جس سے دو رینجرز اہلکار زخمی ہوگئے۔

جون میں، پشاور میں، پولیس نے خیبر پختونخوا اسمبلی کے سامنے جمع ہونے والی درجنوں نرسوں پر تشدد کیا۔ وہ اپنے کام کے حالات میں بہتری لانے کے لیے احتجاج کر رہی تھیں۔ مظاہرہ کے دوران گرفتار ہونے والی چند نسرز کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا مگر اُن کے خلاف درج ایف آئی آر میں اُن پر عائد الزامات میں مبالغہ آرائی شامل تھی۔ اُن الزامات میں ڈرانا دھمکانا، فساد برپا کرنا اور لاؤڈ سپیکر کا ناجائز استعمال بھی شامل تھا۔

جون میں، بعض مشتعل مظاہرین نے بدین میں حیدرآباد الیکٹرک سپلائی (حیسکو)

کے ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر پر دھاوا بولا۔

نومبر میں، ملیر کے علاقے میں لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس استعمال کیا گیا اور ہوائی فائرنگ کی۔ مظاہرین نے ایک شیعہ عالم اور دیگر رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف بطور احتجاج قومی شاہراہ اور مرکزی ریلوے لائن بند کر رکھی تھی۔

سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے تاریخی مقام ناصر باغ کو احتجاجی مظاہروں اور سیاسی ریلیوں کا مقام قرار دیا۔ ایک اور آرڈر کے ذریعے، حال ہی میں تعمیر ہونے والے گریٹر اقبال پارک میں سیاسی جلسوں پر پابندی لگائی گئی۔ ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر (ڈی سی او) کی جانب سے جاری ہونے والے نوٹیفکیشن میں کہا گیا کہ منتظمین کو ناصر باغ میں کوئی تقریب منعقد کرنے سے 10 دن پہلے اس کی اجازت کے لیے درخواست دائر کرنا ہوگی۔ نوٹیفکیشن میں مزید کہا گیا کہ ''50 سے زائد افراد کے اجتماع کی صورت میں درخواست کی منظوری تب ہی دی جائے گی جب لاہور پولیس، ٹریفک پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیاں درخواست کو کلیئر قرار دیں گی۔

سفارشات

☆ حکومت کو اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ خواتین، بچوں اور پسماندہ طبقوں سمیت تمام افراد اپنا پرامن اجتماع کا حق استعمال کر سکیں۔

☆ پرامن اجتماع کی آزادی کے حق پر پابندی عائد کرنے کے لیے دفعہ 144 کا نفاذ ہرگز نہیں ہونا چاہیے اور اس دفعہ کو منسوخ کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ لوگوں کو سڑکوں کی بندش سے آگاہ کیا جائے اور متبادل راستوں کے بارے میں اُن کی رہنمائی کی جانی چاہیے۔

☆ اگر تشدد کے اکادکا واقعات پیش آتے ہیں تو حکام کو چاہیے کہ وہ اُس میں ملوث افراد کا سراغ لگائیں۔ اور حکام کو چند لوگوں کے تشدد کا بہانہ بنا کر اکثریتی آبادی کے حقوق پر قدغنیں نہیں لگانی چاہئیں۔

☆ احتجاجی مظاہروں کے دوران خواتین اور پسماندہ برادریوں پر ہونے والے حملوں کے ساتھ سختی سے نبٹا جائے اور مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

☆ احتجاجی مظاہروں کی کوریج کرنے والے میڈیا ورکرز کو بغیر کسی خوف و خطر اور دھونس کے آزادانہ ماحول میں اپنا کام کرنے کی اجازت دی جائے۔

بنیادی آزادیاں

انجمن سازی کی آزادی

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ اس سلسلے میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، ملک کی سالمیت، امن عامہ یا اخلاق کے مفاد میں قانون کے تحت کوئی معقول پابندی عائد نہ کی گئی ہو۔ آئین پاکستان

[آرٹیکل - 17]

ہر شخص کو پرامن اجتماع کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہے۔ کسی شخص کو کسی تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل 20-2,1]

ہر شخص کو دوسروں کے ساتھ مل کر انجمن سازی کا حق ہوگا۔ اس میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق بھی شامل ہے۔ شہری و سیاسی حقوق کا عالمی میثاق

[آرٹیکل 22]

مزدور اور آجر بغیر کسی قسم کی تفریق کے، صرف متعلقہ تنظیم کے اصولوں کے تابع، بغیر کسی پیشگی منظوری کے اپنی مرضی سے کسی بھی تنظیم کا حصہ بن سکتے ہیں۔ آئی ایل او کنونشن 87

[آرٹیکل 3]

مزدوروں کو ان کی ملازمت کے حوالے سے یونین مخالف امتیازی سلوک سے مناسب تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

آئی ایل او کنونشن 98

[آرٹیکل 1]

2016ء میں بھی اس بات کو یقینی نہ بنایا جاسکا کہ عوام ریاست کی غیر قانونی مداخلت اور غیر ریاستی عناصر کے تشدد کے خطرے سے آزاد ہو کر اپنے انجمن سازی کے حق کا استعمال کر سکیں۔ گھر پر کام کرنے والے ملازمین، طلباء اور غیر اندراج شدہ مزدوروں کے انجمن سازی کے حق سے انکار جیسے دیرینہ مسائل حل نہ کیے جا سکے۔ اپنی وابستگی کی بناء پر دھمکیوں اور حملوں کا سامنا کرنے والے گروہوں میں چند نئے گروہ بھی شامل ہو گئے۔ وکلاء کو اس وقت بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا جب ایک جان لیوا حملے میں بلوچستان بار اپنے تقریباً 70 اراکین سے محروم ہوگئی۔ اس واقعے اور سال کے دوران پیش آنے والے دیگر واقعات نے پیشہ ورانہ ذمہ داریوں

کی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انجام دہی کے حوالے سے وکلاء اور ججوں کے عدم تحفظ کے احساس میں شدید اضافہ کیا۔

این جی اوز کو انسداد دہشت گردی کے نام پر ریاست کی غیر ضروری مداخلت کا سامنا رہا۔ تمام اندراج شدہ این جی اوز سے کہا گیا کہ وہ یا تو دوبارہ اپنا اندراج کرائیں یا بندش کا سامنا کریں۔ اندراج کا نیا طریقہ کار انتہائی مشکل تھا جبکہ اس شعبے کو نظام کے تحت لانے کے طریقہ کار میں بھی شفافیت کا فقدان تھا۔ وزارت داخلہ نے کریک ڈاؤن کا غیر واضح طور پر دفاع کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان این جی اوز کے خلاف تھا جو غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھیں۔

حکومت اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی سے متعلق اقوام متحدہ کے خصوصی رپورٹیئر، مینا کیائی کو کوئی باضابطہ جواب جمع کرانے میں ناکام رہی۔ رپورٹیئر نے اپنی سالانہ رپورٹ میں حکومت پر زور دیا کہ وہ 2015ء میں ایک قبائلی صحافی زمان محسود، جو جنوبی وزیرستان میں ایچ آر سی پی کے نامہ نگار بھی تھے، کے قتل اور انسانی حقوق کے کارکن واحد بلوچ کی جبری گمشدگی کی مکمل اور آزادانہ تحقیقات کرے؛ مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لائے؛ اور متاثرین کے خاندانوں کو معاوضہ ادا کرے۔ واحد بلوچ کو 26 جولائی 2016ء کو سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد اور پولیس کی وردی میں ملبوس افراد نے ایک ہائی وے سے اغواء کیا تھا۔ وہ 6 دسمبر کو گھر واپس پہنچے۔ تحقیقات میں سال کے آخر تک اس بات کا پتا نہ چل سکا کہ گمشدگی کے دوران وہ کہاں رہے تھے۔

ٹریڈ یونینز

محنت کشوں کی ایک بڑی تعداد مشقت سے متعلق قوانین کی حدود سے باہر رہی۔ ایک اندازے کے مطابق، پاکستان میں گھریلو مزدوروں کی تعداد 85 لاکھ تھی، جن میں سے زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی ہے۔ ان کا اور گھر پر کام کرنے والے محنت کشوں کا پاکستان کی معیشت میں ایک نمایاں حصہ ہے۔ معیشت میں ان کے اہم کردار کے باوجود، وہ محنت کشوں کے سب سے زیادہ استحصال زدہ گروہوں میں شامل رہے۔ کسی باضابطہ پالیسی کی غیر موجودگی میں انہیں سماجی اور قانونی تحفظ اور اپنے مطالبات کے لیے آواز اٹھانے کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس غیر اندراج شدہ لیکن وسیع افرادی قوت کو پیشہ ورانہ تحفظ کی کمی کا سامنا رہا، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سال بھر کے دوران نابالغ گھریلو ملازمین کے خلاف تشدد کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے۔

ستمبر میں، آل پاکستان ورکرز کنفیڈریشن نے لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے ان مزدوروں کے خاندانوں کے لیے معاوضے کا مطالبہ کیا جو لاہور میں ایک فیکٹری میں ہونے والے دھماکے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ حکومت ریلوے میں ٹریڈ یونین کی سرگرمی سے پابندی اٹھائے۔

سیاسی وابستگی کی بناء پر نشانہ بنانا

سال کے دوران کراچی میں ایذا رسانی کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا جن میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کو نشانہ بنایا گیا۔ سندھ رینجرز نے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین پر جرائم میں ملوث افراد کو پناہ دینے کا الزام عائد کرتے ہوئے پارٹی کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کیا۔ ایم کیو ایم کے کارکنوں سمیت ہزاروں مبینہ جرائم پیشہ افراد اور مشتبہ افراد کو وارنٹ کے بغیر گرفتار کیا گیا اور طویل عرصے تک غیر قانونی حراست میں رکھا گیا۔ مئی میں، ایم کیو ایم کے ایک کارکن آفتاب احمد رینجرز کی حراست میں ہلاک ہوگئے۔ پوسٹ مارٹم میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ ان کے جسم کے چالیس فیصد حصے پر زخم موجود تھے اور ان کی موت تشدد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رینجرز نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے چھاتی کی تکلیف کی شکایت کی تھی جس کے بعد ہسپتال میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ تاہم، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد، رینجرز کے ڈائریکٹر جنرل نے اعتراف کیا کہ ان کی موت تشدد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رینجرز کے چار اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا لیکن انہیں قانون کے مطابق سزا نہ دی گئی۔

وزیر اعلیٰ کے حکم پر سندھ بھر میں ایم کیو ایم کے دفاتر سیل کر دیے گئے جبکہ تقریباً 300 دفاتر مسمار کر دیے گئے جن کے بارے میں حکومت کا کہنا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ اگرچہ تجاوزات قائم کرنا ایک جرم ہے، تاہم اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ صرف ایم کیو ایم کے دفاتر ہی حکام کی توجہ کا مرکز کیوں تھے۔ اپریل میں، وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا کے معاون خصوصی برائے اقلیتی امور اور رکن صوبائی اسمبلی سردار سورن سنگھ کو ضلع بونیر کے علاقے پیر بابا کے قریب فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔

25 جولائی کو کوئٹہ میں مبینہ جنگجوؤں نے جمیعت علماء اسلام فضل الرحمان (جے یو آئی ایف) کے ضلعی صدر اوران کے بیٹے کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ واقعے کی ذمہ داری کسی نے بھی قبول نہ کی لیکن سکیورٹی فورسز نے واقعے کے چند روز بعد باغی جنگجو گروہوں سے تعلق رکھنے والے

کراچی میں مسلح افراد کے ہاتھوں خرم ذکے قتل سے پاکستان میں سماجی کارکنوں اور
شہری آزادیوں کے محافظین کو درپیش خطرات کی خوب عکاسی ہوتی ہے

سات مشتبہ جنگجوؤں کو گرفتار کر لیا۔

اس سے پہلے اُسی ماہ ضلع صوابی میں سابق رکن صوبائی اسمبلی اور عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے ایک سینیئر رہنما کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ موٹر سائیکل پر سوار نامعلوم حملہ آوروں نے انہیں ان کے حجرے میں نشانہ بنایا تھا۔

ستمبر میں، نوشہرہ میں پاکستان تحریک انصاف کی ایک خاتون کونسلر کو نامعلوم حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ حملہ آور رات کے وقت ان کے گھر میں داخل ہوئے اور انہیں اس وقت فائرنگ کر کے قتل کر دیا جب وہ سو رہی تھیں۔ مذکورہ کونسلر بلا مقابلہ منتخب ہوئی تھیں اور وہ علاقے میں پولیو ورکر کے طور پر بھی کام کرتی تھیں۔

اکتوبر میں، ہری پور میں پاکستان سنی تحریک (پی ایس ٹی) نے مولانا شوکت نواز کو اس وقت گولی مار کر قتل کر دیا گیا جب وہ مقامی مسجد میں فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے اپنے گھر سے نکلے۔

دسمبر میں، کراچی میں پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے ایک کارکن کو نامعلوم حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ چار ماہ پہلے، کراچی میں مسلح افراد نے پی ٹی آئی کے دو سینیئر رہنماؤں کی کار پر فائرنگ کی تاہم دونوں افراد حملے میں محفوظ رہے کیوں کہ ان کی کار بلٹ پروف تھی۔ 21 ستمبر کو لاہور میں پی ٹی آئی سے تعلق رکھنے والے چیئرمین یونین کونسل کے

امیدوار کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔

جیے سندھ قومی محاذ (جسقم) کے ایک سینئر رکن کو قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں نے نوشہرو فیروز سے اٹھا لیا اور انہیں دس دن تک جبری طور پر گمشدہ کیے رکھا۔ اس کے بعد ان کو نازک حالت میں ایک گاڑی سے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔ اس سے پہلے، جب ان کے ساتھیوں نے ان کی بے جا اور غیر قانونی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا تو قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہلکاروں نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا بے جا استعمال کیا جس کے نتیجے میں جسقم کے ایک کارکن ارشاد چنا ہلاک ہو گئے۔ حکام واقعے میں ملوث اہلکاروں کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے بجائے تقریباً 500 افراد کے خلاف مقدمات درج کر لیے گئے۔

17 جون 2014ء کو احتجاجی مظاہروں کے دوران پاکستان عوامی تحریک کے 14 کارکنوں کے قتل کے مقدمہ میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پولیس نے لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں مبینہ طور پر ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا بے جا استعمال کیا تھا جس کے نتیجے میں 14 افراد جاں بحق اور سینکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ دو سال گزرنے کے باوجود یہ مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں زیر التوا ہے۔

این جی اوز کے خلاف کریک ڈاؤن

سال کے دوران قومی اور بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے آپریشنوں، سرگرمیوں اور اجلاسوں پر بے جا اور غیر ضروری پابندیاں عائد کی گئیں۔ این جی اوز کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا عمل، جو 2012ء میں غیر ملکی امداد کو باضابطہ بنانے کے ایکٹ کی منظوری کے بعد شروع ہوا تھا، 2016ء میں مزید تیز ہو گیا جس کا نتیجہ دھمکیوں اور پابندیوں کی صورت میں نکلا۔ اس گھٹن زدہ ماحول کی انسانی حقوق کے کارکنوں نے خاص طور پر مذمت کی کیوں کہ یہ ماحول ایک جمہوری نظام میں پیدا کیا گیا تھا۔ ملک بھر کی مختلف ملکی اور بین الاقوامی این جی اوز سے کہا گیا کہ انہیں نئے این او سی حاصل کرنا ہوں گے۔ ان این جی اوز کو کئی دہائیوں پرانے ریکارڈ اور تمام ملازمین کی مکمل معلومات مہیا کرنے کو کہا گیا جس کے باعث انہیں این او سی کے حصول میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

جون 2015ء میں، این جی اوز کو باضابطہ بنانے کی ذمہ داری معاشی امور ڈویژن

سے وزارت داخلہ کو منتقل کر دی گئی اور وزیر داخلہ نے کہا کہ ایسی این جی اوز جو ''ہماری اقدار کے خلاف کام کر رہی ہیں'' انہیں کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں، پنجاب کی این جی اوز مقامی ڈی سی او سے کام کرنے کی اجازت طلب کرتیں اور ڈی سی او ان درخواستوں کو منظوری کے لیے وزارت داخلہ کو بھیجتا۔ اس کے بعد محکمہ داخلہ وزارت داخلہ کو خط لکھ سکتا تھا کہ وہ کسی مخصوص این جی او کے خلاف کارروائی کرے اور اس کا لائسنس منسوخ کرے۔ اگرچہ سال کے دوران کسی بھی این جی او پر پابندی نہیں لگائی گئی تاہم ان کے کام کرنے کے مواقع نمایاں طور پر کم ہوگئے اور اس کے نتیجے میں نہ صرف این جی اوز کی جانب سے اکثر خود ساختہ سنسر شپ دیکھنے میں آئی بلکہ حکومت کی سرپرستی میں این جی اوز کو بدنام کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

مارچ میں، وزیر داخلہ نے کہا کہ حکومتی نگرانی کے ناقص نظام کی وجہ سے مخالف سرگرمیوں میں ملوث غیر ملکی ایجنٹ بین الاقوامی امدادی کارکنوں کے بھیس میں ملک میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے دعوے کی تائید کے لیے کوئی ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہے۔ اس سے پہلے، حکومت نے بچوں کی تعلیم تک رسائی اور معیار تعلیم کی بہتری پر کام کرنے والی ایک این جی او ساحل کے اسلام آباد دفتر کو بند کر دیا تھا۔ ان پر بین الاقوامی امداد وصول کرنے اور مطلوبہ دستاویزات نہ رکھنے کا الزام عائد کیا گیا۔ وزیر داخلہ غیر ملکی امداد وصول کرنے کے مجرمانہ پہلو کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہے کیوں کہ پاکستان میں کام کرنے والی این جی اوز کی اکثریت ہمیشہ ڈونرز کی امداد کے ذریعے ہی کام کرتی رہی ہیں۔

یکم ستمبر کو، ضلع سرگودھا میں پولیس نے خواتین کے خلاف تشدد اور مذہبی عدم برداشت کے خاتمے کے لیے کام کرنے والی تانگ وسیب آرگنائزیشن (ٹی ڈبلیو او) کے دفاتر زبردستی بند کروائے۔ پولیس نے دفتر کو تالے لگائے، عملے کو کچھ دیر تک زیر حراست رکھا اور ان سے ٹی ڈبلیو او کی بانی روبینہ بھٹی کا اتہ پتہ پوچھتی رہی۔ اگلے دن، پولیس نے بھٹی کے گھر کا دورہ کیا۔ اگست میں، وزارت داخلہ کے ایک انسپکٹر نے روبینہ بھٹی کو بتایا کہ اس کے خلاف شکایت کی گئی ہے کہ ٹی ڈبلیو او، مسیحیت کی تبلیغ کر رہی ہے اور پاکستان کو بدنام کر رہی ہے۔ ایچ آر سی پی نے تشویش کا اظہار کیا کہ ''سول سوسائٹی کی تنظیموں (سی ایس اوز) کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور نظم و نسق کے معاملات اجاگر کرنے پر نشانہ بنایا جا رہا ہے''۔

ترقیاتی امور میں معاون کار تنظیم، ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ (سیپ) کو سماجی بہبود و بیت المال، لیہ کے ضلعی افسر کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ وزارت داخلہ نے انہیں مطلع کیا ہے کہ سیپ۔ پاکستان ریاست مخالف ایجنڈے کو فروغ دے رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی کمیشن برائے انسانی حقوق کے سامنے آپریشن ضرب عضب اور نیشنل ایکشن پلان کی مایوس کن تصویر پیش کر رہی ہے۔ خط میں یہ بھی درج تھا کہ اعلیٰ حکام کی ہدایات کے باعث سیپ کو ضلع لیہ میں کام کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ اس طرح کے خوف و ہراس اور پابندیوں نے جمہوری معاشرے کو ان فوائد سے مستفید ہونے سے محروم رکھا ہے جو سول سوسائٹی جوابدہی و شفافیت کو یقینی بنا کر اور سزا سے استثنیٰ کی فضا کے خلاف جنگ کر کے پیدا کر سکتی ہے۔

وابستگی کی بناء پر نشانہ بنائے جانے کا عمل

2016ء میں وکلاء بھی ان گروہوں کی فہرست میں شامل ہو گئے جنہیں مذہبی انتہا پسند اُن کی وابستگی اور پیشے کی بدولت انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ 2016ء میں وکلاء پر دو بڑے حملے دیکھنے کو ملے۔ 8 اگست کو کم از کم 70 وکیل ہلاک ہوئے جب ایک خودکش بمبار نے بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کے ایک ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پر حملہ کیا جہاں وکلاء اپنے ایک ساتھی بلال انور کاسی کے قتل پر اظہار تعزیت کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ بلوچستان بار ایسوسی ایشن کے صدر، کاسی کو اسی صبح گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ سے منسلک دو افراد بھی حملے میں مارے گئے تھے۔ دولت اسلامیہ (آئی ایس آئی ایل) اور طالبان نے حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ناقص سکیورٹی کو حملے کا سبب قرار دیا گیا تھا۔ چند دن بعد کوئٹہ میں، وفاقی شرعی عدالت کے جج پر حملہ کیا گیا جس میں تقریباً ایک درجن لوگ زخمی ہوئے۔ مگر جج صاحب محفوظ رہے تھے۔

کوئٹہ حملے کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مردان، خیبر پختونخوا میں ضلعی عدالتوں پر ایک خودکش بم دھماکے کے نتیجے میں 12 افراد ہلاک اور 50 سے زائد زخمی ہو گئے۔ ہلاک شدگان میں تین وکیل اور دو پولیس اہلکار بھی شامل تھے۔ طالبان کے ایک دھڑے، جماعت الاحرار نے حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ وکیلوں اور ججوں میں شدید خوف و ہراس پایا جاتا ہے جس سے ان کا کام متاثر ہو رہا ہے۔

وکیلوں اور ججوں پر حملوں سے آزادی اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے پیشہ وارانہ امور کی انجام دہی کے حوالے سے ان میں عدم تحفظ کا احساس بڑھا ہے

ایچ آر سی پی کے جنوبی پنجاب کے کوآرڈینیٹر، راشد رحمان ایڈووکیٹ کے قتل کے مقدمے میں کوئی سنجیدہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔ انہیں 7 مئی 2014 کو ان کے ملتان میں واقع دفتر میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اپنے قتل سے ایک ماہ قبل، انہوں نے ضلعی پولیس اور ضلعی بار ایسوسی ایشن کو درخواستیں جمع کروائی تھیں جس میں انہوں نے کہا کہ انہیں بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی کے لیکچرار جنید حفیظ پر تضحیک مذہب کے مقدمہ کی سماعت کے دوران دھمکیاں دی گئی تھیں۔ ملزم نے انہیں سماعت میں دوبارہ پیش ہونے سے منع کیا تھا۔

پاکستان گزشتہ چند برسوں سے صحافیوں کے لیے غیر محفوظ ملک ہونے کے طور پر خبروں کی زینت بن رہا ہے۔ اگرچہ براہ راست حملوں اور ہلاکتوں میں کمی آئی ہے مگر دھمکیوں اور دخل اندازیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ مارچ میں، پاکستانی طالبان کے ترجمان نے ٹویٹر پر صحافیوں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ طالبان حملے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ جنوری میں ایک آدمی اس وقت زخمی ہوا جب نامعلوم حملہ آوروں نے دارالخلافہ میں اے آر وائی نیوز چینل کے دفتر پر دستی بم پھینکے اور فائرنگ کی۔

ستمبر میں، پشاور میں نامعلوم مسلح افراد نے جنگ گروپ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر عابد عبداللہ کو اغواء کر لیا۔ اغواء کاروں نے انہیں چند دن بعد رہا کر دیا تھا۔

حکومت کو اس وقت تنقید کا سامنا کرنا پڑا جب حکومت نے روزنامہ ڈان کے ساتھ

وابستہ صحافی سرل المیڈہ کا نام ایگزیکٹو کنٹرول لسٹ (ای سی ایل) میں ڈالا۔ المائدہ کا نام ای سی ایل میں اس لیے ڈالا گیا تھا کہ انہوں نے ملک کی سویلین اور فوجی حکومت کے درمیان ایک رازدارانہ اجلاس کے متعلق ایک خبر نشر کی تھی۔ اس اقدام سے پہلے کسی قسم کی تنبیہ نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی کوئی جواز پیش کیا گیا تھا اور المائدہ کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ دی گئی جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ بیرون ملک چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے۔ چند دنوں بعد پابندی اٹھا دی گئی تھی۔

طلباء یونین

ملک میں طلباء یونینوں پر پابندی کا سلسلہ جاری رہا۔ پاکستان میں طلباء یونینوں پر پابندی تین عشرے پرانی ہے۔ فوجی آمر ضیاءالحق کے دور کی باقیات ہے۔ تاہم، بعد میں بننے والی جمہوری حکومتیں بھی پابندی نہیں اٹھا سکیں یا وہ پابندی اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں تھیں۔ اگرچہ اس معاملے کو ہر سال پارلیمان میں زیر بحث لایا جاتا ہے مگر حکومت ان سفارشات پر عملدرآمد کرانے میں ناکام رہے جو اسے پیش کی گئیں۔ جنوری میں، سینٹ کی کمیٹی نے اسلام آباد میں طلباء یونین کی بحالی کے معاملے پر بحث کی۔ اس سے ایک ہفتہ قبل، سینٹ کے چیئرمین نے تعلیمی اداروں سے طلباء یونینوں پر پابندی کو 'غیر آئینی' قرار دیا اور معاملے کو کمیٹی کے سپرد کیا تھا۔ حکومت نے کمیٹی کو کہا تھا کہ اسے بعض ضوابط کے اطلاق کے بعد طلباء یونینوں کی بحالی پر کوئی اعتراض نہیں۔ عورتوں، اقلیتوں اور نوجوانوں کی سیاسی عمل میں شمولیت کے موضوع پر مارچ میں کراچی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملک میں طلبا یونینوں کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا۔ مقررین میں سول سوسائٹی کے نمائندے اور اراکین پارلیمان تھے جنہوں نے کہا کہ بچوں میں سیاسی شعور اور بصیرت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اوائل عمری سے سیاست کریں۔ اکتوبر میں، جماعت اسلامی کے طلباء ونگ جمعیت اسلامی نے دھمکی دی کہ اگر کے پی، حکومت طلباء یونینوں پر پابندی اٹھانے میں ناکام رہی تو وہ احتجاجی تحریک چلائیں گے۔ کے پی میں یہ پابندی تقریباً تین برسوں سے رائج ہے۔ جون میں، پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کے طلباء ونگ، پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے ایک موٹر سائیکل ریلی نکالی جو کہ ان کے مطابق تعلیمی اداروں میں طلباء یونینوں کی بحالی کی مہم کا حصہ تھی۔ طلباء یونینوں پر پابندی ہٹنے سے جمہوری ثقافت کو فروغ ملے گا۔

کالعدم تنظیمیں

نیشنل ایکشن پلان کے نفاذ کے 21 ماہ بعد، اکتوبر 2016ء میں، حکومت نے کالعدم گروہوں کے ساتھ وابستگی کے شبہ پر کئی افراد کی شہریت ختم کردی۔ ان کے قومی شناختی کارڈ بلاک کردیئے گئے اور بینکنگ کی سہولیات تک رسائی اور اراضی کی خرید وفروخت کے حق سے محروم کردیئے گئے۔

15 جنوری کو، قومی اسمبلی کے اجلاس میں، وزیر داخلہ نے بتایا کہ وزارت انفارمیشن وٹیکنالوجی نے نفرت انگیز مواد نشر کرنے یا کالعدم گروہوں سے تعلق رکھنے کی بنا پر 933 یوآر ایلز اور 10 ویب سائٹس بلاک کی ہیں۔ مزید برآں، نفرت انگیز مواد کا استعمال کرنے اور پھیلانے والوں کے خلاف پنجاب کے مختلف پولیس اسٹیشنوں میں، 2014ء میں 44 اور 2016ء میں 206 مقدمات درج کئے گئے۔

اگرچہ کراچی میں آپریشن جاری رہا، تاہم اہلسنت والجماعت (اے ایس ڈبلیو جے) جو کہ پہلے کالعدم گروہ سپاہ صحابہ کے نام سے جانی جاتی تھی، نے کراچی میں اپنے دفاتر میں عوام سے خیرات اکٹھا کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس بارے میں کوئی واضح ہدایات موجود نہیں تھیں کہ انسداد دہشت گردی ایکٹ (اے ٹی اے) کے چوتھے شیڈول میں ڈالی گئی تنظیموں اور گروہوں کی نگرانی کس طریقہ کار کے تحت کی جائے گی۔ چوتھا شیڈول اے ٹی اے کی ایک دفعہ ہے جس

مشتبہ شدت پسندوں نے کوئٹہ میں جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان (جے یو آئی۔ایف) کے ضلعی سربراہ مفتی احتشام الحق اوران کے بیٹے کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا

کے تحت ہر اُس فرد پر نظر رکھی جاتی ہے جس کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ دہشت گردی میں ملوث ہے۔ لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کا نام 2005ء میں اس فہرست میں ڈالا گیا تھا۔ تاہم، اس نے 2016 تک حکومت کے خلاف دھمکیاں دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ توہین رسالت کے مقدمے میں سزائے موت کی ملزمہ، ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی کی اکتوبر 2016ء میں، سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ میں سماعت کی گئی تو لال مسجد نے دھمکی دی کہ اگر آسیہ بی بی کو رہا کیا گیا تو مسجد حکومت مخالف تحریک کا مرکز بن جائے گی۔

سفارشات

1۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ عالمی لیبر تنظیم (آئی ایل او) کی دفعہ 189 گھریلو ورکرز کنونشن کی توثیق کرے اور ملک میں گھریلو ورکرز کی انجمن سازی کی آزادی کے حق کو تسلیم کرے۔

2۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اجتماع و انجمن سازی کی آزادی پر خصوصی رپورٹیئر کی پاکستان دورے کی درخواستوں کا جواب دے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ صحافی زمان محسود کے قتل اور انسانی حقوق کے کارکن عبدالواحد بلوچ کی گمشدگی کے حوالے سے خصوصی رپورٹیئر کے خدشات کا ازالہ کرے۔

3۔ طلباء یونین پر بے جا پابندی فوری طور پر ختم ہونی چاہیے۔ این جی اوز کو کام کرنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جائے۔ اگر ان کے خلاف کوئی الزامات ہیں تو انہیں یہ ثابت کرنے کا موقع دیا جائے کہ ان پر لگائے گئے الزامات جھوٹے ہیں اور یہ کہ وہ قانون کے دائرے میں رہ کر کام کر رہے ہیں۔

4
فروغ جمہوریت

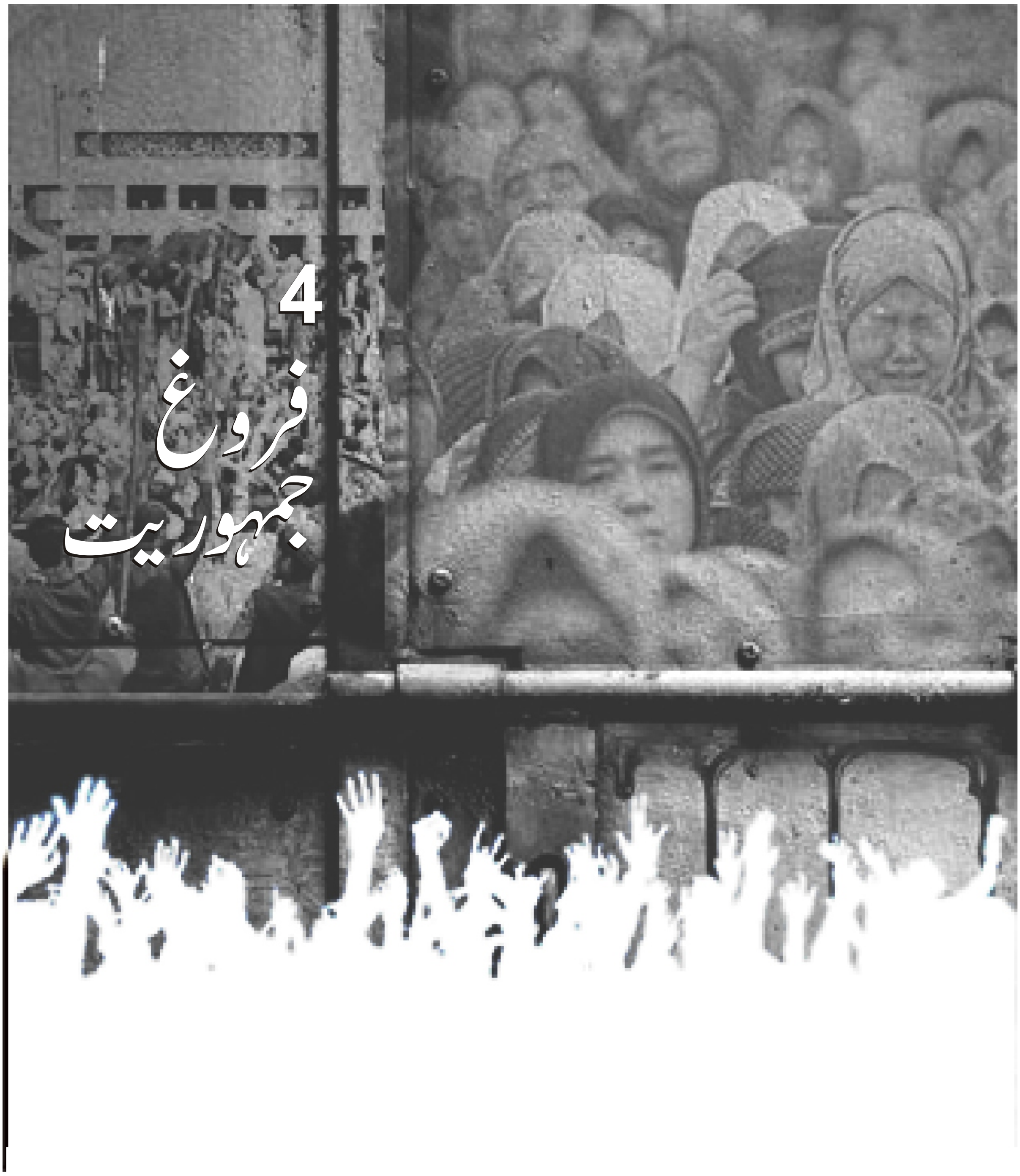

فروغِ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت

ریاست اپنے اختیارات،عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ آئین پاکستان

[دیباچہ]

جمہوریت،آزادی،مساوات،رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے،اس کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔ [دیباچہ]

بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت دی جائے گی جہاں تک کہ قانون اور اخلاق عامہ اس کی اجازت دیں۔ [دیباچہ]

ریاست علاقائی سطح پر منتخب نمائندوں کے ذریعے مقامی حکومت کے (بلدیاتی) اداروں کی حوصلہ افزائی کرے گی،اور ان (بلدیاتی) اداروں میں کسانوں،مزدوروں اور عورتوں کو خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

[آرٹیکل-32]

......یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے یقینی بنایا جائے،ورنہ انسان عاجز آ کر جبر واستبداد اور ظلم کے خلاف خود بغاوت پر مجبور ہو جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور

[ابتدائیہ]

تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوتی ہے۔انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔ [آرٹیکل-1]

1۔ ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طریقے سے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

2۔ ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔

3۔عوام کی مرضی حکومت کے اختیار واقتدار کی بنیاد ہوگی۔اس مرضی کے اظہار کے لیے متعین مدت کے بعد ایسے حقیقی انتخاب منعقد کرائے جائیں گے،جن میں عام اور مساوی حق رائے دہی کا استعمال خفیہ رائے شماری یا اس جیسے کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔

[آرٹیکل-21]

ہر شہری کو شق 2 میں مذکور کسی تفریق اور نامناسب پابندی کے بغیر درج ذیل آزادیاں اور مواقع حاصل ہوں گے۔

1۔مملکت کے امور میں براہ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ حصہ لینے کی آزادی اور مواقع

2۔مقررہ مدت میں ہونے والے ان انتخابات میں ووٹ ڈالنے یا منتخب ہونے کی آزادی اور مواقع،جو عام رائے شماری کی بنیاد پر یا خفیہ رائے شماری کے ذریعے ہوں گے اور جن میں رائے دہندوں کو آزادی کے ساتھ اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔

3۔مساوات کے عام اصولوں کی بنیاد پر اپنے ملک کی سرکاری ملازمت میں جانے کی آزادی اور مواقع۔

شہری وسیاسی حقوق کا عالمی میثاق

[آرٹیکل-25]

فریق ریاستیں اپنے اپنے ملک کی سیاسی اوراجتماعی زندگی کی سطح پرعورتوں کے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کے خاتمے اور تدارک کیلئے تمام موزوں اقدامات کریں گی اور بالخصوص مردوں کے ساتھ برابری کی بناء پرعورتوں کے حسب ذیل حقوق کویقینی بنائیں گی۔

(ا) تمام انتخابات اور رائے شماریوں میں رائے دینے کا حق اور انتخاب کے ذریعے قائم ہونے والے تمام اداروں کا انتخاب لڑنے کا حق،

(ب) سرکاری حکمت عملی کی تیاری اور تعمیل میں شریک ہونے، سرکاری عہدہ حاصل کرنے اور سرکاری سطح پر جملہ سرگرمیوں میں فرائض منصبی انجام دینے کا حق،

(ج) ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والی انجمنوں اور غیر سرکاری تنظیموں میں شرکت کرنے کا حق،

خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کی تمام شکلوں کے خاتمے کا میثاق

[آرٹیکل-7]

پاکستان کے آئین کے ابتدائیہ میں شہریوں کے اس حق کوتسلیم کیا گیا ہے کہ ان پر جمہوری طریقے سے حکومت کی جائے۔آئین کہتا ہے کہ 'ریاست اپنے اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے کرے گی'۔آئین اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ شہریوں کے ووٹ اور رائے کے ذریعے قوم کے جمہوری اور انتخابی عمل اور معاملات میں ان کی موثر شرکت کو یقینی بنایا جائے۔

2016ء میں چند حوصلہ افزا پیش رفتیں دیکھنے میں آئیں۔مثال کے طور پر سندھ اور پنجاب میں طویل عرصے سے زیرالتوا بلدیاتی انتخابات کا انعقاد کیا گیا، انتخابی فہرستوں کی تصحیح کی گئی، ووٹروں کا قومی دن منایا گیا، الیکشن بل کا مسودہ، جس کا مقصد انتخابی اصلاحات تھا اور وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) اصلاحات کمیٹی کی رپورٹ کومنظرعام پر لایا گیا۔سینیٹ نے عوامی اہمیت کے معاملات میں آن لائن پٹیشنیں، کُل ایوان کی کمیٹی (ایوان کے تمام اراکین پر مشتمل کمیٹی)، اور عوام کی شرکت کے لیے کھلی سماعتوں کے انعقاد جیسی پارلیمانی اصلاحات متعارف کرائیں۔[عوامی اہمیت کے معاملات میں ایوان کوکمیٹی (کُل ایوان کی کمیٹی) میں تبدیل کرنے کے لیے سینیٹ کے ضوابط میں ترمیم کی گئی اور کمیٹی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی شخص کی حاضری کا تقاضہ کرسکتی یا کسی بھی ڈویژن، شعبہ، خودمختار ادارہ، نیم خودمختار ادارہ یا تنظیم کو حاضر ہونے یا ان کو دستاویزات یا ریکارڈ پیش کرنے کا کہہ سکتی ہے یا حلف یا اقرار صالح کے موقع پر ایسے افراد کی جانچ کرنے، یا کسی بھی فرد کوزیرغور معاملے سے متعلق ثبوت پیش کرنے کے لیے مدعو یا طلب کرسکتی ہے]

حوصلہ شکن پیش رفتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے ،تو 2016ء کے دوران عوامی معاملات سرکاری جبر کا شکار رہے اور شہریوں کے آئینی طور پر تسلیم شدہ انجمن سازی (آرٹیکل 17) اور پرامن اجتماع (آرٹیکل 16) کے حق کو کئی موقعوں پر نقصان پہنچایا گیا۔ اسلام آباد میں رہائشی عمارات کے غیر موافق استعمال کا بہانہ بنا کر چار مرکزی سیاسی جماعتوں کے دفاتر سیل کر دیے گئے۔ سال کا سب سے زیادہ دہشت انگیز انکشاف یہ تھا کہ ایک کروڑ، سولہ لاکھ ستر ہزار خواتین کا نام ترمیم شدہ انتخابی فہرستوں میں موجود نہیں تھا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ فراہم نہیں کیے گئے تھے۔

اضافی پیش قدمیوں اور اتفاقی رکاوٹوں کا نتیجہ مندرجہ ذیل صورتوں میں نکلا:

- ☆ سب سے زیادہ آبادی والے صوبہ پنجاب اور دوسرے بڑے صوبہ سندھ میں 2013ء میں نئے لوکل گورنمنٹ قوانین وضع کیے گئے تھے جنہیں فعال ہونے میں تین سال کا عرصہ لگا۔
- ☆ انتخابی فہرستوں پر نظر ثانی کے باعث معلوم ہوا کہ ملک بھر میں صنفی تفاوت 12.52 فیصد کی شرح پر پہنچ گئی ہے، یعنی انتخابی فہرستوں میں 54.59 ملین مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد 42.42 ملین تھی۔
- ☆ قوم 2018ء میں انتخابات میں ووٹ ڈالنے جارہی ہے لیکن انتخابی اور فاٹا اصلاحات کو جائز قانونی دستاویزات کی شکل دینے کے لیے ان کی پارلیمان سے منظوری ہونا باقی ہے۔
- ☆ شہریوں کے انجمن سازی کے حق، خاص طور پر حقوق کے حوالے سے کسی قسم کی سیاسی حمایت اور پارلیمانی بحث دکھائی نہیں دی۔

مقامی حکومت: نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی میں تاخیر

''ہر صوبہ، قانون کے ذریعے، مقامی حکومت کا نظام قائم کرے گا اور سیاسی، انتظامی، اور مالیاتی ذمہ داری اور اختیار مقامی حکومت کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرے گا''۔

(پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 140۔الف)

برسوں کی جدوجہد اور بعد ازاں عدالتی محاذ آرائیوں کے بعد، 2016ء میں، مقامی حکومتیں پنجاب میں دسمبر تک اور سندھ میں اگست تک اپنے سربراہان سے محروم تھیں۔ بلوچستان،

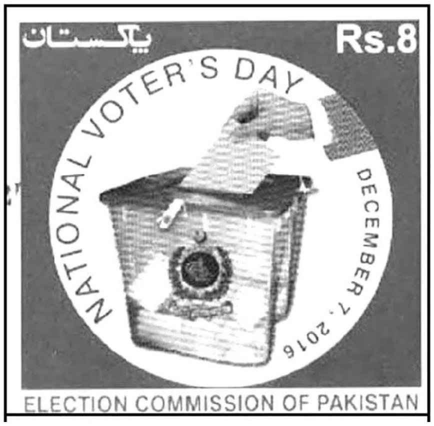

یادگاری ڈاک مہر

دارالحکومت اسلام آباد ، اور خیبرپختونخوا میں وسائل اور 42 کنٹونمنٹس میں اختیارات سے محروم تھیں جبکہ وفاق کے زیرِانتظام قبائلی علاقہ جات اور گلگت بلتستان میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

اعدادوشمار کے مطابق، چاروں صوبوں اور وفاقی دارالحکومت میں اس وقت مقامی حکومت کے 10,427 ادارے، 116 کونسلوں کے لیے پارٹی کی بنیاد پر منتخب ہونے والے 139,835 کونسلر، 4 میٹروپولیٹن کارپوریشنیں، 24 میونسپل کارپوریشنیں، 271 میونسپل کمیٹیاں، 148 ٹاؤن کمیٹیاں، 4 ٹاؤن کونسلیں، 73 تحصیل کونسلیں، 351 یونین کمیٹیاں، 5,893 یونین کونسلیں، 504 نیبرہڈ کونسلیں، 2,997 ویلج کونسلیں اور 42 کنٹونمنٹ بورڈ کام کررہے ہیں۔

اختیارات کی منتقلی/لامرکزیت سے متعلق دستیاب رپورٹس اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ مقامی سطح پر سہولیات کی موثر فراہمی کے ذریعے ہی شہریوں کی بہتر طور پر خدمت کی جاسکتی ہے کیوں کہ زیادہ تر شہریوں کی روزمرہ کی مرکزی کارروائیاں (جیسے کہ پانی کی فراہمی، نکاسی آب،

مقامی حکومتوں کو موثر وسائل اور خودمختاری سے محروم رکھا گیا

کوڑے کا انصرام، مارکیٹوں کا انتظام، نگہداشت صحت، بنیادی تعلیم وغیرہ) اسی سطح پر ہوتی ہیں۔ اس تجرباتی تعلق کا معیار شہریوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ملک کے نظم ونسق کے جمہوری طرائق کار پر بھروسا کریں۔ لیکن بدقسمتی سے، مقامی حکومتوں کو مناسب وسائل اور کام سے محروم رکھا جارہا ہے۔

توقع کی جاتی ہے کہ جماعتی بنیاد پر بننے والی پہلی مقامی حکومتیں سیاسی جماعتوں کو نچلی سطح پر منظّم ہونے اور سرگرم کا موقع بھی فراہم کریں گی۔ تاہم، صوبائی حکومتیں مقامی حکومتوں کو مناسب طور پر بااختیار بنانے میں تذبذب کا شکار دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ایگزیکٹیو مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کا عہدہ بحال کرتے ہوئے بیوروکریسی کے نوآبادیاتی ڈھانچے پر انحصار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

خواتین: انتخابی صنفی تفاوت کا شکار

جولائی میں ، الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) نے بائیسویں آئینی ترمیم (جون 2016ء میں) کی منظوری کے بعد ایک دوفریقی پارلیمانی کارروائی کے ذریعے اپنے چار نئے اراکین کا تقرر کیا۔ مذکورہ ترمیم کے بعد ای سی پی کے اراکین کے انتخاب کا دائرہ کار صرف ریٹائرڈ ججوں تک محدود نہیں رہا۔ سندھ کا ایک رکن ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہے۔ خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والی ایک ریٹائرڈ جج ارشاد قیصر نے ای سی پی کی پہلی خاتون رکن بن کر تاریخ رقم کی۔ یہ قدم ای سی پی میں سماج کے دونوں طبقوں کی شمولیت کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے۔

اکتوبر تا دسمبر 2016ء کے دوران، ای سی پی نے انتخابی فہرستوں کی تجدید کے لیے ایک مشق کا انعقاد کیا اور کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈز کی گھر گھر جا کر تصدیق کرنے کے بعد 4 2 لاکھ نئے ووٹروں کا اندراج کیا گیا۔ اموات اور دیگر نااہلیتوں کی وجہ سے تقریباً 140,000 ووٹروں کو فہرستوں میں سے خارج کیا گیا۔ اس مشق کے نتیجے میں رجسٹرڈ ووٹروں کی کل تعداد نو کروڑ ستر لاکھ بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ تاہم، ایک تشویشناک انکشاف یہ تھا کہ ملک کے تمام حصوں میں خواتین ووٹروں کی ایک بڑی تعداد کا انتخابی فہرستوں میں اندراج نہیں تھا۔ صنفی تفاوت فاٹا میں سب سے زیادہ 24 فیصد، بلوچستان میں 16 فیصد، خیبر پختونخوا میں 14 فیصد، پنجاب میں 12 فیصد اور سندھ میں 10 فیصد تھا۔ صنفی تفاوت اسلام آباد میں سب سے کم (آٹھ

فیصد) تھا۔ مرد ووٹروں کی تعداد پانچ کروڑ پینتالیس لاکھ نوے ہزار (56 فیصد) اور خواتین ووٹروں کی تعداد چار کروڑ چوبیس لاکھ بیس ہزار (44 فیصد) تھی۔ ای سی پی نے ایسے 26,000 مردم شماری بلاکس کی نشاندہی کی جہاں رجسٹرڈ خواتین ووٹروں کا تناسب 40 فیصد سے کم تھا۔

اس صنفی تفاوت کے خاتمے کے لیے ایک اہم پیش رفت مجوزہ الیکشن بل 2017ء میں دی گئی یہ تجویز تھی کہ ایسا کوئی بھی حلقہ انتخاب جہاں خواتین ووٹروں کا ووٹ ڈالنے کا تناسب 10-5 فیصد (یہ ایک متنازعہ تجویز ہے، مذہبی اقلیتیں 5 فیصد کے حق میں ہیں) سے کم ہو، وہاں انتخابات کو کالعدم قرار دیا جائے۔ ای سی پی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ خواتین ووٹروں کے اندراج میں اضافے کے لیے مثبت اقدامات کرے۔

ووٹروں کا قومی دن

7 دسمبر کو ملک میں ووٹروں کا قومی دن منایا گیا تا کہ شہریوں کو اس بات کی ترغیب دی جا سکے کہ وہ اپنا کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ بنوائیں اور بطور ووٹر اپنا اندراج کرائیں۔ نوجوان ووٹر توجہ کا بنیادی مرکز تھے۔ تاریخ کا انتخاب انتہائی اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ 7 دسمبر 1970ء کو پاکستانیوں کو آزادی کے 23 سال بعد پہلی مرتبہ رائے دہی بالغاں کا حق ملا تھا۔ ای سی پی اور سول سوسائٹی کی تنظیموں نے شہری اور ووٹر کی آگاہی مہمیں شروع کیں۔ ان تقریبات کی بنیادی خصوصیات ڈاک کی ایک یادگاری ٹکٹ کا اجراء، ووٹ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ایوان

مرد اور خواتین ووٹروں کے فرق میں اضافہ ہوا

صدر میں ایک عوامی تقریب اور ای سی پی کی جانب سے ووٹر کی آگاہی سے متعلق ضلعی کمیٹیوں کے ذریعے متعدد تقاریب کا انعقاد تھا۔

ان تقریبات کے دوران معذور ووٹروں کے لیے مناسب پولنگ اسٹیشنوں سے متعلق تحفظات کی نشاندہی کی گئی۔ سمندر پار پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے لیے، ای سی پی نے اسلام آباد میں اپنے سیکریٹریٹ میں سمندر پار ووٹنگ کا ڈائریکٹوریٹ قائم کیا تاکہ اس دیرینہ تصور کو حقیقت میں بدلنے کے لیے تحقیق اور فریقین سے مشورہ کیا جا سکے۔ ای سی پی نے وزارت خارجہ، سمندر پار پاکستانیوں اور نادرا کے تعاون سے ایک فرضی انتخابی مشق کا بھی انعقاد کیا۔ ڈاک کے ذریعے ووٹنگ اور ای میل / ٹیلی ووٹنگ کے دو مختلف طرائق کار کی آزمائش کی گئی۔ حتمی فیصلہ پارلیمانی کمیٹی برائے انتخابی اصلاحات پر چھوڑ دیا گیا۔

فاٹا اصلاحات

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) کے عوام کا نظام حکومت میں سیاسی طور پر بہت کم کردار ہے۔ انہیں 1997ء میں بالغ رائے دہی کے حق کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور 2011ء میں پولیٹیکل پارٹیز آرڈر 2002ء کا دائرہ فاٹا تک وسیع کیا گیا تھا۔ قومی اسمبلی میں اس علاقے سے تعلق رکھنے والے اراکین کی تعداد 12 اور سینیٹ میں 8 ہے۔ تاہم، امن و امان کی خراب صورتحال کے باعث قومی اسمبلی کا حلقہ 38 (وسطی کرم ایجنسی) 2013ء سے نمائندگی سے محروم ہے۔

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) کے لوگ ملک کے مرکزی سیاسی دھارے سے باہر رہے

فاٹا میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے شروع کیے گئے فوجی آپریشن ضرب عضب کے بعد نظم و نسق میں اصلاحات کے مطالبے نے زور پکڑا۔ وزیراعظم نے ایک پانچ رکنی فاٹا اصلاحات کمیٹی تشکیل دی جس میں فاٹا کا ایک بھی رکن شامل نہیں تھا۔ تاہم، کمیٹی نے قبائلی عمائدین سے مشورہ کیا تھا۔ کمیٹی نے ستمبر 2016ء میں پارلیمان کے دونوں ایوانوں میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ فاٹا کے قانون سازوں اور قبائلی عوام کی اکثریت نے کمیٹی کی فاٹا کے صوبہ خیبر پختونخوا میں انضمام سے متعلق سفارشات کی حمایت کی۔ اس رپورٹ کو مزید بحث اور مشاورت کے لیے عام کیا گیا ہے تاکہ اس کی سفارشات پر قومی اتفاق رائے پیدا کیا جاسکے۔

فاٹا اصلاحات کمیٹی کی جانب سے پیش کی گئیں چار تجاویز درج ذیل تھیں:

- ☆ موجودہ صورتحال کو برقرار رکھا جائے لیکن عدالتی/انتظامی اصلاحات متعارف کرائی جائیں اور ترقیاتی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دی جائے۔ نوآبادیاتی فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) 1901ء کو رواج ایکٹ سے تبدیل کیا جائے۔
- ☆ گلگت۔ بلتستان کی طرز پر فاٹا کونسل قائم کی جائے،
- ☆ فاٹا کا ایک الگ صوبہ قائم کیا جائے، اور
- ☆ فاٹا کو صوبہ خیبر پختونخوا میں ضم کیا جائے، ہر ایجنسی کو ضلع کا درجہ دیا جائے اور فرنٹیئر ریجنز (ایف آرز) کو یکجا کیا جائے۔

کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق، وسیع پیمانے پر ہونے والی مشاورتوں میں یہ بات سامنے آئی کہ فاٹا کے خیبر پختونخوا میں انضمام پر مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ تاہم، کرم، باجوڑ اور ایف آر پشاور کے سوا، قبائلی عمائدین فاٹا کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

انتخابی اصلاحات

پاکستان 2014ء سے جامع انتخابی اصلاحات کے لیے سرگرم ہے۔ انتخابی اصلاحات سے متعلق ایک 33 رکنی کثیر جماعتی پارلیمانی کمیٹی (پی سی ای آر) نے الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) میں اصلاح کے لیے مئی 2016ء میں اپنی پہلی رپورٹ پیش کی اور اس کے بعد جون 2016ء میں بائیسویں آئینی ترمیم منظور کی گئی تاکہ ای سی پی کے چار نئے مستقل اراکین کے تقرر کی راہ ہموار کی جاسکے۔

دسمبر میں، پی سی ای آر نے پارلیمان کو مزید سفارشات پیش کیں اور درخواست کی کہ مجوزہ انتخابی بل پر شہریوں کی تجاویز لی جائیں۔ یہ پارلیمان کی رہنمائی میں انتخابی اصلاحات کی پہلی کوشش ہے جس کا مقصد موجودہ نو انتخابی قوانین کو یکجا کرنا ہے۔ ان نو قوانین میں سے پانچ قوانین فوجی حکومتوں کی میراث ہیں جنہوں نے ملک کے انتخابی نظام کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پارلیمان نے شہریوں کو انتخابی نظام میں بہتری کے لیے اپنی تجاویز اور آراء جمع کرانے کے لیے 20 دن کا وقت دیا۔

مجوزہ انتخابی اصلاحات پیکیج میں کئی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ مذہبی اقلیتوں کے تحفظات کے بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے قانون سازوں کی 33 رکنی پی سی ای آر میں کوئی نمائندگی نہیں۔

سیاسی جماعتیں: مفادات کی ہم آہنگی کے تکثیری ذرائع

سیاسی جماعتوں کو 'جمہوریت کے بچے' کہا جاتا ہے۔ تاہم، آزادی اور مساوات، دلیل اور منطق کا فورم ہونے کے ناتے، وہ مفادات کی ہم آہنگی کا کردار ادا کرتی ہیں۔ پاکستان میں 334 سیاسی جماعتیں ای سی پی میں رجسٹرڈ ہیں۔ تاہم ان میں سے نصف سے زائد جماعتوں نے کبھی بھی انتخاب میں حصہ نہیں لیا۔ ان میں سے قومی اسمبلی میں اٹھارہ سیاسی جماعتوں کی نمائندگی ہے، جبکہ سات جماعتیں ایک ایک قانون ساز پر مشتمل ہیں۔ سینیٹ میں 13 سیاسی جماعتوں کی نمائندگی ہے جن میں سے تین جماعتیں ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہیں۔

2016ء میں پہلی مرتبہ ای سی پی نے غیر فعال سیاسی جماعتوں کے خلاف کارروائی کی اور ان جماعتوں کے نام شائع کیے جنہوں نے کبھی بھی اندرون پارٹی انتخابات منعقد نہیں کیے تھے یا جنہوں نے سالانہ آڈٹ شدہ کھاتے جمع نہیں کرائے تھے۔ سیاسی جماعتوں میں اندرونی جمہوریت کی صورتحال کافی خراب ہے۔ ای سی پی نے اس نظرانداز شدہ شعبہ کی نگرانی کے لیے اپنے سیاسی مالیات کے محکمہ کو بحال کر دیا ہے۔

جنوری میں، کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے گھر کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے کی بنا پر اسلام آباد میں حکمران جماعت، پاکستان مسلم لیگ۔ن ، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان مسلم لیگ۔ق کا دفتر سیل کر دیا۔ اس وقت سے یہ جماعتیں

اپنے قائدین کی رہائش گاہوں کو ہی استعمال کر رہی تھیں۔ کراچی میں گروہ بندی کا شکار متحدہ قومی موومنٹ کو بھی ایسی ہی صورتحال درپیش تھی۔

سفارشات

- ☆ انتخابی اصلاحات کا عمل تیز کیا جائے تاکہ الیکشن کمیشن آف پاکستان اور دیگر متعلقہ حکام کو ان پر عمل درآمد کے لیے خاطر خواہ وقت مل سکے۔
- ☆ فاٹا اصلاحات اکیسویں صدی کے جامع جمہوری اصولوں کے مطابق اور لوگوں کی حقیقی منشاء کی عکاس ہونی چاہئیں۔
- ☆ انتخابی فہرستوں میں پائے جانے والے وسیع صنفی تفاوت کو کم کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں۔
- ☆ منظّم جمہوری سیاسی جماعتیں فعال جمہوریت کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ انہیں سازگار ماحول فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنا کردار موثر طور پر ادا کر سکیں۔

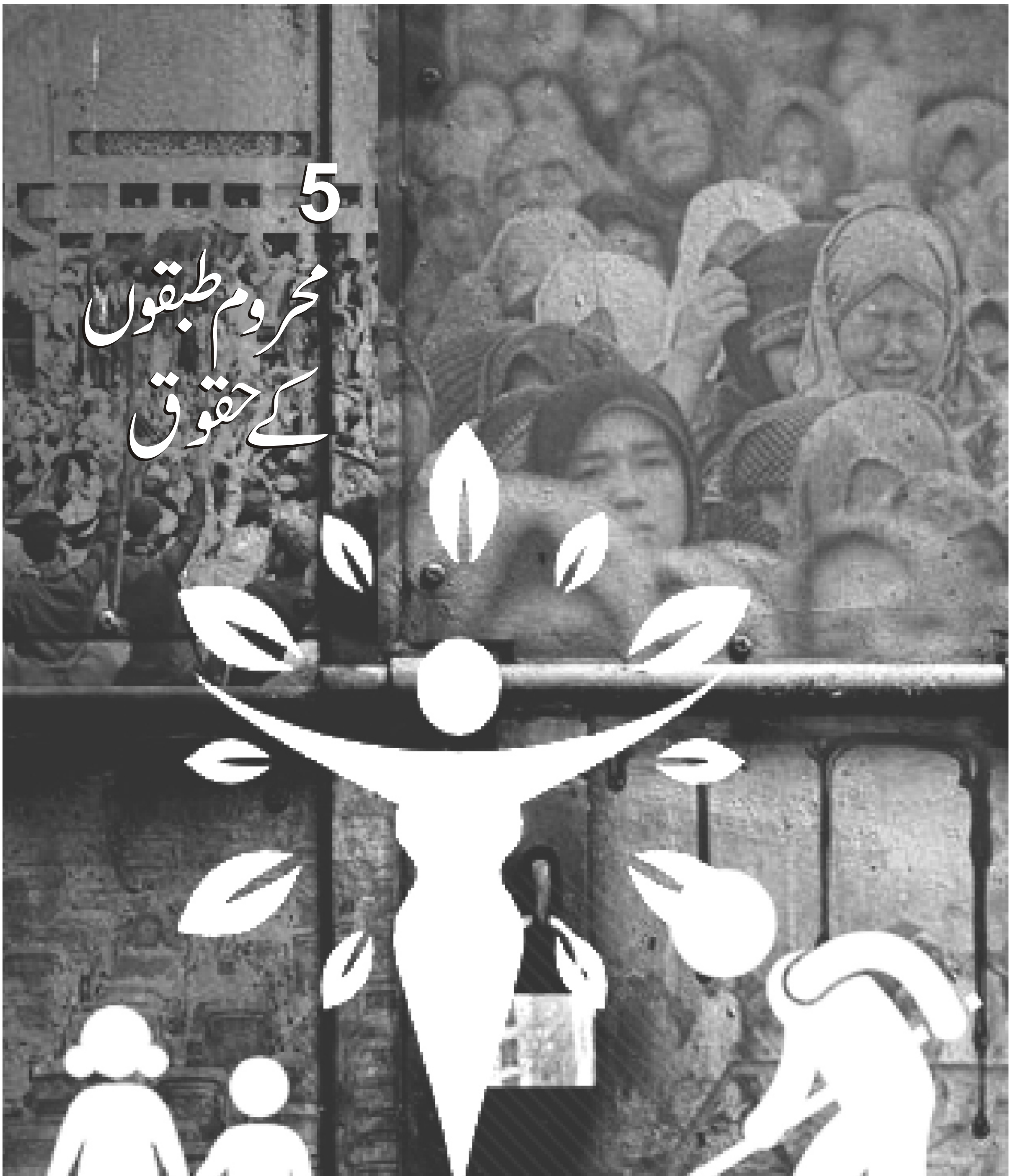
5
محروم طبقوں
کے حقوق

محروم طبقوں کے حقوق

خواتین

تمام شہری قانون کے روبرو، مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں، محض جنس کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔
کسی بھی شہری کو، جو پاکستان کی سروسز میں تقرری کی اہلیت رکھتا ہے، محض جنس کی بنا پر اسے تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔
قومی زندگی کے تمام شعبوں میں، خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ ریاست، ازدواجی زندگی، خاندان اور ماں کو تحفظ فراہم کرے گی۔
ریاست اس بات کو یقینی بنائے گی کہ خواتین کو ان شعبوں میں ملازم نہ رکھا جائے جو ان کی جنس سے مطابقت نہیں رکھتے۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل نمبر 25-27-35-37]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے سلسلے میں مساویانہ حیثیت کے حامل ہیں۔
اس اعلان میں جن آزادیوں اور حقوق کا ذکر ہے، ہر انسان ان پر بغیر کسی قسم کی تفریق کے حق رکھتا ہے۔
تمام انسان قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے، مساویانہ قانونی تحفظ کے مستحق ہیں۔
ہر بالغ مرد اور عورت، شادی کے دوران اور شادی کے خاتمہ کے سلسلے میں مساویانہ حقوق رکھتا ہے۔
شادی مرد و زن کی آزادانہ اور مکمل رضا مندی کے مطابق طے پانی چاہیے۔
ہر فرد کو اپنے ملک کی پبلک سروس تک مساویانہ رسائی کا حق حاصل ہے۔
ماں اور بچہ خصوصی سلوک اور مدد کے مستحق ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل 1-2-7-16-21(2)-25(2)]

پاکستان کی جانب سے خواتین کے خلاف ہر قسم کے تشدد کے خاتمے کے میثاق (سیڈا) کی منظوری کے دو دہائیوں بعد بھی، معاشرہ اور ریاست اور غیر ریاستی عناصر خواتین کے حقوق پامال کرتے رہے اور ملک میں صنفی عدم امتیاز اور عدم مساوات کی ثقافت پروان چڑھتی رہی۔

2016ء میں بھی حکومت نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے انسدادی اقدامات کی نسبت حفاظتی اقدامات پر زیادہ توجہ دی۔ خواتین کو اپنی صلاحیتوں کے مکمل اظہار کے قابل بنانے کے لیے بہت کم اقدامات کیے گئے۔ اگرچہ ملک میں خواتین کے تحفظ کے نظام کو مستحکم بنانے کے لیے قانون سازی سے متعلق کئی پیش رفتیں ہوئیں تاہم خواتین کے خلاف تشدد کے

واقعات میں کوئی نمایاں کمی نہیں دیکھی گئی۔ ماں کی صحت سے متعلق مسائل برقرار رہے۔ خواتین تعلیم میں بھی پیچھے رہیں اور انہیں معاشی آزادی کے حصول کے لیے بہت کم مواقع میسر آئے۔

انیسویں سالانہ رپورٹ، جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی: جنوبی ایشیا میں خواتین کی خودمختاری، کے مطابق انسانی ترقی برائے خواتین کے گوشوارے (ایچ ڈی آئی) میں جنوبی ایشیا پوری دنیا میں نیچے سے دوسرے نمبر پر تھا، اور اس کی درجہ بندی صرف صحارا کے ذیلی افریقی ممالک سے بہتر تھی۔ نومبر 2016ء میں شائع ہونے والی اس رپورٹ میں مشاہدہ کیا گیا کہ اگرچہ گزشتہ 15 سالوں میں پاکستان اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک میں صورتحال مجموعی طور پر بہتر ہوئی تاہم محدود معاشی اور سیاسی مواقع اور انصاف تک رسائی خواتین کی ترقی میں رکاوٹ بنے رہے۔ دیرینہ قبائلی روایات اور منظم عدم مساوات کئی محاذوں پر خواتین کی ترقی میں رکاوٹ بنی رہیں۔

معاشی اور سیاسی حقوق (مواقع اور مشکلات)

1996ء میں سیڈا کی توثیق کرتے ہوئے، پاکستان نے ہر سطح پر مردوں اور خواتین کی برابری کو یقینی بنانے اور خواتین کے خلاف ہر قسم کے تشدد کے خاتمے کا عہد کیا تھا۔ تاہم ملک ایسا کرنے میں ناکام رہا اور گزشتہ سال کی طرح 2016ء میں بھی صنفی مساوات کے گوشوارے میں 144 ممالک میں 143ویں نمبر پر رہا۔ عالمی معاشی فورم (ڈبلیو ای ایم) کی 25 اکتوبر 2016ء، کو شائع ہونے والی عالمی صنفی تفاوت کی رپورٹ 2016ء کے مطابق صنفی مساوات کے لحاظ سے پاکستان دنیا نیچے سے دوسرے اور جنوبی ایشیا میں سب سے آخری نمبر پر تھا۔ 2006ء میں رپورٹ کے پہلے ایڈیشن کے مطابق پاکستان 112ویں نمبر پر تھا اور اس کے بعد سے اس کی درجہ بندی ہر سال گرتی رہی۔ 2013ء میں یہ 135ویں، 2014ء میں 141ویں اور 2015ء میں 143ویں نمبر پر تھا۔

صنفی مساوات اور خواتین کی خودمختاری سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے (یو این ویمن) نے 18 مئی 2016ء کو خواتین کے حقوق سے متعلق قومی کمیشن کے تعاون سے خواتین کی معاشی شرکت اور خودمختاری کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی۔ رپورٹ کے حقائق زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ افرادی قوت میں 15 سے 64 سال کی عمر کی خواتین کا تناسب 26 فیصد یعنی تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ تھا اور کسی بھی صنعت یا شعبے میں ملازمت کرنے والی خواتین کا تناسب 30 فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ 30 فیصد گریجوایٹ خواتین کی ماہانہ تنخواہ 10,000 روپے

عالمی معاشی فورم کی جنسی تفاوت کی عالمی رپورٹ 2016ء کے مطابق پاکستان جنسی برابری کے حوالے سے سب سے پیچھے رہ جانے والے ممالک میں دوسرے نمبر پر تھا اور جنوبی ایشیا میں سب سے پیچھے تھا

تھی جو کہ حکومت کی مقرر کردہ کم از کم ماہانہ اجرت سے بھی کم ہے، جبکہ مردوں میں یہ تناسب 10 فیصد تھا۔ اس کے علاوہ، غیر رسمی شعبے میں 77 فیصد کی ماہانہ تنخواہ 10,000 روپے تھی، جبکہ اس کے مقابلے میں مردوں میں یہ تناسب 42 فیصد (2013-14 میں) تھا۔ پاکستان میں مردوں کی اجرت خواتین کی نسبت 71 فیصد زیادہ ہے۔

مذکورہ رپورٹ کے ساتھ پاکستان کا پہلے خواتین کی معاشی خودمختاری کا گوشوارہ بھی شائع کیا گیا جو کہ اس نوعیت کا پہلا ملکی گوشوارہ ہے۔ یہ گوشوارہ افرادی قوت، تعلیم، فیصلہ سازی، صحت، تشدد اور سیاسی شرکت کے لحاظ سے خواتین کی ضلع وار اور صوبہ وار صورتحال کا اندازہ لگاتا ہے۔ 1 اسکور سے مراد مکمل معاشی خودمختاری اور صنفی مساوات ہے جبکہ صفر کے قریب اسکور شدید عدم مساوات اور خواتین کی کمزور معاشی خودمختاری کو ظاہر کرتا ہے۔ گوشوارے کے مطابق پنجاب نے سب سے اچھی کارکردگی دکھائی اور اس کا اسکور 0.52 رہا جبکہ سندھ کا اسکور 0.38، خیبر پختونخوا کا 0.35 اور بلوچستان کا اسکور 0.26 رہا۔ ملک کا مجموعی اسکور 0.39 رہا۔ خواتین کی معاشی خودمختاری کے لحاظ سے زیادہ تر اضلاع کا اسکور 0.50 سے کم رہا۔ یہ انتہائی پریشان کن صورتحال ہے، خاص طور پر اس لیے کہ آئین پاکستان کا آرٹیکل 38 جنس سے قطع نظر مساوی معاشی مواقع کے حق کی ضمانت دیتا ہے اور حکومت کا وژن 2025ء اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ملک کی مجموعی سماجی اور معاشی ترقی کے لیے خواتین کی شرکت میں اضافہ اور مواقع تک رسائی انتہائی ضروری ہے۔

خواتین کی تعلیم کی شرح مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کم رہی۔ پاکستان عالمی تحریک 'تعلیم سب کے لیے' (ای ایف اے) کا حصہ تھا، جس کا بنیادی ہدف 2015ء تک پرائمری اور ثانوی تعلیم میں صنفی عدم مساوات کا خاتمہ تھا۔ پاکستان اس ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہا اور مردوں اور خواتین کی شرح خواندگی میں ایک بہت بڑا فرق برقرار رہا۔ پنجاب کی صنفی مساوات سے متعلق رپورٹ 2016ء نے خواندہ مردوں کے مقابلے میں خواندہ خواتین کی شرح 0.724 ریکارڈ کی۔ رپورٹ میں مشاہدہ کیا گیا کہ پنجاب میں بالغوں کی شرح خواندگی میں خواتین کا تناسب 50 فیصد جبکہ مردوں کا 69 فیصد تھا اور خواندہ مردوں اور خواندہ خواتین کا تناسب جنوبی اضلاع کی نسبت شمالی اضلاع میں بہتر تھا۔ راجن پور، جھنگ، چنیوٹ، خوشاب اور ڈیرہ غازی خان میں یہ تناسب کم ترین تھا۔ اقوام متحدہ کی عالمی تعلیمی نگرانی سے متعلق رپورٹ 2016ء کے مطابق غریب دیہی خواتین کی شرح خواندگی مردوں کے مقابلے میں انتہائی کم تھی۔ خواتین میں یہ شرح 14 فیصد اور مردوں میں 64 فیصد تھی۔ یونیسکو کی رپورٹ 'تعلیم میں صنفی عدم مساوات کا خاکہ' بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اب بھی سب سے پہلے لڑکیوں کو ہی تعلیم کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں مڈل اسکول جانے کی عمر کی دو کروڑ نوے لاکھ یا 53 فیصد نوعمر لڑکیاں اسکول سے باہر ہیں، جبکہ اس کے مقابلے میں لڑکوں میں یہ شرح دو کروڑ تیس لاکھ (43 فیصد) ہے۔

سندھ میں خواتین کی خودمختاری کے فروغ اور معیاری تعلیم کی فراہمی کے لیے سکھر میں مارچ 2016ء میں ایک یونیورسٹی کے قیام کے لیے 50 ایکڑ زمین اور نو کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی۔

بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام جائزہ رپورٹ 2016ء نے خواتین کی غربت کی شرح میں بہتری کی نشاندہی کی۔ رپورٹ کے مطابق غربت میں 7 فیصد اور غربت کے فرق میں 3 فیصد کمی آئی۔ اس پروگرام سے مستفید ہونے والے ایسے گھرانے جو کئی لحاظ سے غریب ہیں، ان کی شرح بھی 2013ء سے 2016ء کے دوران 8 فیصد کم ہو کر 23 فیصد رہ گئی۔ اس جائزے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس پروگرام سے مستفید ہونے والی ایسی خواتین جو اکیلے بازار جا سکتی ہیں، ان کی شرح گزشتہ پانچ سالوں کے دوران بڑھ کر 37 فیصد ہو گئی۔

2016ء کے دوران متعدد خواتین نے سرکاری عہدوں کے حصول کے حوالے سے

بھی اچھی کارکردگی دکھائی۔ عمارہ عامر خٹک، جنہوں نے اس سے پہلے ہزارہ میں بطور ایڈیشنل کمشنر خدمات انجام دی تھیں، فروری میں ایبٹ آباد کی ڈپٹی کمشنر بنیں۔ خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والی ریٹائرڈ جج ارشاد قیصر نے چیف الیکشن کمشنر سردار محمد رضا اور دو سینیئر اراکین کی غیر حاضری میں، ملک کی پہلی خاتون چیف الیکشن کمشنر کے طور پر نومبر میں عہدہ سنبھالا۔ دسمبر میں عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کی رکن ستارہ ایاز کو خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد پر قومی ایوارڈ برائے انسانی حقوق سے نوازا گیا۔ انہوں نے خیبر پختونخوا میں پہلی خاتون وزیر کے طور پر، اپنی مدت کے دوران خواتین کی حمایت میں متعدد قوانین منظور کرائے۔ وہ اس وقت سینیٹر کے طور پر کام کر رہی ہیں اور سینیٹ کی کمیٹی برائے انسانی حقوق کی رکن بھی ہیں۔

قانونی اور سیاسی میدان

اپریل 2016ء میں سندھ میں مقامی کونسلوں میں مخصوص نشستوں پر خواتین کی نمائندگی بڑھا کر 33 فیصد اور نوجوانوں، مذہبی اقلیتوں، اور مزدوروں اور کسانوں کی نمائندگی پانچ فیصد کردی گئی۔ یہ ترمیم سندھ لوکل گورنمنٹ (دوسرا ترمیمی) بل 2016ء کے ذریعے کی گئی۔ متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کی رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر نکہت شکیل نے وفاقی کابینہ میں خواتین کے لیے 17 فیصد کوٹہ رکھنے کی تجویز دی جسے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف نے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ صنف کی بنیاد پر خصوصی کوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔

اس سال مختلف فورمز پر اعلیٰ عدلیہ میں خواتین کی شمولیت بڑھانے پر زور دیا گیا۔ سینیٹر بابر اعوان نے مئی میں سپریم کورٹ میں خواتین ججز کے لیے 33 فیصد کوٹہ مختص کرنے کے لیے سپریم کورٹ (ججز کی تعداد) ایکٹ 1997ء میں ترمیم کا مطالبہ کیا۔ تاہم، پاکستان بار کونسل (پی بی سی) کی انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ یہ بل سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف کے پاس زیر التوا رہا اور وفاقی حکومت نے اسے آگے لے جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ ایچ آر سی پی نے بھی 5 مئی کی ایک پریس ریلیز میں عدلیہ میں خواتین کی مایوس کن حد تک کم نمائندگی پر افسوس کا اظہار کیا۔ ایچ آر سی پی کا کہنا تھا کہ سپریم کورٹ کے اور صوبائی ہائی کورٹس کے کل 130 ججوں میں خواتین کی تعداد صرف 7 تھی۔ اسلام آباد ہائی کورٹ میں ایک بھی خاتون جج نہیں اور خواتین ججوں کی سب سے زیادہ تعداد لاہور میں تین جبکہ پشاور ہائی کورٹ میں 2، اور بلوچستان اور سندھ ہائی کورٹ میں بالترتیب ایک ایک ہے۔ ایچ آر سی پی

نے مشاہدہ کیا کہ قیام پاکستان سے لے کراب تک صرف ایک خاتون سپریم کورٹ بار کونسل کی صدر بن سکی۔

کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ کل رجسٹرڈ ووٹروں میں خواتین کا تناسب 44 فیصد اور مردوں کا 56 فیصد ہے۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی جائزہ رپورٹ 2016ء میں کہا گیا ہے کہ پروگرام کے تحت کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کی فراہمی کے ذریعے 54 لاکھ خواتین ووٹروں کو انتخابی فہرست میں شامل کیا گیا۔ 2011ء میں اس پروگرام سے مستفید ہونے والے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی صرف 40 فیصد خواتین کا یہ کہنا تھا کہ وہ ممکنہ طور پر ووٹ ڈالیں گی۔ 2016ء میں یہ تناسب 70 فیصد ہو گیا۔ مارچ میں، الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) نے پہلا صنف اور معذوری سے متعلق ورکنگ گروپ (جی ڈی ای ڈبلیو جی) تشکیل دیا تا کہ انتخابی عمل میں خواتین اور خصوصی افراد کی نمائندگی بڑھانے کے طریقے اور ذرائع تجویز کیے جاسکیں۔ جی ڈی ای ڈبلیو جی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ موجودہ قوانین میں تبدیلیاں اور انتخابی عمل میں خواتین کی بطور ووٹر، امیدوار اور انتخابی منتظم اور معائنہ کار شرکت میں اضافے کے لیے ایک نیا قانون تجویز کرے۔

ادارہ ترقی قانون سازی و شفافیت پاکستان (پلڈاٹ) کی جانب سے 18 اکتوبر 2016ء کو انفرادی پارلیمانی کارکردگی سے متعلق جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق تیسرے پارلیمانی سال کے دوران بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے 14 اراکین قومی اسمبلی میں سے نو خواتین تھیں۔ اس رپورٹ نے اسمبلیوں کے اراکین کے کردار کی نگرانی، قانون سازی اور نمائندگی کی بنیاد پر جائزہ لیا۔ رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ خواتین اراکین پارلیمان نے اپنے مرد ساتھیوں کی نسبت کہیں زیادہ بہتر کارکردگی دکھائی۔

صحت

اگرچہ 2004ء سے 2015ء کے دوران خواتین کی متوقع عمر 4 سال بڑھ کر 67.3 ہوگئی تاہم زیادہ تر اموات قابل انسداد بیماریوں کی وجہ سے ہوئیں۔ زچہ کی صحت کی دیکھ بھال کی ناقص سہولیات ملک میں حاملہ خواتین اور لڑکیوں کی موت کا بنیادی سبب تھا۔ 2015ء میں پاکستان میں ایک لاکھ زندہ پیدائشوں کے دوران 276 ماؤں کی موت واقع ہوئی جس کے نتیجے میں ماؤں کی شرح اموات کا گوشوارہ دو پوائنٹ کم ہوکر 149 رہ گیا۔ بلوچستان میں ماؤں کی

شرح اموات سے سب زیادہ رہی جہاں ایک لاکھ زندہ پیدائشوں کے دوران 700 سے زائد ماؤں کی موت واقع ہوگئی۔ اس سال بلوچستان میں نومولود بچوں اور بچوں کی صحت سے متعلق پانچ سالہ حکمت عملی (ایم این سی ایچ) 20-2016 کی بنیاد رکھی گئی لیکن اسے بجٹ سے متعلق رکاوٹوں کا سامنا رہا۔

مارچ 2016ء میں نیشنل ہیلتھ سروسز، ریگولیشن اینڈ کوآرڈینیشن (این ایچ ایس آر سی) کی وفاقی وزارت نے ماؤں، نوزائیدہ بچوں اور بچوں کی صحت کے لیے ایک دس نکاتی قومی ایکشن پلان تیار کیا۔ اس منصوبے کا مقصد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والی خواتین کے لیے ہیلتھ انشورنس اور ماؤں کی صحت کی سہولیات سے متعلق ایک خصوصی پیکج کی فراہمی تھا۔ جون 2016ء میں این ایچ ایس آر سی نے پاکستان نیوٹریشن پروگرام کی بھی منظوری دی جس کا مقصد نوعمر لڑکیوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کی غذائیت کی صورتحال کو بہتر بنانا تھا۔ ملک میں غذائیت کے بحران کے باوجود، سال کے آخر تک یہ پروگرام منصوبہ بندی کمیشن کی منظوری کا منتظر رہا۔

سندھ ہائی کورٹ میں دائر کی گئی ایک پٹیشن میں کہا گیا کہ ملک میں ہر سال 5,000 خواتین میں زچگی کے دوران پھوڑا (آبسٹیٹرک فِسٹولا) بن جاتا ہے اور ان میں سے 1,500 کے قریب کیسز کا تعلق سندھ سے ہے۔ آبسٹیٹرک فِسٹولا برتھ کینال اور بڑی آنت یا مثانہ کے درمیان ایک سوراخ ہوتا ہے جو پیشاب یا پاخانہ کے مسلسل اور بے قابو بہاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایسا ہسپتالوں میں زچگی سے متعلق صحت کی سہولیات کے فقدان اور کم عمر میں زچگی کے

ملک میں حاملہ خواتین اور لڑکیوں کی موت کا ایک بڑا سبب ماؤں کو صحت کی سہولیات کی عدم دستیابی تھی

باعث ہوتا ہے۔ ایک دہائی سے زیادہ عرصہ پہلے ماؤں، نومولود بچوں اور بچوں کی صحت کی دیکھ بھال کا پروگرام متعارف کرایا گیا تھا جس کا مقصد ہر ضلع کی سطح پر ماؤں اور نومولود بچوں کی نگہداشت وصحت کی سہولیات کو بہتر بنانا اور زچگی سے متعلق نگہداشت کی 24 گھنٹے ہنگامی سہولیات فراہم کرنا تھا، لیکن اس پالیسی پر عمل درآمد کے لیے بہت کم اقدامات کیے گئے۔ سندھ میں حاملہ ماؤں کو خون کی کمی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ وائٹ ربن الائنس نے آگہی پیدا کرنے اور لڑکیوں اور خواتین کو رہنمائی فراہم کرنے کے لیے دسمبر میں 'سندھ میں ماؤں میں خون کی کمی کی علامت' نامی مہم شروع کی۔

پائیدار ترقیاتی اہداف کے ہدف نمبر 3 کے حصول کی جانب پیش قدمی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے نومبر میں پاکستان بھر کے 14 اضلاع میں ماؤں اور بچوں کی صحت سے متعلق ایک منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس منصوبے کا مقصد بلوچستان، جنوبی پنجاب، اور سندھ کے بڑی حد تک دیہی اضلاع اور کراچی کی شہری کچی آبادیوں میں مراکز صحت میں دیکھ بھال کے معیار کو بہتر بنانا تھا۔

انصاف تک رسائی اور قوانین میں تبدیلیاں

2016ء میں نئے قوانین منظور کیے گئے جن پر اگر عمل درآمد کیا جائے تو وہ خواتین اور لڑکیوں کے تحفظ کے نظام کو انتہائی مضبوط بنا سکتے ہیں۔

قومی سطح پر، تین قوانین وضع کیے گئے جن کے تحت ہندوؤں کی شادیوں کو قانون کے دائرے میں لایا گیا، اور جنسی زیادتی اور غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم سے متعلق دفعات میں اصلاح کی گئی۔ ستمبر میں، قومی اسمبلی نے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قانون وانصاف کی منظوری کے کئی ماہ بعد ہندو میرج ایکٹ 2016ء کی منظوری دی۔ یہ ایکٹ ہندو شہریوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنی شادیوں کا اندراج کرائیں اور شادی کی دستاویز حاصل کریں جو شادی پرت کہلاتی ہے۔ نئے قانون میں شدی کی کم از کم عمر 18 برس مقرر کی گئی اور خلاف ورزی کی صورت میں چھ ماہ قید اور 50,000 روپے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ نیا قانون ہندو خواتین کو بھی اپنے خاوند کی موت کے چھ ماہ بعد دوبارہ شادی اور لاپرواہی برتنے، بیک وقت دو بیویاں رکھنے اور 18 سال سے کم عمر میں شادی ہونے کی بنیاد پر طلاق لینے کی اجازت دیتا ہے۔ اکتوبر 2016ء میں قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں غیرت کے نام پر قتل کے خلاف

قوانین (فوجداری ترمیمی بل) اور جنسی زیادتی کے خلاف قوانین (فوجداری ترمیمی بل) 2015ء کے عنوان سے دو قوانین منظور کیے گئے۔ پہلا قانون کہتا ہے کہ کوئی شخص جو غیرت کے نام پر قتل کا قصوروار پایا جائے، عمر قید (25 سال) کی سزا کا مستوجب ہوگا چاہے متاثرہ فرد کا خاندان مجرم کو معاف ہی کیوں نہ کر دے۔ دوسرا قانون، جنسی زیادتی کے خلاف قانون، جنسی زیادتی کو ثابت کرنے کے لیے ڈی این اے شواہد کے حصول اور اس کے استعمال کو قانونی تحفظ دیتا ہے۔ یہ سخت تحقیقاتی طریق ہائے کار تجویز کرتا ہے اور اگر کوئی افسر تندہی سے تحقیقات نہیں کرتا تو وہ تین سال قید، جرمانے، یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہوگا۔ نیا قانون یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کوئی بھی شخص کسی کم سن بچے یا ذہنی یا جسمانی طور پر متاثرہ فرد کے ساتھ جنسی زیادتی کرتا ہے یا کوئی سرکاری افسر، جیسے کہ پولیس افسر، جیلر یا میڈیکل افسر جنسی زیادتی کا ارتکاب کرنے کے لیے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا ہے تو وہ سزائے موت یا عمر قید کا مستوجب ہوگا۔ متاثرین اور گواہان بذات خود سماعت کے لیے حاضر ہونے کے پابند نہیں ہیں بلکہ وہ آڈیو-ویڈیو ذرائع کے ذریعے حاضر ہو سکتے ہیں اور میڈیا کی جانب سے متاثرہ فرد کا نام یا اس سے متعلق کسی بھی قسم کی معلومات شائع کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

فروری میں، سندھ اور پنجاب دونوں نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے دو قوانین منظور کیے۔ 29 فروری کو پنجاب اسمبلی نے پنجاب کا خواتین کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے کا بل (پی پی ڈبلیو اے وی اے) منظور کیا۔ پنجاب وہ تیسرا صوبہ تھا جس نے گھریلو تشدد کی ممانعت کا قانون منظور کیا۔ یہ قانون خواتین کے خلاف ہر قسم کے تشدد، بشمول جنسی، جذباتی، معاشی اور جسمانی زیادتی، سائبر جرائم، تعاقب اور مجرموں کو ترغیب دینے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ قانون ایسے ضلعی حفاظتی مراکز کے قیام کی تجویز دیتا ہے جو متاثرین کو دن رات ایک ہی چھت تلے ابتدائی طبی امداد، پولیس رپورٹنگ، ایف آئی آر کا اندراج، استغاثہ، طبی معائنہ، فارنزک ٹیسٹ اور ذہنی صدمے کے بعد بحالی جیسی سہولیات فراہم کریں۔ یہ قانون نفاذ کی نگرانی اور خواتین کو تحفظ فراہم کرنے والے افسران کے تقرر کے لیے خواتین کے تحفظ سے متعلق کمیٹیوں کے قیام کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ مذکورہ افسران تحفظ سے متعلق خدمات انجام دیں گے۔ 15 اکتوبر کو سندھ اسمبلی نے ہندو میرج ایکٹ 2016ء منظور کیا۔ یہ قانون ہندوؤں، بدھ مت، جین اور سکھوں کی شادی کا طریقہ کار اور شرائط واضح کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت شادی کی کم از کم عمر 18 سال مقرر کی گئی ہے۔ اس قانون کے تحت شادی شدہ جوڑوں پر یہ لازم ہے کہ وہ 45 دن کے اندر دو گواہوں کی

موجودگی میں اپنی شادی کا اندراج کرائیں۔ اگر اس قانون کا مناسب طور پر نفاذ کیا جائے تو یہ جبری اور کم عمری کی شادیوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے۔

سندھ اسمبلی نے خواتین کے حقوق سے متعلق صوبائی کمیشن کے قیام کے لیے اپریل 2015ء میں ایک قانون منظور کیا تھا۔ تاہم 2016ء کے آخر تک یہ کمیشن قائم نہ کیا جاسکا۔ اگست 2016ء میں ایک سوال کے جواب میں صوبائی حکومت نے سندھ ہائی کورٹ کو بتایا کہ دو ماہ کے اندر ایک 21 رکنی صوبائی کمیشن قائم کیا جائے گا، لیکن سال کے آخر تک یہ کمیشن قائم نہ ہوسکا۔

21 اکتوبر کو، خواتین کے حقوق سے متعلق خیبر پختونخوا کمیشن بل 2016ء منظور کیا گیا۔ اس قانون نے خواتین کے حقوق سے متعلق کمیشن کے قیام کے ایکٹ (ای سی ایس ڈبلیو اے) 2009ء کی جگہ لی۔ سول سوسائٹی 2009ء کے قانون سے مطمئن نہیں تھی، اس لیے اس نے کمیشن کو زیادہ بااختیار بنانے کے لیے تبدیلیوں اور اس کے چیئرپرسن اور اراکین کے تقرر کے طریقہ کار کو شفاف بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ کمیشن کی بنیادی ذمہ داریاں وہی رہیں جو سابقہ قانون میں تھیں اور تبدیلیوں کا زیادہ تر تعلق کمیشن کی ترکیب اور اس کے مالی اختیارات سے تھا۔ نئے قانون کے تحت، کمیشن کا پشاور میں ایک مستقل سیکریٹریٹ ہوگا اور چیئرپرسن کا درجہ اکیسویں اسکیل کے سرکاری افسر کے برابر ہوگا۔ دوبارہ تشکیل دیا گیا کمیشن چیئرپرسن سمیت 15 سرکاری اور غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہوگا جن کا نوٹیفکیشن حکومت جاری کرے گی۔ کم از کم آٹھ ارکان خواتین ہوں گی اور کم از کم ایک رکن صوبے کی اقلیتی برادری میں سے ہوگا۔ کمیشن کا سیکریٹریٹ مالیاتی رپورٹنگ اور وفاقی اور صوبائی حکومت سے مطلوب بجٹ کی تیاری کا ذمہ دار ہوگا۔ اس سے پہلے یہ بجٹ محکمہ سماجی بہبود تیار کرتا تھا۔ خیبر پختونخوا وہ واحد صوبہ ہے جس نے گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے کوئی قانون منظور نہیں کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے سال کے شروع میں قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے بل کو مسترد کردیا تھا۔ اگست 2016ء میں، اسلامی نظریاتی کونسل نے اسمبلی میں 72 صفحات پر مشتمل جواب جمع کرایا جس میں پیش کیے گئے بل کو مسترد کرنے کی وجوہات بتائی گئی تھیں۔ اب یہ بل ترامیم کے ایک اور دور سے گزرنے کے لیے خیبر پختونخوا حکومت کے پاس ہے جس کے بعد اسے دوبارہ اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔

وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقہ جات میں خواتین کی حمایت میں پہلا قانون متعارف

کرانے کے لیے، ڈائریکٹوریٹ سماجی بہبود فاٹا نے کام کی جگہ پر خواتین کو ہراساں کیے جانے سے تحفظ فراہم کرنے کے ایکٹ 2010ء کا دائرہ کار فاٹا تک وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ صدر مملکت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے گورنر خیبر پختونخوا کے لیے ایک سمری تیار کی گئی تا کہ صوبے میں خواتین کے لیے کام کے ایک محفوظ اور غیر امتیازی ماحول کو یقینی بنانے کے لیے اس قانون کا دائرہ کار فاٹا تک وسیع کیا جا سکے۔ سال کے آخر تک اس معاملے پر کسی پیش رفت کی اطلاع نہیں ملی۔

خانگی قوانین میں، لاہور ہائی کورٹ نے اگست میں فیصلہ دیا کہ محض کسی ماں کی دوسری شادی کی بناء پر اسے اس کے کم سن بچے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس فیصلے نے ایک نگران جج اور ایک فاضل اور سیشن جج کے ان فیصلوں کو منسوخ کر دیا جن میں ایک خاتون کی دوسری شادی کی بناء پر اس کی کم سن بیٹی کو اس کی تحویل میں دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

جیل اصلاحات کمیٹی کی جانب سے وفاقی محتسب کی وساطت سے 13 دسمبر کو سپریم کورٹ میں جمع کرائی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ملک بھر کی جیلوں میں خواتین انتہائی افسوسناک حالات میں رہ رہی ہیں۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ صوبائی حکومتیں ہر جیل کے لیے ضلعی اور سیشن جج کی سربراہی میں ایک نگران کمیٹی تشکیل دیں اور اس کا اعلان کریں۔ رپورٹ میں تمام قیدیوں کے لیے مناسب بستروں، حاملہ قیدیوں کے خلاف پابندیوں کے محدود اطلاق، معمول کی تولیدی صحت کی دیکھ بھال کی فراہمی، اور ان جیلوں میں تعینات جیل عملے کی تعلیم اور مہارت میں اضافے کے لیے ایک نظام متعارف کرانے اور ان کے کام کے حالات میں بہتری کی بھی سفارش کی گئی۔ جون میں، سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے امور داخلہ نے ملک کی جیلوں میں خواتین کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور ان جیلوں کے بدترین حالات کے پیش نظر، ان کے لیے الگ جیلوں کا مطالبہ کیا تھا۔

خواتین پر تشدد

تشدد کی مختلف شکلوں کے اظہار کا نتیجہ خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ ظاہری اور پوشیدہ دونوں شکلوں میں موجود ہے جس سے پاکستان میں متاثرین کی سالانہ تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میڈیا میں چند ہی واقعات رپورٹ ہوئے تاہم یہ چند واقعات ہی ریاست کو تشدد کے خاتمے کے لیے فوری اقدامات پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہونے چاہئیں۔ اگرچہ تشدد کی ممانعت کے لیے 2016ء میں کئی قوانین اور قراردادیں

خواتین کے خلاف تشدد کی روک تھام کے لیے 2016 میں قوانین اور قرار دادیں تو منظور ہوئیں مگر ان کا نفاذ نہ ہوسکا

منظور کی گئیں تاہم ان کا نفاذ نہ کیا جا سکا۔

25 نومبر کو، سندھ اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس میں صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سندھ میں خواتین کے خلاف جسمانی اور ذہنی بدسلوکی کی روک تھام کے لیے اقدامات کریں اور خواتین کے بنیادی حقوق کی فراہمی کے لیے قوانین تشکیل دیں۔ پنجاب حکومت نے متاثرہ خواتین کے لیے حفاظتی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے نومبر میں اعلان کیا کہ ملتان میں خواتین کے خلاف تشدد سے متعلق پہلا مرکز قائم کیا گیا ہے جو بہت جلد کام کا آغاز کر دے گا۔ خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کا ایکٹ 2016ء کے تحت قائم کیے گئے اس مرکز کا مقصد خواتین کے تحفظ اور ان کی معاونت کے لیے قانونی اور طبی سہولیات فراہم کرنا ہے۔ اس مرکز میں دو وکیل اور 39 پولیس اہلکار تعینات کیے گئے تھے۔ یہ قانون تمام اضلاع میں ایسے مراکز کے قیام کی تجویز دیتا ہے۔ یہ مراکز ایک ہی چھت تلے پولیس کی تحقیقات، استغاثہ، قانونی امداد اور طبی معائنے جیسی سہولیات فراہم کریں گے۔

پنجاب کی مارچ میں شائع ہونے والی صنفی مساوات سے متعلق پہلی رپورٹ ظاہر کرتی تھی کہ صوبے میں 2012ء سے 2015ء کے دوران خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات میں 20 فیصد اضافہ ہوا۔ پنجاب کمیشن برائے حقوق نسواں اور اربن یونٹ کی جانب سے تیار کی گئی یہ رپورٹ سرکاری ذرائع سے اکٹھے کیے گئے اعداد و شمار پر مبنی تھی۔ رپورٹ میں مشاہدہ کیا گیا کہ تشدد کے واقعات کی تعداد ان اضلاع میں زیادہ تھی جہاں شرح خواندگی 50 فیصد یا اس سے کم تھی۔ ان

اضلاع میں رحیم یار خان، سرگودھا، ملتان اور وہاڑی شامل ہیں۔ رپورٹ میں اس بات کا بھی پتا چلا کہ خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات میں سزاؤں کی تعداد میں مجموعی طور پر کمی واقع ہوئی۔ 2012ء میں 378 واقعات میں ملزموں کو سزائیں ہوئیں جبکہ 2015ء میں یہ تعداد کم ہو کر 81 رہ گئی۔

ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ ظاہر کرتی ہے کہ 2016ء میں خواتین کے خلاف تشدد کے متاثرین کی تعداد 2,500 سے زائد تھی۔ ان میں جنسی تشدد، گھریلو تشدد، جلائے جانے اور اغواء کے واقعات شامل ہیں۔

متاثرین کی تعداد	تشدد کی نوعیت
1003	جنسی تشدد (اجتماعی جنسی زیادتی، جنسی زیادتی، ہراساں کرنا، غیر فطری جنسی اختلاط، برہنہ کرنا)
386	گھریلو تشدد (تیزاب حملہ، قطع عضو، مار پیٹ، تیز دھار آلے سے حملہ، اقدام قتل، نذر آتش کرنا، سر مونڈنا، فائرنگ وغیرہ)
988	جلانا (تیزاب حملے، آگ لگانا)
138	اغواء
1001	خودکشی + اقدام خودکشی

غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم اور تیزاب حملے

2016ء کے دوران سینکڑوں خواتین اور لڑکیوں کو ان کے خاندان کے افراد نے اپنے خاندان کی عزت بچانے کے نام پر قتل کیا۔

رپورٹ ہونے والے زیادہ تر واقعات میں متاثرین کو جلا دیا گیا۔ 28 اپریل کو ایبٹ آباد میں ایک 15 رکنی جرگے کے حکم پر ایک 16 سولہ سالہ لڑکی کو اس بنا پر آگ لگا کر قتل کر دیا گیا کہ اس نے اپنی ایک دوست کی گاؤں سے فرار ہونے اور پسند کی شادی کرنے میں مدد کی تھی۔ لڑکی کو اس کے گھر سے ایک خالی مکان میں لے جایا گیا جہاں اسے نشہ آور دوا پلائی گئی، قتل کیا گیا اور پھر اسے ایک ویگن کی پچھلی سیٹ میں بٹھا کر گاڑی کو آگ لگا دی گئی۔ ایسے ہی دو واقعات جون میں بھی منظر عام پر آئے جب متاثرین کو غیرت کے نام پر جلا کر قتل کر دیا گیا۔ پہلے واقعہ میں ایک اسکول کے پرنسپل نے ایک 19 سالہ ٹیچر کو اس بناء پر تشدد کے بعد آگ لگا کر قتل کر دیا کہ مقتولہ نے پرنسپل کے بیٹے کی جانب سے شادی کی پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ پرنسپل

اپنے بیٹے، جو کہ عمر میں لڑکی سے دوگنا بڑا تھا، کے رشتے سے انکار پر مقتولہ کو مسلسل ہراساں کر رہا تھا جس کی وجہ سے اسے مجبوراً نوکری چھوڑنا پڑی۔ لڑکی نے اپنے بیان میں اسکول کے پرنسپل اور دیگر چار افراد کو واقعے کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس کے دو دن بعد لڑکی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوگئی۔ اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد، لاہور میں ایک 17 سالہ لڑکی کو اس کی ماں نے اس بناء پر آگ لگا کر قتل کر دیا کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ فرار ہونے کے بعد اس کے ساتھ پسند کی شادی کر کے خاندان کی بدنامی کا باعث بنی تھی جس کی لسانی شناخت لڑکی کی ماں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ لڑکی کی ماں نے قتل کا اعتراف کرلیا اور اسے حراست میں لے لیا گیا۔
2016ء کا ایک اور اہم واقعہ سوشل میڈیا کی کارکن قندیل بلوچ کا قتل تھا۔ 17 جولائی کو قندیل کو اس کے بھائی نے گلا دبا کر قتل کر دیا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس کی اور اس کے خاندان کی بدنامی کا باعث بنی تھی۔ ملزم نے بعد ازاں قتل کا اعتراف کر لیا۔ سول سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد نے 2014ء میں اچانک شہرت حاصل کرنے والی سوشل میڈیا سٹار کے قتل کے خلاف احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ غیرت کے نام پر قتل کو ریاست کے خلاف جرم تصور کیا جائے۔ یہ پہلا مقدمہ تھا جس میں حکام نے قندیل کے قتل کا اندراج ریاست کے خلاف جرم کے طور پر کیا اور اس کے خاندان کو پاکستان میں ایک طویل عرصے سے رائج قصاص اور دیت کے قوانین کے مطابق اپنے بیٹے کو معاف کرنے کا قانونی حق دینے سے انکار کر دیا۔

قندیل کے قتل سے ایک ماہ پہلے اور سابقہ ہلاکتوں کے تناظر میں، بریلویوں کے ایک گروہ سنی اتحاد کونسل نے غیرت کے نام پر قتل کے خلاف فتویٰ جاری کیا اور اسے غیر اسلامی اور ایک سنگین جرم قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنی پسند کی شادی کرنے والی خواتین کو قتل کرنا اسلامی تعلیمات کے سخت خلاف ہے۔ پھر اکتوبر میں، قومی اسمبلی نے غیرت کے نام پر جرائم کے خاتمے کے لیے ایک درست اقدام کیا۔ فوجداری قانون میں ایک ترمیم کی گئی تا کہ ان قانونی نقائص کو دور کیا جا سکے جو مجرموں کو متاثرہ فرد کے خاندان کی جانب سے معاف کیے جانے کے بعد سزا سے بچنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ متاثرہ فرد کے خاندان کے پاس اب یہ اختیار نہیں رہا کہ وہ غیرت کے نام پر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو معاف کر سکیں (انصاف تک رسائی اور قوانین میں تبدیلیاں ملاحظہ کریں)

ایسڈ سروائیورز فاؤنڈیشن (اے ایس ایف) نے یورپی یونین (ای یو)، گروپ

ڈویلپمنٹ پاکستان اور خواتین کے حقوق سے متعلق قومی کمیشن (این سی ایس ڈبلیو) کے تعاون سے ایک تحقیق کا اہتمام کیا جس کے مطابق 2014ء سے 2016ء کے دوران تیزاب حملوں کی تعداد میں 50 فیصد کمی دیکھی گئی۔ 2014ء میں تیزاب حملوں کے 153 واقعات پیش آئے۔ 2014ء کے مقابلے میں 2015ء میں متاثرین کی تعداد میں 54.9 جبکہ 2016ء میں 51.91 فیصد کمی دیکھی گئی۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق اس سال تیزاب حملوں کے 51 واقعات پیش آئے جن میں 67 خواتین متاثر ہوئیں۔

انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے ایک شخص کو 2015ء میں ایک خاتون پر تیزاب سے حملہ کرنے پر 28 سال قید کی سزا سنا کر ایک درست مثال قائم کی۔ اس کے خلاف ضابطہ تعزیرات پاکستان کے سیکشن 336 (ایسی ضرب لگانا جس سے جسم کا کوئی عضو کام کرنا چھوڑ دے) اور انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ 7 کے تحت مقدمہ درج کیا گیا اور وہ ان دونوں معاملات میں قصوروار پایا گیا۔

جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادیاں

پاکستان میں اقلیتی مذاہب سے تعلق رکھنے والی خواتین کو اکثر جبری تبدیلیء مذہب اور جبری شادیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور یہ سرگرمی 2016ء میں بھی جاری رہی۔ جبری تبدیلی مذہب کے سالانہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن میڈیا کی رپورٹس ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان میں اوسطاً 1000 لڑکیوں کا مذہب تبدیل کر کے انہیں جبراً مسلمان بنایا جاتا ہے۔ زیادہ تر واقعات سندھ میں پیش آتے ہیں۔ مئی میں، صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر میں ایک جرگہ نے ایک شادی شدہ ہندو لڑکی کی ایک معمر شخص کے ساتھ دوبارہ شادی کا حکم دیا۔ لڑکی کی اپنے کزن کے ساتھ پہلی شادی کے چند روز بعد اس کا بھائی اسے اس کے گھر سے لے گیا اور اس کی ایک 56 سالہ شخص سے دوبارہ شادی کر دی۔ اس سے پہلے مارچ میں بھی سندھ کے ضلع عمرکوٹ میں ایک لڑکی کو اس کے گاؤں سے اغواء کیا گیا تھا۔ اسے ایک ہفتہ بعد عدالت میں پیش کیا گیا اور اسے مسلمان اور اس شخص کی بیوی قرار دیا گیا جس نے اسے اغواء کیا تھا۔

سندھ اسمبلی نے اس مسئلہ کے حل کے لیے 24 نومبر 2016ء کو سندھ فوجداری قانون (اقلیتوں کا تحفظ) ایکٹ کی منظوری دی جو پاکستان مسلم لیگ فنکشنل (پی ایم ایل۔ایف) کے رکن پارلیمان نند کمار نے ایک سال پہلے پیش کیا تھا۔ نئے قانون میں بالغوں کو تبدیلیء

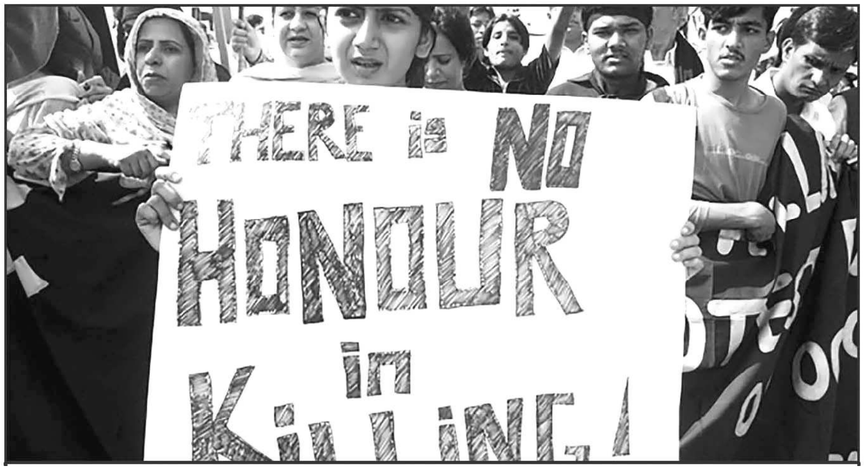

2016ء کے دوران خواتین کے تحفظ کے لیے بعض قوانین منظور ہوئے اور بعض التواء کا شکار رہے

مذہب سے متعلق اپنے فیصلے پر غور کرنے کے لیے 21 دن کا وقت دیا گیا ہے اور کم سن بچوں کو اپنی مرضی کا مذہب اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص زبردستی کسی دوسرے فرد کا مذہب تبدیل کراتا ہے تو وہ کم از کم پانچ سال قید اور زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا کا مستوجب ہوگا اور اسے متاثرہ فرد کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا اور اگر کوئی شخص یہ جانتے ہوئے کہ کوئی ایک یا دونوں فریق جبری شادی کا نشانہ بن رہے ہیں، شادی کا انعقاد کرتا ہے یا اس میں کوئی کردار ادا کرتا ہے تو وہ کم از کم پانچ سال قید اور متاثرہ فرد/افراد کو جرمانے کی ادائیگی کا مستوجب ہوگا۔ جبری گمشدگی سے متعلق شکایات عدالتی پٹیشن کے ذریعے درج کرائی جائیں گی اور یہ شکایت خود متاثرہ فرد یا کسی ایسے فرد کی جانب سے درج کرائی جائے گی جسے اس نے اپنے ایماء پر کوئی کارروائی کرنے کا مجاز کیا ہو۔ قانون مقدمہ کے تصفیے تک متاثرہ فرد کو محفوظ پناہ فراہم کرنے کی تاکید بھی کرتا ہے۔ اسمبلی کے مذہبی گروہوں نے ترمیم کی شدید مخالفت کی جن کے مطابق یہ ترمیم اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور ابھی اس قانون کو منظور ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اطلاعات کے مطابق، سندھ حکومت نے قانون میں ترمیم کی حامی بھر لی، خاص طور پر مذہب کی تبدیلی کے لیے کم از کم عمر اٹھارہ برس مقرر کرنے والی دفعہ کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

اسی ماہ، سینیٹ نے فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2016ء کی منظوری دی جس میں جبری شادیوں کے لیے زیادہ سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ اس بل کے تحت جبری شادیوں کی سزا سات سال قید سے بڑھا کر 10 سال کر دی گئی ہے۔ اب یہ بل ایوان زیریں کی منظوری کا منتظر ہے۔

سفارشات

☆ خواتین کے لیے معاشی مواقعوں کی تعداد اور معیار میں بہتری لائی جائے تا کہ حکومت پاکستان کے وژن 2025ء کے اہداف کو پورا کیا جاسکے۔تعلیم کے مساوی مواقع مرد وخواتین دونوں کو دستیاب ہونے چاہئیں اور مردوں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ نہیں کیا جانا چاہیے۔صنفی امتیاز کی سختی سے ممانعت ہونی چاہیے اور اسے ایک انتہائی رجعت پسند طرزِ عمل قرار دیا جانا چاہیے تا کہ آجروں کو کام کی جگہ پر امتیازی سلوک کے فروغ سے روکا جاسکے۔

☆ خواتین اراکین پارلیمان کے لیے انتخابات لڑنے کے حوالے سے ایک مددگار ماحول قائم کرتے ہوئے اور اعلیٰ عدلیہ میں خواتین ججوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے خواتین کی سیاسی اور عدالتی شرکت میں اضافہ کیا جائے۔

☆ صحت کی سہولیات، مانع حمل کے طریقوں تک رسائی میں بہتری لاتے ہوئے اور ملک بھر میں صحت سے متعلق آگاہی کو فروغ دیتے ہوئے خواتین کی شرح اموات میں کمی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔زچگی کے دوران بننے والا پھوڑا (آبسٹیٹرک فسٹولا) جس کا سامنا خواتین کو بچے کی پیدائش کے بعد کرنا پڑتا ہے، کو صحت سے متعلق ایک اہم خطرہ تسلیم کیا جائے۔کم عمری کی شادیوں کی روک تھام کی جائے تا کہ زچگی سے متعلق طبی پیچیدگیوں پر قابو پایا جاسکے۔

☆ 2016ء میں وفاقی اور صوبائی سطح پر خواتین کے تحفظ کے لیے منظور کیے گئے تمام قوانین کے نفاذ کے لیے درکار طریق ہائے کار فوری طور پر تشکیل دیے جائیں۔سندھ میں ترجیحی بنیاد پر خواتین کی حیثیت سے متعلق صوبائی کمیشن قائم کیا جائے۔پنجاب، بلوچستان، سندھ اور وفاقی سطح پر منظور کیے گئے قوانین کا سختی سے نفاذ کرتے ہوئے خواتین کے خلاف تشدد پر قابو پایا جائے۔صوبہ خیبر پختونخوا کو گھریلو تشدد کی ممانعت کا بل فوری طور پر منظور کرنا چاہیے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے تحفظات کو بالائے طاق رکھنا چاہئے۔ججوں، پولیس اور پورے معاشرے کو فوجداری قانون کی اس ترمیم کے بارے میں آگاہ کیا جانا چاہئے جو غیرت کے نام پر جرائم کے کیسز میں متاثرہ فرد کے خاندان کی جانب سے ملزم کو معاف کیے جانے سے روکتی ہے، تا کہ غیرت کے نام

پر قتل کے مجرم سزا سے نہ بچ سکیں۔

☆ ملک بھر میں زیرِحراست خواتین قیدیوں کے حالات کو بہتر بنایا جائے اور انہیں قیدیوں کی دیکھ بھال اور ان کے ساتھ برتاؤ کے ملکی اور بین الاقوامی اصولوں کی مطابقت میں لایا جائے۔

☆ پاکستان میں مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے زندگی بسر کرنے کے لیے ایک محفوظ ماحول کے قیام کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں اور انہیں جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادیوں سے تحفظ فراہم کیا جائے۔ دیگر صوبوں کو سندھ کی پیروی کرتے ہوئے اقلیتوں کے تحفظ کے قانون کی منظوری دینی چاہیے۔

بچے

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل-11(3)]

ریاست: شادی، خاندان، ماں اور بچے کو تحفظ فراہم کرے گی۔

[آرٹیکل-35]

ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔۔۔کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔

[آرٹیکل 37-(e)]

بچپن خاص توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔

بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا میثاق

[دیباچہ]

بچوں کے متعلق عمل میں لائی گئی تمام کارروائیوں میں، چاہے وہ سرکاری یا نجی سوشل ویلفیئر اداروں کی طرف سے عدالتوں، انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے حکام یا قانون ساز اداروں کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہوں، بچوں کے بہترین مفادات کو اولین فوقیت دی جائے گی۔

[آرٹیکل نمبر 3 (1)]

ہر بچے کو نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب قومی، یا معاشرتی جڑوں، جائیداد یا پیدائش کی بنیاد پر، کسی امتیاز کے بغیر خاندان، معاشرے اور ملک کی طرف سے ان حفاظتی تدابیر کا حق حاصل ہوگا جن کا وہ نوعمر ہونے کی وجہ سے سزاوار ہے۔

شہری و سیاسی حقوق کا عالمی میثاق

[آرٹیکل نمبر 24 (1)]

تمام بچوں اور نابالغ افراد کو ان کی ولدیت یا کسی اور بنا پر امتیاز روا رکھے بغیر تحفظ اور امداد فراہم کرنے کی خصوصی تدابیر اختیار کی جائیں......بچوں اور نابالغوں کو معاشی اور معاشرتی استحصال کے خلاف تحفظ دیا جائے......تمام ملکوں کو عمر کی ایک حد مقرر کرنا چاہیے جس سے کم عمر بچوں کی بامعاوضہ ملازمت پر پابندی ہونی چاہیے اور ایسی ملازمت قابل سزا جرم ہونا چاہیے۔

معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا عالمی میثاق

[آرٹیکل نمبر 10 (3)]

2016ء میں، بچوں اور نوجوان افراد کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے اور اپنی صلاحیتوں کے مکمل اظہار میں مسلسل مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ریاستی سطح پر بچوں، خاص طور پر وہ جو سنگین خطرے سے دوچار ہیں، کی بہبود کے لیے بہت کم اقدامات کیے گئے۔ مرکز اور صوبوں میں بچوں کے تحفظ سے متعلق ایک جامع پالیسی موجود نہیں تھی۔ اقوام متحدہ کے نئے منظور شدہ مستحکم ترقی کے اہداف کے تحت پاکستان پر عائد ذمہ داریوں سے متعلق کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا۔ ان میں سے کئی اہداف کا بچوں کی فلاح و بہبود سے انتہائی قریبی تعلق ہے۔

جون 2016ء میں، اقوام متحدہ کی بچوں کے حقوق کی کمیٹی نے بچوں کے حقوق کے میثاق پر عمل درآمد سے متعلق حکومت پاکستان کی پانچویں سلسلہ وار رپورٹ کا جائزہ لیا اور اس بات پر شدید تشویش کا اظہار کیا کہ پاکستان معاہدے کے تحت اپنی کئی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کمیٹی نے ایسے افراد کی پھانسی جن کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم تھی، بچوں کے ساتھ امتیازی سلوک، تھانوں اور جیلوں میں بچوں کے خلاف ایذا رسانی کا منظّم اور وسیع استعمال، بچوں کے حقوق سے متعلق زیر التوا قوانین، جسمانی سزا اور صحت اور تعلیم کے لیے کم بجٹ جیسے اہم مسائل کی نشاندہی کی۔

زیرِ نظر سال کے دوران بچوں کے حقوق کے حوالے سے چند اہم کامیابیاں دیکھنے کو ملیں۔ اہم کامیابیوں میں پولیو وائرس کے پھیلاؤ کی روک تھام میں نمایاں پیش رفت، اور فوجداری قوانین (ترمیمی) ایکٹ 2016ء شامل تھیں۔ اس قانون میں جرم کی ذمہ داری کی عمر بڑھا کر 10 سال کر دی گئی اور بچوں کے خلاف جنسی حملے، بچوں کی فحش نگاری اور اسمگلنگ کو جرم قرار دیا گیا۔ قانون سازی کے باوجود، بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہی اور پاکستان کے بچوں کو درپیش مشکلات سے نبٹنے کے لیے ریاست نے جو اقدامات کیے وہ ناکافی اور غیر موثر تھے۔

صحت

ملک کی ایک بہت بڑی آبادی غذائیت بخش خوراک اور صحت کی سہولیات سے محروم رہی، جس کی وجہ سے بچوں کی ناقص نشوونما، بیماری اور غذائیت کی کمی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ عالمی سطح پر بچوں کو ناقص نشوونما کی شرح میں سالانہ 2.1 فیصد کمی آ رہی ہے تاہم پاکستان میں اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جولائی میں جاری ہونے والی عالمی غذائیت رپورٹ

2016ء کے مطابق، پاکستان دنیا کے ان ممالک میں چوتھے نمبر پر تھا جہاں نشوونما کی کمی کا شکار بچوں کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ صاف پانی تک رسائی میں بہتری پر کام کرنے والے ایک بین الاقوامی خیراتی ادارے واٹر ایڈ کی جانب سے جاری ہونے والی ایک اور رپورٹ 'کمی کا شکار: بیت الخلاء اور صاف پانی کی کمی کس طرح غذائیت میں کمی کا باعث بنتی ہے' کے اندازے کے مطابق پاکستان میں 98 لاکھ بچوں کو نشوونما کی کمی کا سامنا ہے۔ یہ تعداد ملک میں بچوں کی کل آبادی کا 45 فیصد ہے جس کے باعث پاکستان نشوونما کی کمی کے لحاظ سے دنیا میں تیسرے جبکہ نشوونما کی کمی کے پھیلاؤ کے لحاظ سے آٹھویں نمبر پر ہے۔ عالمی بینک کی جانب سے نومبر میں جاری ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق بھی پاکستان نشوونما کی کمی کے لحاظ سے دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ تحقیق میں کہا گیا کہ پنجاب میں 39.2 فیصد، سندھ میں 49.8 فیصد، خیبر پختونخوا میں 47.8 فیصد، بلوچستان میں 52.2 فیصد، فاٹا میں 57.6 فیصد اور گلگت۔بلتستان میں 50.6 فیصد بچے نشوونما کی کمی کا شکار ہیں۔ ورلڈ پاپولیشن فاؤنڈیشن اور منصوبہ بندی کمیشن کی جانب سے ''شہروں میں غذائیت'' پاکستان میں شہری بچوں کے اعداد و شمار کا ثانوی تجزیہ'' کے عنوان سے جاری ہونے والی تحقیق کے مطابق نشوونما کی کمی کا شکار 25 لاکھ سے زائد بچے شہروں میں رہتے ہیں۔ یہ تعداد افغانستان، یمن، صومالیہ، سری لنکا اور پپوا نیوگنی میں رہنے والے نشوونما کی کمی کا شکار بچوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

بچوں میں شرح اموات سے متعلق اقوام متحدہ کے انٹر ایجنسی گروپ کی جانب سے جون میں جاری کیے گئے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں نصف کے قریب بچے دیرینہ نشوونما کی کمی جبکہ 11 فیصد نشوونما کی شدید کمی کا شکار ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن اور عالمی پروگرام برائے خوراک کی جانب سے جولائی میں جاری ہونے والی رپورٹ 'پاکستان میں خوراک کی کم از کم لاگت' میں کہا گیا ہے کہ ملک میں تقریباً 62 فیصد گھرانے کم قیمت، غذائیت بخش خوراک تک رسائی کے قابل نہیں ہیں اور ایسا خاص طور پر دیہی علاقوں اور کم ترقی یافتہ صوبوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ یونیسیف کے مطابق، بلوچستان سب سے زیادہ متاثرہ صوبہ تھا جہاں 16 فیصد بچے نشوونما کی شدید کمی، پانچ سال سے کم عمر بچوں میں سے 52 فیصد نشوونما کی کمی کا شکار اور 39.6 فیصد کم وزن تھے۔

ملک میں بچوں کی بلند شرح اموات کی ایک وجہ غذائیت کی کمی بھی ہے۔ پاکستان صحت سے متعلق اپنے ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول میں ناکام رہا جن کا مقصد شیر خوار بچوں

بچوں کی ایک بڑی تعداد غذائیت بخش متوازن خوراک اور صحت کی سہولیات سے محروم رہی
جس کا نتیجہ ان کی ناقص افزائش، بیماریوں اور غذا کی قلت کی صورت میں نکلا

کی شرح اموات کو 2015ء تک 1000 زندگیوں میں سے 40 اموات تک لا کر بچوں کی شرح اموات کو کم کرنا تھا۔ اقوام متحدہ کی 2016ء میں شائع ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق 2015ء میں پاکستان میں ہر ہزار میں سے 66 بچے پیدائش کے دوران ہلاک ہوئے۔ یہ دنیا میں شیر خوار اور نومولود بچوں کی بلند ترین شرح اموات میں شامل ہے۔ ان مایوس کن اعداد وشمار نے پاکستان کو دنیا کے ان 10 ممالک میں شامل کر دیا ہے جہاں دنیا بھر کے 59 لاکھ بچوں میں سے 60 فیصد پانچ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی پاکستان کی ترقی سے متعلق تازہ ترین رپورٹ میں بھی کہا گیا ہے کہ پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات کی سب سے بڑی وجہ غذائیت کی کمی ہے، جس کے نتیجے میں ہر سال 31 لاکھ بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اگست میں اوائل بچپن کے دوران نشوونما پر منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں وفاقی حکومت کا کہنا تھا کہ پاکستان میں بچوں کی شرح اموات دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اور بچوں کی صحت کی خرابی کی سب سے بڑی وجہ صحت کی ناقص سہولیات، غذائیت کی کمی اور بچوں کو ماں کا دودھ میسر نہ ہونا ہے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ قومی سطح پر ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا گیا ہے تاکہ بچوں کے تحفظ کے لیے شواہد پر مبنی ایک قومی حکمت عملی وضع کی جا سکے۔ تاہم، 2016ء کے آخر تک اس حوالے سے کسی پیش رفت کی اطلاع نہیں ملی۔

نمونیا اور پیچش پاکستان میں بچوں کی اموات کی دیگر دو اہم وجوہات ہیں۔ عوامی صحت کے ایک نامور امریکی ادارے کی جانب سے جاری ہونے والی رپورٹ '2016ء میں نمونیا اور پیچش پر پیش رفت' میں انکشاف کیا گیا کہ ہندوستان اور نائجیریا کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی دنیا کے ان تین ممالک میں شامل ہے جو ان بیماریوں کا گڑھ ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ پاکستان میں ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں میں سے 19 بچے نمونیا اور پیچش کے باعث موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور 2015ء میں نمونیا اور پیچش کے باعث پانچ سال سے کم عمر کے 103,444 بچے ہلاک ہوئے۔ سندھ اور پنجاب کی حکومتوں نے 2016ء میں بچوں کی بقاء کی شرح میں اضافے کے لیے اقوام متحدہ اور بل اینڈ لنڈا فاؤنڈیشن کے تعاون سے منصوبوں کا آغاز کیا۔ دونوں منصوبوں کا مقصد ایک سے پانچ سال کی عمر کے بچوں کو نمونیا اور پیچش کی بیماری سے تحفظ دینا تھا۔

سندھ کے ضلع تھرپارکر کے بچے غذائیت کی کمی اور پانی کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2016ء میں 476 بچے ہلاک ہوئے جن میں سے نو اموات سال کے محض آخری دو دنوں میں واقع ہوئیں۔ غیر سرکاری ذرائع یہ تعداد 606 بتاتے ہیں۔ تھرپارکر میں گزشتہ تین سالوں کے دوران خشک سالی اور ریاستی اداروں کی غفلت کی وجہ سے 2,200 بچے ہلاک ہوئے۔ ویکسینیشن کی کمی اور قبل از پیدائش نگہداشت اور صحت کی سہولیات تک رسائی کے فقدان نے بیماریوں کے اثرات اور خوراک کی کمی کو شدید تر کر دیا ہے۔

پاکستان میں پولیو کے منظر عام پر آنے والے کیسز کی تعداد جو 2015ء میں 54 تھی، 2016ء میں کم ہو کر 20 رہ گئی۔ خیبر پختونخوا اور سندھ میں آٹھ آٹھ جبکہ بلوچستان اور فاٹا میں دو دو کیسز سامنے آئے۔ پنجاب اور گلگت بلتستان سے کوئی کیس سامنے نہیں آیا۔

تعلیم

آئین کے آرٹیکل 25۔الف کے تحت 5 سے 16 برس کی عمر کے ہر بچے کو مفت اور لازمی تعلیم کا حق حاصل ہے۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان نے اس آرٹیکل کی مطابقت میں قانون سازی کی ہے۔ آئینی اور قانون سازی سے متعلق تبدیلیوں کے باوجود، 2010ء میں اس آرٹیکل کی آئین میں شمولیت سے لے کر اب تک شرح خواندگی میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔ اس

بات کی تصدیق قومی اور بین الاقوامی صورتحال سے متعلق رپورٹوں کے جائزے سے بھی ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت نے اپنے ترقیاتی ایجنڈا میں تعلیم کو ترجیح نہیں دی۔

یونیسیف کی جانب سے 'لوگوں اور کرہ ارض کے لیے تعلیم: سب کے لیے پائیدار مستقبل کی تعمیر' کے عنوان سے جاری ہونے والی عالمی تعلیمی نگرانی رپورٹ 2016ء میں اس بات کا مشاہدہ کیا گیا کہ دنیا بھر میں اسکول سے باہر 26 کروڑ تیس لاکھ بچوں، بالغوں اور نوجوانوں میں سے 9 فیصد (دو کروڑ چالیس لاکھ) بچوں کا تعلق پاکستان سے تھا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر پاکستان اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا تو یہ 2030ء تک تعلیم سے متعلق اپنے مستحکم ترقی کے اہداف حاصل نہیں کر پائے گا۔ رپورٹ کے اندازے کے مطابق، اس رفتار سے پاکستان 2060ء سے پہلے عالمگیر پرائمری تعلیم، 2070ء سے پہلے ثانوی تعلیم اور 2095ء سے پہلے اعلیٰ ثانوی تعلیم کے حصول میں ناکام رہے گا۔

الف اعلان اور مستحکم ترقی پالیسی انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تیار کی گئی پاکستان کی ضلع وار تعلیمی درجہ بندی کی رپورٹ کا چوتھا ایڈیشن مئی میں شائع ہوا۔ رپورٹ میں تعلیم اور اسکولوں سے متعلق خصوصی طور پر تیار کیے گئے گوشواروں کے ذریعے ملک میں تعلیم کے معیار کا اندازہ لگایا گیا اور ان شعبوں کی نشاندہی کی گئی جن پر فوری توجہ اور بہتری کی ضرورت ہے۔ رپورٹ میں تمام 151 اضلاع کا جائزہ لیا گیا اور ان کی اسکولوں میں داخلے، سیکھنے کے عمل، اسکولوں میں برقرار رہنے، صنفی برابری اور اسکولوں کے بنیادی ڈھانچے کے لحاظ سے درجہ بندی کی گئی۔ اسلام آباد، پنجاب اور خیبر پختونخوا (کے پی) کو تعلیم اور بنیادی ڈھانچے کے اسکور کے لحاظ سے بہتر قرار دیا گیا۔ سندھ، فاٹا اور بلوچستان نے مسلسل ناقص کارکردگی دکھائی۔ سندھ کا تعلیمی اسکور گزشتہ سال کے مقابلے میں دو درجے تنزلی کے ساتھ ملک بھر میں کم ترین رہا، حالانکہ گزشتہ چار سالوں کے دوران سالانہ تعلیمی بجٹ میں اضافہ کیا گیا تھا۔ بلند ترین درجہ بندی والے شہروں میں اسلام آباد، چکوال، اور کوٹلی، جبکہ بدترین درجہ بندی کے حامل اضلاع میں قلعہ عبداللہ، ڈیرہ بگٹی، اور لکی مروت شامل تھے۔ رپورٹ میں اسکولوں کے بنیادی ڈھانچے کا ایک نیا گوشوارا بھی متعارف کرایا گیا اور اس گوشوارے کے مطابق تمام سرکاری اسکولوں میں سے صرف 52 فیصد میں چاروں سہولیات یعنی بیت الخلاء، چار دیواری، بجلی اور پینے کا صاف پانی موجود تھیں۔ رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ تمام سرکاری اسکولوں میں سے 81 فیصد اسکول پرائمری تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ

دو کروڑ، چالیس لاکھ بچے سکول میں داخل نہیں تھے اور آٹھ برس کی عمر کے نصف سے زائد بچوں کو پڑھنا نہیں آتا تھا

پرائمری سطح پر لڑکیوں کی اسکولوں میں داخلے کی شرح 53 فیصد اور لڑکوں کی 60 فیصد تھی۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں دوسرے نمبر پر تھا جہاں اسکول سے باہر بچوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ کل 154,918 سرکاری تعلیمی اداروں میں سے صرف 58,042 (37 فیصد) لڑکیوں اور نوجوان خواتین کے لیے مخصوص تھے۔

نیشنل ایجوکیشنل مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (نیمس)، ایپام، عالمی پروگرام برائے خوراک، یونیسیف اور یونیسکو کی مشترکہ کاوشوں سے تیار ہونے والی رپورٹ 'پاکستان کا تعلیمی گوشوارا 2016' ستمبر 2016ء میں شائع ہوئی۔ رپورٹ میں یہ بات سامنے آئی کہ پاکستان میں اسکول جانے کی عمر کے بچوں میں سے صرف نصف کا اسکولوں میں اندراج تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران اس تعداد میں صرف 0.7 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ میں اس بات کا مشاہدہ بھی کیا گیا کہ پانچ سے نو سال کی عمر کے تقریباً 60 لاکھ بچے (کل تعداد کا 28 فیصد) اسکولوں سے باہر تھے، اور یہ کہ جن طالب علموں نے اسکول کی تعلیم کا آغاز کیا ان میں سے صرف 69 فیصد پانچویں جماعت تک تعلیم جاری رکھ سکے۔ اسکولوں میں بنیادی ڈھانچے کی عدم موجودگی کو اسکولوں میں برقرار رہنے کی کم شرح کا بنیادی سبب قرار دیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق، 33 فیصد سرکاری اسکولوں میں پینے کا پانی، جبکہ 31 فیصد میں بیت الخلاء موجود نہیں تھے۔ 43 فیصد اسکولوں میں بجلی کے کنیکشن نہیں تھے اور 29 فیصد میں چار دیواری موجود نہیں تھی۔

مالیاتی وسائل کی کمی اور ناتجربہ کار اساتذہ وہ بنیادی وجوہات تھیں جو شعبہ تعلیم کی ترقی میں رکاوٹ بنی رہیں۔ کم شرح خواندگی اور تعلیمی شعبہ کی خراب صورتحال کے باوجود، پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں نے مالی سال 17-2016 کے لیے اپنا تعلیمی بجٹ نمایاں طور پر کم کر دیا۔ سندھ واحد صوبہ تھا جس نے اپنے تعلیمی بجٹ میں اضافہ کیا۔

انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اینڈ پالیسی سائنس (آئی سیپس) کی جانب سے تیار کی گئی ایک قومی رپورٹ 'پاکستان میں تعلیم کے لیے حکومتی سرمایہ کاری اور تعلیمی بجٹ 17-2016 کا ایجنڈا' کے مطابق پاکستان کا تعلیمی بجٹ جنوبی ایشیا میں سب سے کم ہے۔ جہاں تک اساتذہ کے معیار کا تعلق ہے، تو الف اعلان کے مطابق گزشتہ پانچ سالوں کے دوران سرکاری اسکولوں کے 43 فیصد اساتذہ کو کسی قسم کی رسمی تربیت فراہم نہیں کی گئی۔ اسکولوں میں داخلے کی شرح میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ علاوہ ازیں، سرکاری اسکولوں کے 58 فیصد اساتذہ کو قومی نصاب کا کچھ علم نہیں تھا اور 73 فیصد کو ملازمت سے پہلے فراہم کی گئی تربیت کے دوران کارکردگی کے جائزے کے طریقوں سے متعلق کسی قسم کے کورس نہیں پڑھائے گئے۔

اگست میں پنجاب حکومت نے صوبے کے 16 اضلاع کے اسکولوں میں نئے کلاس رومز کی تعمیر، تعلیمی سہولیات کی فراہمی اور مرمت کے کام کے لیے 15 ارب روپے کے منصوبے کی منظوری دی۔

خیبر پختونخوا کی ایلیمنٹری ایجوکیشن فاؤنڈیشن جس نے چھ اضلاع سے تعلق رکھنے والے 16,000 بچوں کو سرکاری خرچ پر نجی اسکولوں میں تعلیم دینے کے لیے اپریل 2015ء میں اپنی فروغ تعلیم واؤچر اسکیم کا آغاز کیا تھا، نے اس اسکیم کو نومبر میں مزید نو اضلاع تک توسیع دے دی اور اسکول نہ جانے والے مزید 40,000 بچوں کو نجی اسکولوں میں داخل کرایا گیا۔ خیبر پختونخوا میں ستمبر 2015ء سے مارچ 2016ء کے درمیان ہزاروں طالب علم نجی اسکولوں سے سرکاری اسکولوں میں منتقل ہوئے۔ صوبائی ایلیمنٹری اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ اور ایک غیر منافع بخش تنظیم ایڈم سمتھ انٹرنیشنل کی جانب سے مشترکہ طور پر کیے گئے ایک سروے کے مطابق، چھ ماہ کے دوران صوبے کے 23 اضلاع کے تقریباً 34,000 طالب علم نجی اسکولوں سے سرکاری اسکولوں میں منتقل ہوئے۔ اس کی بنیادی وجوہات گھر سے اسکول کا فاصلہ، فیسوں میں اضافہ اور غیر معیاری تعلیم بتائی جاتی ہیں۔

فاٹا میں 2016ء میں 'خواندگی سب کے لیئے' نامی مہم شروع کی گئی جو فاٹا کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کا حصہ تھی، جس کا مقصد جنگ سے متاثرہ علاقوں کے بچوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنا تھا۔ اس مہم کے تحت فاٹا ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ایف ای ایف) کی جانب سے قبائلی علاقہ جات میں برادری کی بنیاد پر آلٹرنیٹ لرننگ اسکولز (اے ایل ایس) قائم کیے جانے تھے۔ 2016ء میں ایف ای ایف نے لڑکوں کے لیے 76 اسکول اور لڑکیوں کے لیے 61 اسکول قائم کیے۔

حقوق کی خلاف ورزی اور بچوں کے تحفظ کا نظام

2016ء میں، قانون سازی کے میدان میں بچوں کے تحفظ کے حوالے سے چند اہم پیش رفتیں دیکھی گئیں۔ پارلیمان نے ضابطہ تعزیرات پاکستان میں ایک ترمیم کے ذریعے کم سن بچوں کے خلاف جنسی حملوں، بچوں کی فحش نگاری اور سمگلنگ کو جرم قرار دیا۔ اس قانون کے تحت جرم کی ذمہ داری کی عمر 7 سال سے بڑھا کر 10 سال، اور بالائی عمر کی حد 12 سے 14 سال کردی گئی۔ یہ قانون بچوں کو ظالمانہ سلوک، ان کے سامنے جنسی مواد کی تشہیر اور بچوں کی فحش نگاری سے بھی تحفظ فراہم کرتا ہے۔

بلوچستان اسمبلی نے 2016ء میں بچوں کے تحفظ کا ایکٹ منظور کیا جس کا مقصد بچوں کو ہر قسم کے جسمانی یا ذہنی تشدد، چوٹ، غفلت، ناروا سلوک، استحصال اور جنسی زیادتی سے تحفظ فراہم کرنا تھا۔ یہ قانون محکمہ سماجی بہبود کے تحت بچوں کے تحفظ کے کمیشن کے قیام کی بھی اجازت دیتا ہے جو اس قانون پر عمل درآمد کا ذمہ دار ہوگا۔

دو سال پہلے سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011ء کے تحت تشکیل دیے گئے سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی کے ضوابط کار کو اگست 2016ء میں حتمی شکل دی گئی۔ تاہم چائلڈ رائٹس موومنٹ کی جانب سے 'سندھ کے بجٹ (16-2015 اور 17-2016) میں بچوں کے لیے خصوصی وسائل کی تخصیص' کے عنوان سے جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق، سندھ حکومت کی جانب سے 2011ء کے قانون کے تحت بچوں کے تحفظ کے لیے مختص کیا گیا بجٹ سال کے آخر تک استعمال نہیں کیا جا سکا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کا مشاہدہ بھی کیا گیا کہ سالانہ ترقیاتی پروگرام (اے ڈی پی) میں بچوں کے لیے خصوصی اسکیموں کے لیے شعبہ تعلیم و خواندگی کا بجٹ 20 فیصد اور شعبہ سماجی بہبود کا بجٹ تقریباً 4 فیصد کم کردیا گیا۔

بچوں کے حقوق سے متعلق کمیشن کے قیام کے لیے مارچ 2015ء میں پارلیمان میں متعارف کرائے گئے ایک بل، جس کا مقصد آئینی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں پر عمل درآمد اور پالیسی اور نظام سے متعلق تبدیلیوں، بشمول بچوں کے تحفظ کے نظام کے لیے بجٹ کی تخصیص کو یقینی بنانا تھا، 2016ء کے آخر تک بھی قانون نہ بن سکا۔

خیبر پختونخوا میں، کم عمری کی شادی کی ممانعت کا بل اور خیبر پختونخوا مفت اور لازمی تعلیم کے حق کا بل اس سال بھی التوا کا شکار رہا، جس کے باعث خیبر پختونخوا وہ واحد صوبہ بن گیا جس نے ابھی تک ایسا قانون منظور نہیں کیا تھا۔

بچوں کی مشقت

ملک میں بچوں کی مشقت کی حقیقی صورتحال معلوم نہیں ہوسکی جس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ 20 سالوں کے دوران اس حوالے سے کوئی باقاعدہ سروے نہیں کیا گیا۔ 1996ء میں کیے گئے قومی چائلڈ لیبر سروے کے مطابق پاکستان میں مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد 33 لاکھ تھی۔ اس سروے سے لے کر اب تک کے تمام اندازے یہ بتاتے ہیں کہ صورتحال مزید ابتر ہوگئی ہے۔ خیبر پختونخوا اور پنجاب واحد صوبے تھے جنہوں نے بچوں کی مشقت کی ممانعت سے متعلق قانون سازی کی۔ سندھ اور بلوچستان نے ابھی تک ایسا قانون منظور نہیں کیا ہے حالانکہ بچوں کی مشقت ایک صوبائی موضوع بن چکا تھا۔ نئے قانون کی عدم موجودگی میں، بچوں کی ملازمت کا ایکٹ 1991ء، جو کئی لحاظ سے غیر موثر ہے، ان دونوں صوبوں میں نافذ رہا۔

جبری مشقت اور سمگلنگ کے ذریعے بہت سے بچوں کا استحصال جاری رہا۔ یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سمگلنگ سے متعلق اپنی 2016ء کی رپورٹ میں، پاکستان کو اس بناء پر اپنی درجہ دوئم واچ لسٹ میں شامل کیا ہے کہ یہ جبری مشقت اور جنسی سمگلنگ کا ماخذ ہے، یہ اس مقصد کے لیے راہداری کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں دیگر ممالک سے بھی بچوں کو لایا جاتا ہے۔ رپورٹ میں مشاہدہ کیا گیا کہ پاکستان میں بچوں کو جسم فروشی یا چھوٹی دکانوں، بھٹوں پر ملازمت یا گھریلو ملازمین کے طور پر معمولاً خریدا، بیچا اور کرائے پر دیا جاتا ہے یا اغوا کیا جاتا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لیبر ایجنٹ بچوں کو ان کے والدین سے ملازمت کی غرض سے خریدتے ہیں اور انہیں جبری مشقت اور جنسی سمگلنگ کا نشانہ بناتے ہیں۔

پنجاب میں بچوں کی مشقت میں کمی کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان میں صوبے میں

کئی بچے جبری مشقت اور جنسی مقاصد کے لیے اسمگلنگ کا نشانہ بنتے رہے

بچوں کی مشقت کی ممانعت اور حوصلہ شکنی کے لیے دو قوانین کی منظوری شامل تھی۔ فروری 2016ء میں، بھٹوں پر بچوں کی مشقت کی ممانعت کا آرڈیننس 2016ء منظور کیا گیا۔ اس قانون کی اہم خاصیت یہ ہے کہ اب بھٹہ مالکان کو اینٹوں کی تیاری کے عمل میں بچوں سے کسی بھی قسم کی مشقت لینے پر سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں، بھٹے کو بند کیا جاسکتا ہے اور مالک کو زیاہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ جولائی میں، پنجاب حکومت نے بچوں کی مشقت کی ممانعت کی لیے ’بچوں کی ملازمت پر پابندی کا آرڈیننس‘ کے عنوان سے ایک نیا قانون منظور کیا۔ اس قانون کے تحت تمام شعبوں میں 14 سال سے کم عمر بچوں کی ملازمت اور پرخطر شعبوں میں 15 سے 18 سال کی عمر کے افراد کی بھرتی پر پابندی عائد کردی گئی۔ یہ قانون بچوں اور بالغوں کو ہر قسم کی غلامی یا فروخت اور سمگلنگ، غلامی قرض اور زرعی غلامی، جبری یا لازمی مشقت، بشمول مسلح تنازعات میں جبری یا لازمی بھرتی سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ قانون کسی بچے یا بالغ کو جسم فروشی کے لیے مہیا یا پیش کرنے، فحش مواد کی تیاری یا فحش نگارانہ اداکاری، اور ناجائز سرگرمیوں، خاص طور پر منشیات کی تیاری اور سمگلنگ کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

ان قوانین کے علاوہ بھٹوں پر کام کرنے والے بچوں کے لیے ایک امدادی پیکج بھی رکھا گیا تھا جس میں مفت یونیفارم، جوتے، بستے، کتابیں، فی طالب علم ماہانہ 1,000 روپے کا

وظیفہ، بچوں کے اسکول میں داخلے پر فی خاندان 2,000 روپے کا الاؤنس اور بچوں کو اسکولوں میں برقرار رکھنے پر فی خاندان 2,000 روپے کا سالانہ الاؤنس شامل تھا۔ سال کے دوسرے نصف حصے میں حکومت نے مشقت کے شکار بچوں کی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت پر توجہ دی۔ 30 جون کو وزارت پنجاب برائے محنت و انسانی وسائل نے مشقت میں مصروف بچوں کو فنی تربیت فراہم کرنے کے لیے پنجاب کونسل برائے پیشہ ورانہ تربیت (پی وی ٹی سی) کے ساتھ ایک مفاہمت کی یادداشت پر دستخط کیے۔ اس یادداشت کے تحت پی وی ٹی سی نے 14 سے 18 سال کے 60,000 بچوں کو مختلف فنون کی تربیت فراہم کرنا تھی۔ بچوں کا انتخاب ادارہ شماریات کی جانب سے صوبے کے 10 اضلاع: ڈیرہ غازی خان، بہاول نگر، حافظ آباد، اوکاڑہ، شیخوپورہ، رحیم یار خان، خانیوال، سیالکوٹ، گجراں والا اور ملتان میں کیے گئے سروے کے ذریعے کیا گیا۔ اس کے علاوہ وزارت نے یہ بھی اعلان کیا کہ آٹو ورکشاپس، پٹرول پمپوں، سروس اسٹیشنوں، ہوٹلوں اور ریستورانوں پر مزدوری کرنے والے 5 سے 14 سال کی عمر کے 4,524 بچوں کو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے تحت چلنے والے مختلف اسکولوں، پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے شراکت دار اسکولوں اور غیر رسمی بنیادی تعلیمی مراکز میں داخل کرایا گیا۔ اگست میں وزارت نے ضلع سیالکوٹ کے لیے 'بچوں کی مشقت اور گروی مشقت کے خاتمے کا پراجیکٹ' کا آغاز کیا۔ اس پراجیکٹ کے تحت 5 سے 13 سال کی عمر کے 257,000 بچوں نے اپنی پرائمری تعلیم مکمل کرنا تھی جبکہ 14 سے 18 سال کی عمر کے بچوں کو تعلیم یافتہ اور مختلف تجارتوں میں مہارت یافتہ بنایا جانا تھا۔

تاہم کوئی بھی قانون گھریلو کام کو بچوں کی مشقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ یہ غیر رسمی شعبہ بڑی حد تک پوشیدہ اور سرکاری مداخلت سے آزاد رہا، جس کی وجہ سے گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرنے والے بچے نارواسلوک اور استحصال کے شدید خطرے سے دوچار رہے۔ زیر جائزہ سال کے دوران ایسے کئی واقعات پیش آئے جن میں گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرنے والی لڑکیوں کو سنگین بدسلوکی، مار پیٹ اور زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ فروری میں، پشاور میں ایک ڈاکٹر کو ایک 13 سالہ لڑکی کو چوری کے شبہ پر مار پیٹ کا نشانہ بنانے، جلانے اور اس کے بال کاٹنے کا قصوروار پایا گیا۔ متاثرہ لڑکی ڈاکٹر کے گھر پر ملازمہ کے طور پر کام کرتی تھی۔ اپریل میں، لاہور کی سبزہ زار کالونی سے ایک جوڑے کو گرفتار کیا گیا جس نے اپنی 8 سالہ گھریلو ملازمہ کو پانی گرم کرنے والے راڈ سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مئی میں، چکوال میں ایک 17 سالہ لڑکی سعدیہ کو تشدد

سال کے دوران بچوں کے تحفظ کے لیے بعض قوانین منظور ہوئے مگر بعض التواء کا شکار ہوئے

کا نشانہ بنایا گیا۔ اسے آٹھ ماہ سے اپنے خاندان سے بھی نہیں ملنے دیا گیا تھا۔ جون میں، چائلڈ پروٹیکشن بیورو نے سابق رکن قومی اسمبلی کے گھر سے ایک 12 سالہ یتیم لڑکے کو بازیاب کیا جسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اسے زبردستی گھر میں قید رکھا گیا تھا۔ اکتوبر میں ایسا ایک اور واقعہ سامنے آیا جس میں لاہور کے علاقہ گلشن اقبال میں رہائش پذیر ایک جوڑے نے ایک 15 سالہ گھریلو ملازمہ کو استری سے تشدد کا نشانہ بنایا۔ سال کے آخر میں، راولپنڈی میں ایک ایڈیشنل سیشن جج کے گھر سے بازیاب کرائی گئی ایک 10 سالہ گھریلو ملازمہ پر تشدد کی اطلاعات سامنے آئیں۔ جج اور اس کی اہلیہ کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ ایف آئی آر میں کہا گیا کہ میاں بیوی لڑکی کو دو سال سے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ عدالت عالیہ، اسلام آباد کے چیف جسٹس نے واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے واقعے کی رپورٹ طلب کی جس کے بعد عدالت عالیہ، اسلام آباد کے رجسٹرار نے ملزم جج کو پوچھ گچھ کے لیے عدالت طلب کیا۔ جج نے تمام الزامات کی تردید کی۔

بچوں کے خلاف تشدد

گھروں، کام کی جگہوں، اور اسکولوں میں بچوں کے خلاف تشدد بلا روک ٹوک جاری رہا، جس کے باعث بچوں اور نوعمر افراد کی صحت مند نشوونما اور جسمانی اور ذہنی وقار بری طرح متاثر ہوا۔ ایک غیر سرکاری تنظیم ساحل کی طرف سے جاری کی گئی ایک رپورٹ 'ظالمانہ اعداد و شمار' کے مطابق 2016ء میں روزانہ کم از کم 11 بچے جنسی زیادتی کا نشانہ بنے جبکہ تقریباً 100 کو

جنسی زیادتی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ تعداد 2015ء کے مقابلے میں 10 فیصد زیادہ ہے۔ جنسی زیادتی کے 4,139 متاثرین میں سے 1,729 (41 فیصد) لڑکے اور 2,410 (59 فیصد) لڑکیاں تھیں جن میں سے زیادہ تر کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا۔ سب سے زیادہ واقعات پنجاب، اور اس کے بعد سندھ، بلوچستان، اسلام آباد، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان میں سامنے آئے۔

2015ء میں قصور میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی میں ملوث ایک گروہ منظر عام پر آیا جبکہ مئی 2016ء میں سوات میں منگورہ کے علاقے نوا کلے میں بھی ایک ایسے گروہ کا انکشاف ہوا۔ کئی سالوں تک بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور بچوں کی فحش نگاری کا ارتکاب کرنے والے اس گروہ کی نشاندہی ایک 13 سالہ لڑکے کی جانب سے دی گئی خفیہ اطلاع کے ذریعے ہوئی جسے اس گروہ نے 2014ء میں اغوا اور حال ہی میں آزاد کیا تھا۔ پولیس نے گروہ کے سربراہ اور اس کے دو ساتھیوں کو کم سن بچوں کے اغواء اور جنسی زیادتی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ بچوں کے حقوق پر کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم سپارک کی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ کے مطابق، یہ گروہ 15 سال سے یہ کام کر رہا تھا۔ یہ لوگ 14 سے 16 سال کی عمر کے لڑکوں کو اغوا کرتے، انہیں نشہ آور دوا پلاتے اور انہیں جنسی زیادتی کا نشانہ بناتے اور پھر ان جنسی سرگرمیوں کی ویڈیوز اور تصاویر کے ذریعے ان کے خاندانوں کو بلیک میل کرتے تھے۔ ایف آئی آر میں محض 17 لڑکوں کے ساتھ جنسی زیادتی کا ذکر کیا گیا تھا جبکہ فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ نے انکشاف کیا کہ گروہ نے 100 سے زائد بچوں کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ گروہ کے سربراہ نے پیسوں کا استعمال کر کے مقدمے کا تصفیہ کرایا اور اسے عدالت کے حکم پر پانچ دن کے ریمانڈ کے بعد رہا کر دیا گیا۔ انسانی حقوق کے گروہوں کا کہنا ہے کہ اگر وفاقی حکومت کی جانب سے سال کے شروع میں وضع کیے گئے فوجداری قانون ترمیمی ایکٹ کو صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات تک توسیع دی جاتی تو ایسا نہ ہوتا، کیوں کہ نئے قانون کے تحت یہ جرائم ناقابل ضمانت اور ناقابل مصالحت ہیں۔ اس گروہ کے منظر عام پر آنے سے پہلے انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے قصور واقعے میں ملوث دو ملزمان کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔

2016ء میں پنجاب، خاص طور پر لاہور میں بچوں کے اغواء کی لہر کی اطلاعات سامنے آئیں۔ قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان نے 26 جولائی کو میڈیا کی ان اطلاعات کا از خود نوٹس لیا کہ صوبہ پنجاب میں 600 سے زائد بچوں کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ جج نے مغوی بچوں

کی بازیابی کے بارے میں جاننے کے لیے ایڈووکیٹ جنرل آف پنجاب کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی تشکیل دی۔ پولیس کا دعویٰ تھا کہ ان واقعات کی تعداد اتنی زیادہ نہیں اور یہ کہ میڈیا مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے۔ پولیس نے عدالت عظمیٰ میں ایک رپورٹ جمع کرائی جس میں کہا گیا کہ 2016ء کے پہلے سات ماہ کے دوران اغواء کے 767 واقعات پیش آئے جن میں سے 715 بچوں کو بازیاب کرالیا گیا ہے جبکہ 52 واقعات کی تحقیقات جاری ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ اغواء کے زیادہ تر واقعات لاہور، فیصل آباد، بہاولپور اور بہاولنگر کے اضلاع میں پیش آئے۔ سپریم کورٹ نے کمیٹی سے رپورٹ طلب کی جو سال کے آخر تک پیش نہیں کی گئی تھی۔

لاپتا بچوں پر کام کرنے والی ایک این جی او۔ روشنی ہیلپ لائن نے جنوری میں اپنی سالانہ رپورٹ شائع کی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ 2015ء میں اغواء ہونے والے 2,160 بچے گھر واپس نہیں پہنچے تھے۔ ان میں سے 1,639 لڑکے اور 521 لڑکیاں تھیں۔ این جی او نے پولیس ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ کراچی میں ہر سال تقریباً 3,000 بچے لاپتا ہوتے ہیں۔

جسمانی سزا

پاکستان کی جانب سے جسمانی سزا پر پابندی کے مسلسل وعدوں کے باوجود، اسکولوں، جیلوں اور گھروں میں جسمانی سزا بلا روک ٹوک جاری رہی۔ بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی نے جون 2016ء میں اپنے اختتامی مشاہدات اور سفارشات میں پاکستان پر زور دیا کہ وہ جسمانی سزا کی تمام اقسام کے خاتمے اور روک تھام کو یقینی بنائے۔

زیر جائزہ سال کے دوران سندھ میں جسمانی سزا کا ایک بدترین واقعہ پیش آیا۔ اگست میں ضلع لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والے ایک 14 سالہ طالب علم محمد احمد کو اس کے استاد نے مبینہ تشدد کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں وہ ٹانگوں سے مفلوج ہو گیا۔ اس کے والد کا کہنا تھا کہ استاد نے اس کے بیٹے کا گلا دبایا تھا۔ وزیر اعلیٰ سندھ نے ذمہ داروں کے خلاف سخت کارروائی کا وعدہ کیا۔ انہوں نے طالب علم کے بیرون ملک علاج کے لیے پانچ کروڑ روپے جاری کیے۔ اُسی ماہ چترال کی تحصیل دروش میں ایک ویڈیو سامنے آئی جس میں ایک اسکول ٹیچر کو بچوں کو مار پیٹ کا نشانہ بناتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ پولیس نے ٹیچر کو گرفتار کر لیا اور اس کے خلاف خیبر پختونخوا بچوں کے تحفظ اور بہبود کا ایکٹ 2010ء کے تحت مقدمہ درج کر لیا۔ یہ قانون جسمانی سزا کی واضح

طور پر ممانعت کرتا ہے۔اس واقعے کے بعد کے پی میں شعبہ ایلیمنٹری وثانوی تعلیم نے جسمانی سزا کے واقعات سے نمٹنے کے لیے ایک جامع سیل قائم کیا۔اس سیل کا مقصد ایک ٹال فری نمبر پر شکایات وصول کرنا تھا اور ان شکایات کی تحقیقات ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کو کرنا تھیں۔ شعبے نے ایک نوٹیفکیشن بھی جاری کیا جس میں کہا گیا کہ جسمانی سزا میں ملوث پائے گئے ملازم یا استاد کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا اور وہ قید کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

اگرچہ جسمانی سزا کے واقعات ملک بھر میں پیش آتے رہے، جن میں سے کچھ واقعات میں بچے معمولی جبکہ دیگر میں شدید زخمی ہوئے، تاہم حکومت اس سرگرمی کی روک تھام میں ناکام رہی۔فروری 2016ء میں، سینیٹ میں جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2016ء کے عنوان سے ایک پرائیویٹ ممبر بل جمع کرایا گیا۔اس بل میں 18 سال تک کی عمر کے بچوں کو جسمانی سزا دینے پر پابندی کی تجویز دی گئی تھی۔اس میں کہا گیا کہ کسی بچے کو کوڑے، چھڑی، بیلٹ، جوتے، چوبی چمچے وغیرہ سے نہیں مارا جاسکتا، نہ ہی سزا کے طور پر ان کے بال یا کان کھینچے جاسکتے ہیں،اور نہ ہی انہیں غیر آرام دہ حالت میں ٹھہرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، نہ سرزنش کی جاسکتی ہے اور نہ زبردستی کھلایا پلایا جاسکتا ہے۔ اگر بچے کو ان میں سے کسی بھی قسم کے تشدد کا سامنا کرنا پڑے تو وہ مجسٹریٹ کو شکایت درج کراسکتا ہے۔اس بل کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس میں والدین کے حقوق کو نظرانداز کیا گیا اور بچوں کو حد سے زیادہ اختیار دیا گیا ہے۔

فوجداری قانون (ترمیمی) بل میں بھی 'بچے پر ظلم وستم' کو ایک جرم کے طور پر شامل کیا گیا لیکن یہ بل اور ضابطہ تعزیرات پاکستان کی ترمیم شدہ دفعہ 89 جسمانی سزا کی واضح طور پر ممانعت نہیں کرتے۔ضابطہ تعزیرات کی مذکور دفعہ میں جسمانی سزا کے استعمال کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ بلوچستان میں بچوں کے تحفظ سے متعلق 2016ء میں منظور کیے گئے قانون میں ناروا سلوک یا بچے کو نظرانداز کرنے کی ممانعت تو کی گئی ہے لیکن جسمانی سزا کا خصوصی طور پر حوالہ نہیں دیا گیا۔

بچوں کا نظام انصاف

وفاقی محتسب افسر کے تحت جیلوں میں خواتین اور بچوں کے حالات میں بہتری کے لیے قائم کی گئی ایک کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ 2016ء میں، ملک بھر کی جیلوں میں تقریباً

2,000 بچے (اپنی ماؤں کے ساتھ رہنے والے 1,500 نوعمر اور 425 بچے) جیلوں میں بند رہے۔ بچوں کے مقدمات کی سماعت کے لیے الگ عدالتیں قائم نہیں کی گئیں جس کا موجودہ قانون تقاضہ کرتا ہے۔ بچوں کے حقوق سے متعلق کمیٹی نے ملک میں بچوں کے نظام انصاف کی صورتحال پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان پر زور دیا کہ وہ نظام کو مکمل طور پر معاہدے اور دیگر متعلقہ اصولوں کے مطابق بنائے۔ کمیٹی نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ تمام پھانسیوں کو دوبارہ ملتوی کرے اور ان تمام مقدمات پر نظر ثانی کرے جن میں ان بچوں یا ان افراد کو سزائے موت سنائی گئی تھی جن کی عمر جرم کے ارتکاب کے وقت 18 سال سے کم تھی۔

21 نومبر کو بچوں کے نظام انصاف کا بل 2016ء پارلیمان میں پرائیویٹ ممبر بل کے طور پر پیش کیا گیا جس کا مقصد بچوں کے نظامِ انصاف میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرنا تھا۔ یہ بل سال کے آخر تک زیر بحث رہا۔ مجوزہ قانون کا مقصد عدالت عالیہ، لاہور کے 2005ء کے فیصلے کی مطابقت میں بچوں کے نظام انصاف کے آرڈیننس 2000ء کو منسوخ کرنا اور اس کی جگہ نیا قانون وضع کرنا تھا۔ عدالت عالیہ لاہور، نے اس قانون میں موجود خامیوں کو دور کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہائی کورٹ نے تجویز کیا تھا کہ سات سال تک کے قابل سزا جرائم کو قابل ضمانت اور قابل مصالحت تصور کیا جائے اور حکومت کو بچوں کے لیے الگ عدالتیں، بچوں کے نظام انصاف کی کمیٹیاں اور بحالی مراکز قائم کرنے چاہئیں۔ بل میں عدالتی کارروائیوں کے دوران بچے کی عدالت میں موجودگی کو لازم قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس میں آڈیو ویڈیو ٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ بلوں میں بچوں کے بحالی نو کے لیے تفریحی پروگرام تجویز کیے گئے ہیں۔

پاکستان کمیشن برائے قانون وانصاف کی جانب سے 13 دسمبر کو وفاقی محتسب کے توسط سے عدالت عظمیٰ میں جمع کرائی گئی رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ صوبائی حکومتیں ہر جیل کے لیے ڈسٹرکٹ وسیشن ججوں کی سربراہی میں نگران کمیٹیاں تشکیل دیں اور ان کا اعلان کریں۔ رپورٹ میں تجویز کیا گیا کہ ہر جیل میں الگ الگ کوارٹر ہوں جن میں قیدی بچوں کے لیے بیت الخلاء اور سونے کی مناسب جگہ موجود ہو۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ بچے کے خاندان کے افراد کو ہفتے میں ایک بار، پہلے سے اعلان کیے گئے دنوں میں، ملاقات کا حق حاصل ہونا چاہئے اور یہ کہ تمام جیلیں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے منظور شدہ یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں سے الحاق شدہ

ہونی چاہئیں تاکہ بچوں کو مفت اور معیاری تعلیم فراہم کی جاسکے اور جیلوں کی لائبریریوں کی توسیع کی جاسکے۔ رپورٹ میں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ قیدیوں سے متعلق ایک ڈیٹا بیس تیار کیا جائے جو نادرا کے بائیومیٹرک تصدیق کے نظام سے منسلک ہو۔

کم عمری کی شادیاں

2016ء میں، پاکستان میں کم عمری کی شادیوں میں کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ سیو دی چلڈرن کی اکتوبر 2016ء میں جاری ہونے والی رپورٹ 'ہر آخری لڑکی' کے مطابق، دنیا بھر میں ہر سات ہزار لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی 15 سال سے پہلے شادی کردی گئی۔ رپورٹ میں ممالک کی 'لڑکیوں کو حاصل مواقع کا گوشوارا' کے مطابق درجہ بندی کی گئی۔ اس گوشوارے میں اس بات کا جائزہ لیا گیا کم عمری کی شادی، مکتبی تعلیم، کم عمری میں زچگی، پیدائش کے دوران اموات اور خواتین قانون سازوں کی تعداد کے لحاظ سے کن ممالک نے بہترین اور بدترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس گوشوارے میں پاکستان کا 144 میں سے 88 واں نمبر تھا۔ رپورٹ کے مطابق، پاکستان میں دو تہائی لڑکیاں یہ محسوس کرتی تھیں کہ وہ اپنی زندگی کے اہم معاملات سے متعلق فیصلے نہیں کرسکتیں۔

ملک کے تمام حصوں، خاص طور پر سندھ اور خیبر پختونخوا میں کم عمری کی شادی کی اطلاعات سال بھر موصول ہوتی رہیں۔ انسانی حقوق کے گروہوں کی جانب سے کم عمری کی شادی کے خلاف شروع کی گئیں چند مہمات کے سوا، اس مسئلے کے حل کے لیے کسی قسم کے ٹھوس اقدامات نہیں کیے گئے۔ صوبوں کے کم عمری کی شادی کو ممنوع قرار دینے والے قانونی ڈھانچے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ پنجاب اور سندھ وہ صوبے تھے جنہوں نے کم عمری کی شادی کی ممانعت کے ایکٹ 1929ء میں کامیابی کے ساتھ ترامیم متعارف کرائیں جبکہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان اس حوالے سے اب بھی پیچھے تھے۔ خیبر پختونخوا اسمبلی میں اس قانون میں ترمیم تجویز کی گئی لیکن اسے نظرثانی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیج دیا گیا۔ ایسا ہی ایک بل جس کا عنوان 'کم عمری کی شادی کی ممانعت کا (ترمیمی) بل 2016ء تھا، 24 مارچ کو قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا جس میں کم عمری کے شادی کے ذمہ داروں کے لیے جرمانے کو 300,000 روپے اور قید کی سزا کو تین سال تک بڑھانے کی تجویز دی گئی تھی۔ اگرچہ پارلیمان کے اجلاس کے دوران اس بل پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تاہم اسپیکر نے اس بل کو نظرثانی کے لیے قائمہ کمیٹی برائے مذہبی امور

کے سپرد کر دیا جس نے اس سے پہلے ایک رکن پارلیمان کی جانب سے 2014ء میں تجویز کی گئی ترمیم کو مسترد کر دیا تھا۔ 2016ء کابل سال کے آخر تک کمیٹی کے پاس زیرِغور رہا۔

پیدائش کا اندراج

پیدائش کا اندراج نہ ہونا بچے کے اس غیر مشروط حق کی خلاف ورزی ہے کہ اسے پیدائش کے وقت شناخت دی جائے۔ پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے 13-2012ء کے مطابق، پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر کے صرف 34 فیصد بچوں کا اندراج ہے۔ پیدائش کا اندراج اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ عمر کا ایک ایسا درست ریکارڈ ہوتا ہے جو بچوں کو چائلڈ لیبر، کم عمری کی شادی اور فوجداری مقدمہ بازی کے معاملات میں بالغ تصور کیے جانے سے تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔

سندھ لوکل گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے یونیسیف کے تعاون سے ستمبر میں پیدائش کے ڈیجیٹل اندراج کے منصوبے کا آغاز کیا تاکہ صوبوں میں پیدائش کے اندراج کی شرح میں بہتری لائی جا سکے۔ اس پراجیکٹ کا آغاز 2015ء میں ٹھٹھہ میں کیا گیا اور 2016ء میں اس کا دائرہ کار بدین اور نوشہرو فیروز تک بڑھا دیا گیا۔ یونیسیف کے مطابق ٹھٹھہ، جہاں اس پراجیکٹ کی 2015ء میں آزمائش کی گئی تھی، کی دو یونین کونسلوں میں پیدائش کے پہلے 60 دنوں کے دوران 94 فیصد پیدائشوں کا اندراج کیا گیا تھا۔

لاوارث اور خصوصی بچے

اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق کے میثاق کی دفعہ 20 خاص طور پر ان بچوں کے تحفظ پر زور دیتی ہے جن کا اپنا خاندان ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں ایسے بچوں کے صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ ایسے بچوں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانے کے لیے 2016ء میں کوئی سروے نہیں کیا گیا۔ ایک دہائی سے زائد عرصہ پہلے کے دستیاب اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں لاوارث بچوں کی تعداد 12 سے 15 لاکھ ہے۔ چونکہ اس حوالے سے سال ہا سال سے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کیے گئے اس لیے عین ممکن ہے کہ اس تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ بلوچستان میں بچوں کے حقوق پر کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم ساحر کے مطابق، کوئٹہ کی سڑکوں پر رہنے یا کام کرنے والے بچوں کی تعداد 15,000 تھی جن میں سے زیادہ تر افغان

سکولوں میں داخلے کی شرح میں معمولی سی بہتری دیکھنے کو ملی

مہاجرین اور کوڑا اکٹھا کرنے والے بچے شامل تھے۔ یہ امید ظاہر کی گئی کہ بلوچستان میں بچوں کے تحفظ اور بہبود کے لیے 2016ء میں وضع کیا گیا قانون لاوارث بچوں کو درپیش کچھ مشکلات سے نمٹنے میں مدد دے گا۔

اکتوبر میں، کراچی میں آغا خان یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کیے گئے آگاہی اجلاس میں کہا گیا کہ پاکستان میں جینیاتی، نفسیاتی اور سماجی وجوہات کی بنا پر دو کروڑ بچے نفسیاتی عارضے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یو این سی آر سی کی دفعہ 23 کسی بھی قسم کی معذوری کا شکار بچوں کو خصوصی نگہداشت اور معاونت کا حق دیتی ہے تا کہ وہ بھرپور اور آزادانہ زندگی گزار سکیں۔ پنجاب میں 2015ء میں، شعبہ خصوصی تعلیم نے پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تعاون سے ایک منصوبہ شروع کیا تھا تا کہ معمولی معذوری کا شکار بچوں کو مفت تعلیمی سہولیات فراہم کی جا سکیں۔ یہ منصوبہ 2016ء میں بھی جاری رہا۔ اس منصوبے کے تحت اگست تک 1,251 طالب علموں کو صوبے کے سات اضلاع لاہور، ملتان، وہاڑی، راولپنڈی، اٹک، جہلم اور چکوال کے 194 شراکت دار اسکولوں میں داخل کرایا جا چکا تھا۔ مارچ میں جہلم میں، پاکستان میں دماغی خلل کے شکار بچوں کی نگہداشت کے پہلے ادارے کا افتتاح کیا گیا۔ خصوصی افراد کے عالمی دن کے موقع پر، جو ہر سال 3 دسمبر کو منایا جاتا ہے، وزیر برائے خصوصی تعلیم پنجاب نے اعلان کیا کہ 1,000 خصوصی بچے دیگر بچوں کے ہمراہ بہاولپور اور مظفر گڑھ کے دو مراکز میں اکٹھے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں

نے کہا کہ اساتذہ کی تربیت کا پروگرام جاری تھا اور بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مشاورتی خدمات کا انتظام کیا جارہا تھا۔

صوبے میں خصوصی افراد کی اصل تعداد کا اندازہ لگانے کے لیے خیبر پختونخوا کے قدرتی آفات پر قابو پانے کے صوبائی ادارے نے 2016ء میں محکمہ سماجی بہبود کے تعاون سے ایک سروے کا انعقاد کیا۔ سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ خیبر پختونخوا میں 5,476 بچے ذہنی طور پر اور 4,826 جسمانی طور پر معذور تھے، جبکہ 4,241 کی قوت سماعت اور 3,438 کی بینائی کمزور تھی۔ 17-2016ء میں، خیبر پختونخوا حکومت نے خصوصی تعلیم کے لیے ایک ارب انہتر کروڑ روپے مختص کیے۔

9 مئی کو ایک اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ میں کہا گیا کہ سندھ حکومت صوبے کے مختلف اضلاع میں خصوصی بچوں کے لیے 12 نئے مراکز کے قیام کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ تاہم، سال کے آخر تک اس حوالے سے بہت کم پیش رفت دیکھی گئی۔

سفارشات

☆ پولیو وائرس کے خاتمے اور پولیو سے پاک پاکستان کے حصول کے لیے وفاقی اور صوبائی سطح پر کوششیں تیز کی جائیں۔ تاکہ 2017ء تک اس مرض میں نجات پائی جاسکے۔ صحت کی سہولیات، صاف پانی کی دستیابی اور غذائی تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے قابل علاج بیماریوں کے باعث بچوں کی اموات میں بھی کمی لائی جائے۔ ضلع تھرپارکر میں بچوں کی اموات پر قابو پانے کے لیے فوری اور موثر اقدامات کیے جائیں۔

☆ تعلیمی بجٹ میں اضافہ کیا جائے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ اسکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے والے رسمی اسکولوں تک رسائی ملے۔ بچوں کو اسکول جانے پر قائل کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول بھی قائم کیا جائے۔ انتہائی تربیت یافتہ اساتذہ کی بھرتی اور اسکولوں میں جسمانی سزا پر پابندی اس جانب دو اہم قدم ہوں گے۔

☆ بچوں کی گھریلو مشقت کو ایک خطرناک پیشہ قرار دیا جائے اور اس کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کیے جائیں۔ بچوں کی مشقت کے منظم خاتمے کے لیے درکار

درست پالیسی سازی کے لیے ایک چائلڈ لیبر سروے کا انعقاد کیا جائے۔

☆ ملک بھر میں پیدائش کے مفت اندراج کے حصول کے لیے حکمت عملی اور تمام صوبوں میں لڑکیوں کی شادی کی عمر کو 18 سال تک بڑھانے کے لیے قوانین کی منظوری اور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

☆ بچوں کے نظام انصاف کے ایک ایسے ڈھانچے کی بطور قومی ترجیح منظوری دی جائے جو بچوں کے حقوق کے بین الاقوامی اصولوں پر پورا اترتا ہو تاکہ ہمارے بچوں کو نظام انصاف میں پائی جانے والی خامیوں سے تحفظ فراہم کیا جاسکے اور مقدمے کی سماعت سے پہلے بچوں کی طویل حراست اور نوعمر بچوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کی روک تھام کی جاسکے۔اس کے علاوہ ایسے قیدیوں کی پھانسی کی سزا ختم کی جائے جو جرم کے ارتکاب کے وقت کم عمر تھے۔

☆ خصوصی بچوں کی سماجی اور معاشی ترقی کے لیے خصوصی پالیسی تشکیل دی جائے۔اس کے علاوہ ملک میں خصوصی بچوں کی درست تعداد سے متعلق کوائف اکٹھے کیے جائیں۔

محروم طبقوں کے حقوق

محنت کش

ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کہ ''ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام'' اور ''ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ'' پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے مناسب اقدامات کرے گی۔

آئین پاکستان
[آرٹیکل - 3]

غلامی نہ تو موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے۔ کوئی بھی قانون کسی بھی شکل میں، پاکستان میں اس کی اجازت فراہم نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے پاکستان میں متعارف کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہر قسم کی جبری مشقت اور انسانوں کی تجارت پر پابندی عائد ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بھی بچے کو کسی فیکٹری یا کان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

[آرٹیکل 11-(3-1)]

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت کے مفاد میں، یا امن عامہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کے تحت معقول پابندیاں عائد کی جائیں۔

[آرٹیکل 17-(i)]

ریاست کام کے منصفانہ اور مشفقانہ حالات متعارف کرانے کی پابند ہوگی۔

[آرٹیکل - 37-(c)]

ریاست جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنائے گی اور دولت کے ارتکاز اور تقسیم اور پیداوار کے ذرائع کو، چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روک کر، عوام کا معیار زندگی بہتر بنائے گی۔ ریاست، آجر اور ملازم، جاگیردار اور مزارع کے حقوق کے درمیان منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور ملک کے وسائل کے مطابق تمام شہریوں کو کام اور روزگار اور آرام کے مناسب مواقع سے روشناس کرائے گی اور ان کی تفریح کے لیے مواقع کی فراہمی کو بھی یقینی بنائے گی۔ ریاست، حکومت پاکستان کی ملازمت یا دوسرے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والے تمام افراد کو لازمی بیمہ یا دیگر ذرائع سے سماجی تحفظ فراہم کرے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر ان تمام افراد کو ضروریات زندگی مثلاً خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔۔۔ اور افراد کی آمدنیوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔

[آرٹیکل - 38 اے تا ای]

کسی شخص کو غلامی یا محکومی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل - 4]

ہر شخص کو، معاشرے کا رکن ہونے کے ناطے، سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل - 22]

ہر شخص کو کام کرنے، پیشے کا انتخاب کرنے، منصفانہ اور مناسب شرائط کار طے کرنے اور بیروزگاری کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو کسی امتیاز کے بغیر، مساویانہ کام کے بدلے مساویانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو کام کرتا ہے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کام کے عوض منصفانہ اور مناسب معاوضہ وصول کرے تا کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے وجود کو انسانی وقار کا اہل ثابت کر سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اسے دیگر سماجی تحفظ کے ذرائع سے مستحکم بھی کر سکے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر شخص کو یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔

[آرٹیکل 23(1 تا 4)]

ہر شخص کو آرام اور تفریح کا حق حاصل ہے۔ بشمول کام کرنے کی مدت کی مناسب حد اور تنخواہ کے ساتھ بوقت ضرورت چھٹی۔

[آرٹیکل - 24]

ہر شخص کو ایک ایسا معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے کافی ہو۔ بشمول خوراک، لباس، رہائش، طبی سہولیات، ضروری سماجی خدمات اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوہ یا بوڑھا ہونے کی صورت میں، ایسے حالات میں جو اس کی دسترس سے باہر ہیں، عدم روزگار کی صورت میں تحفظ کا حق۔

[آرٹیکل 25-(1)]

ریاست معاشی استحصال یا کسی ایسے کام، جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے یا بچے کی تعلیم، صحت یا جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی یا سماجی نشوونما میں رکاوٹ بن سکتا ہے، کے خلاف بچے کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔

بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کا کنونشن

[آرٹیکل 32-(1)]

سال 2016ء میں پاکستان کی چھ کروڑ دس لاکھ سے زائد کی افرادی قوت کو معاشی محرکات میں تبدیلی، محنت سے متعلق حقوق کے تحفظ کے کمزور اداروں جیسے مسائل اور ایک ایسی ریاست کا سامنا رہا جس نے بظاہر محنت کشوں کو ان کے رحم وکرم پر بے یار و مددگار چھوڑ رکھا ہے۔

اگرچہ محنت کشوں کی صحت اور تحفظ اور چائلڈ لیبر کی روک تھام سے متعلق چند قوانین (پنجاب میں) بنائے گئے تاہم محنت کشوں کے حقوق کے مجموعی نظام کو بہتر بنانے میں ناکامی، قوانین پر عمل درآمد نہ ہونے اور سہ طرفہ طریقہ کار میں مسلسل التوا، اور اس کے علاوہ یونین سازی کے حق کی عدم فراہمی کا نتیجہ محنت کشوں کے حقوق کی پامالی کو صورت میں نکلا۔

غیر ہنر مند مزدوروں کی کم سے کم اجرت

وفاق اور تمام صوبوں کے مالی سال 17-2016 کے بجٹ میں غیر ہنر مند مزدوروں کی کم سے کم ماہانہ تنخواہ 14,000 روپے مقرر کی گئی تھی۔ تاہم بڑے شہروں میں بھی ایسی متعدد شکایات سامنے آئیں کہ مزدوروں کو اس معمولی رقم سے بھی محروم رکھا گیا۔

محنت سے متعلق مشکلات

تازہ ترین لیبر فورس آف پاکستان سروے 15-2014 کے مطابق، کل افرادی قوت چھ کروڑ دس لاکھ چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھی جس میں 22 فیصد خواتین اور 67.8 فیصد مرد شامل تھے۔ زراعت، جنگلات اور ماہی گیری کے شعبے میں کام کرنے والے ملازمین کا تناسب 42.3 فیصد (گزشتہ افرادی قوت سروے میں یہ تناسب 43.5 فیصد تھا) تھا۔ صنعت کاری کے شعبے میں افرادی قوت کی شرح 15.3 فیصد رہی جس کے بعد تعمیرات، تھوک فروشی اور ریٹیل، ٹرانسپورٹ اور کمیونٹی سروس کا نمبر آتا ہے۔ زراعت کے سوا دیگر تمام شعبوں میں مرد ملازمین کی شرح کافی بلند رہی۔ غیر رسمی شعبے کا 7/10 (72.6 فیصد) سے زائد حصہ غیر زرعی ملازمین پر مشتمل تھا۔ شہری علاقوں (2 . 69 فیصد) کی نسبت دیہی علاقوں میں یہ تناسب (76.1 فیصد) زیادہ تھا۔ رسمی شعبے کی زیادہ سرگرمیاں دیہی علاقوں (23.9 فیصد) کی نسبت شہری علاقوں میں (30.8 فیصد) دیکھنے میں آئیں۔ سال 15-2014 میں رسمی شعبے میں اضافہ (26.4 فیصد، 27.4 فیصد) جبکہ غیر رسمی شعبے میں کمی (73.6 فیصد، 72.6 فیصد) کمی واقع ہوئی۔

پاکستان کی صرف ایک فیصد افرادی قوت یونینوں سے وابستہ تھی۔ تنظیم سازی کے فقدان کی وجہ سے محنت کشوں کے حقوق متاثر ہوئے۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں نے ان اقدامات کے خلاف جدوجہد کی جو ان کے حقوق کی خلاف ورزی کا باعث تھے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کا اظہار مندرجہ ذیل طریقوں سے کیا:

سرکاری ملازمین

سرکاری ملازمین کو عام طور پر تنخواہوں میں تاخیر، ترقیاں نہ ہونے، ملازمتیں مستقل نہ ہونے اور نجکاری جیسے مسائل کا سامنا رہا۔

پنجاب میں، اساتذہ نے حکومت کی جانب سے تنخواہوں میں اضافے اور ترقیوں کے لیے کوئی اقدام نہ کیے جانے کے خلاف مسلسل ہڑتالیں کیں۔ سرکاری شعبوں میں بہتر تنخواہوں کے حصول کے لیے باقاعدگی سے مظاہرے کئے۔ ینگ ڈاکٹرز نے بھی ملازمت کی شرائط میں اصلاحات کے لیے جدوجہد جاری رکھی، تاہم اس کی وجہ سے مریضوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سندھ میں ریونیو ملازمین نے احتجاجی مظاہرے کیے جن میں انہوں نے ترقیوں اور وقت پر مبنی الاؤنس کا مطالبہ کیا۔ آل پنجاب واٹر مینجمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن، ایگری کلچر واٹر مینجمنٹ ڈیپارٹمنٹ اور محکمہ زکوٰۃ وعشر سے وابستہ محنت کشوں نے اپنی ملازمتوں کی مستقلی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ خیبر پختونخوا میں فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی (ایف سی ایس) سندھ اور ورکرز ویلفیئر فنڈ اسکولوں سے وابستہ اساتذہ نے بھی تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز، جو 2010ء سے آل پاکستان لیڈی ہیلتھ ورکرز ویلفیئر ایسوسی ایشن کے تحت منظّم ہیں، نے تنخواہوں کی ادائیگی اور ملازمت کے تحفظ کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز کی تنخواہوں میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے نئے اخراجات کے گوشوارے میں ان کے لیے بجٹ مختص نہیں کیا تھا۔ آل پاکستان لیڈی ہیلتھ ورکرز ویلفیئر ایسوسی ایشن نے نئے اخراجات کے گوشوارے میں تبدیلی کے لیے عدالت عظمیٰ میں ایک پٹیشن بھی دائر کی۔

سرکاری شعبے کے منظّم ملازمین کو سیاسی قوتوں یا عوامی نمائندوں سے بہت کم مدد ملی۔ ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی یکجہتی کا اظہار نہیں کیا گیا، سوائے چند مثالوں کے جب (ستمبر میں) سینیٹ نے اسلام آباد میں اساتذہ کے احتجاج کے بعد سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں یومیہ اجرت پر خدمات انجام دینے والے اساتذہ کو مستقل کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی۔ ایسی ہی ایک اور مثال اس وقت دیکھنے کو ملی جب اراکین سینیٹ نے ورکرز ویلفیئر فنڈ کے اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائیگی کے معاملے پر ایوان کے اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔

نجکاری

نجکاری، جو ملازمتوں سے محرومی کا باعث بنتی ہے، کو توانائی کے شعبے، قومی ایئر لائن اور پاکستان اسٹیل ملز کے ملازمین کی شدید مزاحمت کا سامنا رہا۔ ریاست کئی سالوں سے ان اداروں کی نجکاری کی کوششیں کررہی ہے اور ملازمین نے اس اقدام کے خلاف کافی مزاحمت کی ہے۔ تاہم 2016ء میں خاص طور پر پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (پی آئی اے) کی نجکاری کے معاملے

نجکاری کی مخالفت بجلی وتوانائی، ایئرلائن اور پاکستان اسٹیل ملز کے ملازمین کے اہم ایجنڈے کا حصہ تھی

پرصورتحال تشدد کی شکل اختیار کرگئی۔

واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (واپڈا) کی نجکاری کی کوششیں جو 2012ء میں ناکام ہوگئی تھیں، 2015ء میں دوبارہ شروع کردی گئیں۔ واپڈا کے ملازمین، جو بنیادی طور پر پاکستان واپڈا ایمپلائز پیغام یونین اور آل پاکستان ہائیڈرو الیکٹرک ورکرز نامی تنظیموں سے وابستہ ہیں، نے پشاور سے لے کر فیصل آباد اور حیدرآباد تک ملک بھر میں ان اداروں کی مجوزہ نجکاری کے خلاف احتجاج کیا۔ ملازمین نے فیصل آباد الیکٹرک سپلائی کمپنی (فیسکو)، جامشورو پاور کمپنی-1 (جینکو-1) بشمول جامشورو پاور ہاؤس، کوٹری پاور ہاؤس اور حیدرآباد الیکٹرک سپلائی کمپنی (حیسکو) کی نجکاری کے منصوبوں کے خلاف بھی احتجاجی مظاہرے کیے۔ ان مظاہروں کا اظہار ریلیوں، دفاتر کی بندش اور بھوک ہڑتالوں کی شکل میں کیا گیا۔

پاکستان اسٹیل ملز (اس کے علاوہ واپڈا اور دیگر ادارے) ریاست کی زیر ملکیت ان 69 اداروں میں شامل تھے جن کی نجکاری کا فیصلہ حکومت نے اکتوبر 2013ء میں ایک باقاعدہ اعلان کے ذریعے کیا تھا۔ پاکستان اسٹیل ملز (پی ایس ایم) کے ملازمین کی تعداد 13,000 ہے اور ادارے کی نجکاری کے خلاف ملازمین کی مزاحمت کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ ایسے مزاحمتی اقدامات پر سب سے شدید ردعمل 2006ء میں دیکھنے میں آیا جب سپریم کورٹ نے اس وقت کی فوجی حکومت کی جانب سے اسٹیل مل کی نجکاری کی کوشش کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے اس وقت کے اس منافع بخش ادارے کی نجکاری کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔

پاکستان اسٹیل ملز (پی ایس ایم) کا خسارہ 400 ارب روپے ہے اور یہ جون 2015ء سے غیر فعال ہے جب سوئی سدرن گیس کمپنی نے 35 ارب روپے کے واجبات کی عدم ادائیگی پر اسے گیس کی فراہمی بند کر دی تھی۔ پاکستان سٹیل ملز کے ملازمین کو مئی 2016ء سے تنخواہیں نہیں ملیں۔ ریٹائرڈ ملازمین کی گریجوٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی ادائیگیاں بالترتیب 2013ء اور 2015ء سے تاخیر کا شکار ہیں۔ ستمبر 2016ء میں وزیر خزانہ نے اپریل اور مئی 2016ء کے لیے تنخواہوں کی ادائیگی کی منظوری دی جس کی رقم 76 کروڑ روپے بنتی تھی۔ انہوں نے چند ریٹائرڈ ملازمین کی گریجوئٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی ادائیگی کی بھی منظوری دی جس کی مجموعی رقم بتیس کروڑ بیس لاکھ اکیس ہزار روپے تھی۔ تاہم، اس سے ان 13,000 ملازمین کو کوئی ریلیف نہ ملا جو مقامی پرچون کی دکانوں سے بھی ادھار لے کر گزارہ کر رہے تھے۔ پاکستان سٹیل ملز کے ورکرز نے اگست۔ ستمبر 2016ء میں احتجاج کرتے ہوئے اپنی تنخواہوں کی ادائیگی، طبی سہولیات میں بہتری اور ریٹائرمنٹ سے پہلے کے واجبات اور دیگر واجبات کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ سٹیل مل کے مسلسل خسارے میں رہنے کے باعث سال کے آخر تک بھی اس کی نجکاری نہ ہوسکی۔ ملازمین کے نمائندوں، مینجمنٹ، یونینوں، سیاسی جماعتوں کی یونینوں اور پی ایس ایم سے وابستہ دیگر افراد پر مشتمل پاکستان اسٹیل ملز کے ملازمین کی مشترکہ ایکشن کمیٹی نے کہا کہ اب وہ پی ایس ایم کی بحالی اور اس کے آپریشنوں کے دوبارہ آغاز کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

پی آئی اے کی نجکاری بھی ریاست کی زیر ملکیت اداروں کی فروخت کے اس پیکج کا حصہ تھی جس کا اعلان 2013ء میں کیا گیا تھا۔ حکومت نے دسمبر 2015 کے آغاز میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (تبدیلی) آرڈیننس کی منظوری دی جس کے تحت پی آئی اے کو ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کیا جانا تھا اور اس کے 25 فیصد حصص ''اسٹریٹیجک سرمایہ کاروں'' کو دیے جانے تھے۔ اس آرڈیننس پر شدید سیاسی ردعمل اور اس معاملے پر وزارت خزانہ اور حزب اختلاف کے درمیان شدید محاذ آرائی دیکھنے میں آئی۔ سینیٹ کو اس بل کو منسوخ کرنا پڑا۔

جنوری 2016ء کے آخر میں، پی آئی اے کے ملازمین نے نجکاری کے خلاف احتجاج شروع کیا اور پی آئی اے کے بکنگ دفاتر اور ہیڈ کوارٹرز کو بند کر دیا۔ یکم فروری کو، لازمی سروس ایکٹ مجریہ 1952ء کا نفاذ کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت پی آئی اے ملازمین کے ہڑتال

کے حق سمیت دیگر حقوق ختم ہوگئے۔ ملازمین نے ایکٹ کے نفاذ کی مخالفت کرتے ہوئے نجکاری کے خلاف اپنا احتجاج جاری رکھنے اور 2 فروری کو اپنی پروازیں بند کرنے کے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کا اعلان کیا۔

2 فروری کو ملازمین نے کراچی ایئرپورٹ کے پرانے ٹرمینل پر جمع ہوکر لازمی سروس ایکٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ پولیس اور رینجرز نے انہیں منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج، آنسو گیس اور واٹر کینن کا استعمال کیا۔ اس محاذ آرائی کے دوران گولیاں چلائی گئیں جس کے نتیجے میں دو ملازمین ہلاک ہوگئے۔ ملازمین اور رینجرز نے ایک دوسرے پر فائرنگ میں پہل کرنے کا الزام عائد کیا۔ ایچ آر سی پی نے ہلاکتوں پر شدید تشویش کا اظہار کیا اور حکومت پر زور دیا کہ وہ پی آئی اے ملازمین کے خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے معاملے کو فوری اور دوستانہ طور پر حل کرے۔

اس وقت قومی بحران بھی پیدا ہوگیا جب پی آئی اے کے عملے نے فلائٹ آپریشن بند کردیے، جس کے نتیجے میں اربوں روپے کا نقصان ہوا اور سینکڑوں مسافروں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ملازمین نے فروری کے وسط تک فلائٹ آپریشنوں کا بائیکاٹ جاری رکھا۔ وزیراعلیٰ پنجاب نے ثالث کا کردار ادا کیا جس کے باعث بالآخر ملازمین نے بائیکاٹ ختم کردیا۔ وزیراعلیٰ نے ملازمین کو یقین دہانی کرائی کہ پی آئی اے کی نجکاری کی صورت میں ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

تاہم، پی آئی اے کی جوائنٹ ایکشن کمیٹی کی جانب سے احتجاج ختم کیے جانے کے ایک روز بعد، پی آئی اے نے 11 ملازمین کو برطرف کردیا اور لازمی سروس ایکٹ کی خلاف ورزی کے الزام میں 165 دیگر ملازمین کو شوکاز نوٹس جاری کیے۔

اپریل میں، بالآخر پی آئی اے کی نجکاری روک دی گئی جب پارلیمان نے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کارپوریشن (تبدیلی) ایکٹ 2016ء کی منظوری دی جو ایئرلائن کو ایک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کرنے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن حکومت کو اس کے انتظامی اختیار سے دستبردار ہونے سے روکتا ہے۔

اکتوبر میں، حکومت نے ایک مرتبہ پھر پی آئی اے کی نجکاری کا اعلان کیا اور آئی ایم ایف سے کیے گئے وعدے کے مطابق اس کی بولی کا عمل 2017ء تک مکمل کیا جانا تھا۔ حکومت نے مالی سال 17-2016 کے آخر تک پاکستان اسٹیل ملز، کوٹ ادو پاور کمپنی (کیپکو)، فیسکو، آئیسکو اور لیسکو کی نجکاری کا عمل مکمل کرنے کے لیے 17-2016ء میں بھی مختلف حتمی تاریخوں کا اعلان کیا۔

اوکاڑہ کے مزارعین

اوکاڑہ میں مزارعین کی اراضی کے ملکیتی حقوق، جس پر وہ کئی نسلوں سے کاشتکاری کررہے تھے، کے لیے 15 سال سے جاری جدوجہد ایک مرتبہ پھر توجہ کا مرکز بنی جب انجمن مزارعین پاکستان (اے ایم پی) نے 17 اپریل 2016ء کو مزارعین کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا۔ اس دن سے قبل، انتظامیہ نے لاہور میں ہونے والے ایک بم دھماکے کے تناظر میں، سکیورٹی کا بہانہ بنا کر دفعہ 144 نافذ کردی اور ایک بہت بڑا کریک ڈاؤن شروع کردیا اور اے ایم پی کے کارکنان کو گرفتار اور ہراساں کیا جس سے خوف کی فضاء قائم ہوگئی۔ اس اقدام کو قومی ایکشن پلان کا حصہ قرار دیا گیا جس کا مقصد ملک میں دہشت گردی کی کارروائیوں کو روکنا تھا۔

خواتین سمیت 35 افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں دو معذور افراد بھی شامل تھے۔ ان محنت کشوں کو دہشت گردی سے متعلق جرائم کے تحت گرفتار کیا گیا۔ جب انہیں انسداد دہشت گردی کی عدالت میں پیش کیا گیا تو سرکاری وکیل نے کہا کہ گرفتار کیے گئے ان پانچ مزارعین پر انسداد دہشت گردی کے قوانین کے تحت مقدمہ چلایا جائے جسے عدالت نے مسترد کردیا۔ جج نے حکم دیا کہ ایف آئی آر میں سے انسداد دہشت گردی ایکٹ (اے ٹی اے) کی دفعات خارج کی جائیں۔ عدالت نے پولیس کو انہیں مقامی جج کے سامنے پیش کرنے کی بھی ہدایت کی۔

ان گرفتاریوں کے علاوہ، اے ایم پی کے اراکین کے خلاف وسیع پراپیگنڈا کیا گیا اور انہیں جرائم پیشہ اور غاصب قرار دیا گیا۔ پولیس نے اے ایم پی کے سیکریٹری جنرل مہر ستار کے خلاف 28 فوجداری مقدمات درج کیے اور بعد ازاں انہیں گرفتار کرلیا۔ کریک ڈاؤن کے باوجود، اے ایم پی نے اپریل کے آخر میں لاہور اور اسلام آباد میں احتجاج کیا۔

قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) نے ''صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد کو اوکاڑہ بھیجا تاکہ نہ صرف مزارعین کی گرفتاریوں کے مسئلے کو فوری طور پر حل کیا جاسکے بلکہ اس مسئلے کا ایک ایسا مستقل حل بھی نکالا جاسکے جو تمام فریقین کے لیے قابل قبول ہو۔

وفد نے اے ایم پی کے قائدین، سول سوسائٹی کے اراکین، ڈی سی او، ڈی پی او، اوکاڑہ ملٹری فارمز کے کمانڈنٹ اور عوامی ورکرز پارٹی کی قیادت سے ملاقات کی۔ جون 2016ء میں جاری ہونے والی ٹیم کی رپورٹ میں پیش کیے گئے مشاہدات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

☆ اوکاڑہ کی مقامی انتظامیہ کی جانب سے اے ایم پی کے پرامن اجتماعات پر اپریل

2016ء سے عائد کی گئیں پابندیاں بے جا اور غیر آئینی معلوم ہوتی ہیں۔

☆ مقامی انتظامیہ نے اے ایم پی کی قیادت کے خلاف کارروائی اور دہشت گردی کے خلاف قومی ایکشن پلان (نیپ) کے درمیان تعلق قائم کرتے ہوئے واقعات کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس کی بنیاد اچھی نیت پر نہیں بلکہ یہ ظالمانہ ہے۔ خاص طور پر اے ایم پی کے اراکین / رہنماؤں کے خلاف انسداد دہشت گردی کی دفعہ 7 کا استعمال بلاجواز ہے۔

☆ عام شہریوں کے خلاف بھاری فوجی گاڑیوں کا استعمال اور ہتھیاروں کی نمائش، خاص طور پر ایک ایسے علاقے میں جہاں پہلے ہی فوج ایک بڑی تعداد میں موجود ہے، طاقت کے بے جا استعمال کی عکاسی کرتی ہے، جس سے نہ صرف ملک کا مفاد خطرے میں پڑ سکتا ہے بلکہ اس سے سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی ساکھ بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

☆ اے ایم پی کے قائد مہر عبدالستار کے خلاف درج کیے گئے۔ تین مقدمات میں، وہ تحقیقات کے دوران بے گناہ ثابت ہوئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس اور مقامی انتظامیہ نے اے ایم پی اور اس کی قیادت کے خلاف مجموعی طور پر بے جا ردعمل کا اظہار کیا ہے۔

☆ اے ایم پی کے حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جس کا اندازہ بلدیاتی انتخابات اور عام انتخابات میں اے ایم پی کے امیدواروں کے حق میں ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے، لہٰذا اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ چند سیاسی مفادات کے لیے صورتحال کو اے ایم پی کے خلاف استعمال کیا گیا ہو۔

ایچ آر سی پی نے اس بات پر شدید تشویش کا اظہار کیا کہ انتظامیہ انجمن مزارعین پاکستان (اے ایم پی) کو ان کے پرامن احتجاج کے حق اور ایک کنونشن کے انعقاد سے محروم رکھ رہی ہے جس کا مقصد ایک ایسی اراضی کے ملکیتی حقوق کے لیے ان کی طویل جدوجہد کی جانب توجہ مبذول کرانا ہے جس پر وہ کئی دہائیوں سے کاشت کاری کر رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی نے حکام پر زور دیا کہ وہ کسانوں کے خلاف انسداد دہشت گردی کے قانون کے تحت کارروائی نہ کریں اور ان کے پرامن احتجاج کے حق اور اجتماع کی آزادی کا احترام کریں۔

اگرچہ یہ مسئلہ سینیٹ میں اٹھایا گیا تاہم اے ایم پی کے کارکنان کی کوئی دادرسی نہیں کی گئی جنہیں کاشت کی گئی زمین کی ملکیت کا جائز مطالبہ کرنے پر مسلسل تشدد کا سامنا ہے۔

کراچی کے کینٹ اسٹیشن کے قلی

اپریل 2016ء میں، کراچی کے ریلوے اسٹیشن کینٹ کے قلی ایک ایسے استحصالی ٹھیکیداری نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جس کے باعث انہیں مجبوراً اپنی کمائی کا 40 فیصد ۔۔۔ 40 کلوگرام کے سامان پر 30 سے 40 روپے یا زیادہ سے زیادہ 500 روپے یومیہ کے علاوہ ماہانہ 750 روپے ٹھیکیدار کو ادا کرنا پڑتے تھے۔ انہیں ایسا اپنی ملازمت کی ایک شرط کے باعث کرنا پڑتا تھا۔ قلیوں نے کام بند کردیا۔ ٹھیکیدار اور اس کے آدمیوں کے درمیان چپقلش ہوئی جس کے بعد پولیس نے طاقت کا استعمال کیا اور کم از کم آٹھ مظاہرین کو گرفتار کرلیا اور مہلک ہتھیاروں کے ساتھ فساد برپا کرنے پر ان کے خلاف دفعہ 144 اور 148 کے تحت مقدمات درج کر لیے۔ سابقہ نظام کے تحت، جو سال 2000ء تک نافذ رہا، قلیوں کو انفرادی لائسنس دیے جاتے تھے اور ان کی آمدن میں سے یومیہ کٹوتی کی بجائے، انہیں ٹھیکیدار کو ایک سالانہ فیس ادا کرنا ہوتی تھی۔

اگرچہ قلی ریلوے سروسز کا لازمی حصہ ہیں تاہم اس کے باوجود ریلوے کے نظم ونسق اور ملازمت کے ضوابط کے تحت انہیں ریلوے ملازمین کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہ اب بھی بے ضابطہ ملازمین ہیں۔ ٹھیکیداری یومیہ فیس کے علاوہ، انہیں قلی کے طور پر رجسٹر ہونے کے لیے 1000 سے 3000 روپے، ٹوکن اور بیج کے لیے 60 روپے، وردی کے لیے 250 روپے، اور نارنجی پگڑی کے لیے 60 روپے ادا کرنا پڑتے ہیں۔ چونکہ وہ یومیہ اجرت پر کام کرتے ہیں اس لیے ان کی آمدن مکمل طور پر پیش کردہ خدمات سے منسلک ہوتی ہے۔ وظائف، گریجوئٹی، یا انشورنس کا تو کوئی تصور ہی نہیں۔ انہیں جو واحد ''مراعات'' حاصل ہیں وہ یہ ہیں کہ انہیں اور ان کی شریک حیات کو سفری پاس دیے جاتے ہیں، انہیں ریلوے کے ہسپتالوں میں بیرونی مریضوں کی طبی سہولیات حاصل ہوتی ہیں اور انہیں آرام کے لیے قلیوں کی پناہ گاہوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

یہ کشیدہ ماحول کئی دنوں تک قائم رہا۔ ملازمین کو سول سوسائٹی کے کارکنوں کی حمایت حاصل تھی جن میں انسانی حقوق کے کارکنان، قانونی پیشہ ور افراد، سول سوسائٹی کے کارکن اور دیگر شامل تھے۔ جب ملازمین ضمانت پر رہا ہوئے تو ایک عدالتی مقدمہ بھی درج کیا گیا۔

اپریل 2016ء کے بعد، ٹھیکیداری نظام کے خلاف ایک اجتماعی تحریک کے لیے فضا سازگار تھی۔ تاہم، یہ تحریک محض چند دن جاری رہی اور ملازمین کے درمیان نفاق، ٹھیکیدار کے دباؤ اور بالآخر دونوں فریقین کے درمیان مصالحت کے باعث ختم ہوگئی۔

زرعی محنت کش

تنظیم سازی کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس سال بھی کسانوں کے پیکج، سبسڈیوں، امدادی قیمت اور دیگر مراعات کے مطالبات پورے نہ ہوسکے۔

سندھ حکومت نے سندھ صنعتی تعلقات ایکٹ 2013ء کے تحت تنظیم سازی کے حق کا دائرہ زرعی شعبہ تک وسیع کیا۔ تاہم، وہ ملازمین جو نہ تو رجسٹرڈ ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ریکارڈ ہے، انہیں اس حق کی فراہمی کے لیے ایک امدادی طریقہ کار تشکیل نہ دیا جاسکا۔ زرعی ملازمین کو تنظیم سازی اور استعداد سازی کے حوالے سے سیاسی جماعتوں، اتحادوں اور این جی اوز پر مشتمل سول سوسائٹی کی جانب سے کافی مدد ملی۔ سندھ ایگریکلچرل جنرل ورکرز یونین، زرعی ملازمین یونین میرپورخاص، زرعی ملازمین یونین سکھیو میراجت اور زرعی ملازمین یونین جمال داہری (صرف خواتین ملازمین جو عام طور پر کپاس چنتی ہیں) جیسی تنظیمیں بھی سندھ صنعتی تعلقات ایکٹ 2013ء میں زرعی ملازمین سے متعلق شقوں کی بدولت کام کر رہی تھیں۔

2016ء میں، اداروں، طریق ہائے کار اور ان دفعات میں کوئی اصلاح نہیں دیکھی گئی جو زرعی ملازمین کی روزمرہ زندگی، بشمول طویل عرصے سے زیرالتوا زرعی اصلاحات، کم سے کم اجرت تک رسائی اور سوشل سکیورٹی، کام کے بہتر حالات، ہاری عدالتوں، گروی مشقت کی شرط کے خاتمے اور ملک بھر میں زرعی ملازمین کے تنظیم سازی کے حق پر اثر انداز ہوتیں۔

حیدرآباد میں ایچ آر سی پی کے دفتر نے قرض کی غلامی کے متاثرین کی رہائی کے لیے معاونت بشمول قانونی امداد فراہم کی۔ ایچ آر سی پی نے قرض کی غلامی سے رہا کرائے گئے افراد کے اعداد و شمار بھی قلم بند کیے۔ 2016ء میں، سندھ میں ضلعی عدالتوں کے احکامات پر 3,604 گروی مزدوروں کو رہا کرایا گیا۔

سندھ میں بازیاب کرائے گئے گروی مزدور-2016

ضلع	رہائی پانے والے مزدور
عمرکوٹ	793
میرپورخاص	866
بدین	470
سانگھڑ	493
ٹنڈوالہیار	251
نواب شاہ	22
شکارپور	16
حیدرآباد	86
ٹنڈو محمد خان	17
خیرپور	182
تھرپارکر	241
ٹھٹھہ	156
نوشہروفیروز	11
کل	3604

سمندر پار محنت کش

بیورو آف امیگریشن اینڈ اوورسیز امپلائمنٹ (بی ای او ای) کے مطابق، 1971ء اور اکتوبر 2015ء کے درمیان چھیاسی لاکھ پاکستانی محنت کش ملازمت کے لیے بیرون ملک گئے۔ ان میں سے 50 فیصد سعودی عرب گئے تھے۔

2016ء میں تقریباً 8,000 پاکستانی کئی دنوں تک سعودی عرب میں پھنسے رہے کیونکہ سعودی عرب کی تعمیراتی کمپنیوں نے معیشت کی سست روی کا حوالہ دیتے ہوئے ملازمتوں میں تخفیف کر دی تھی۔ باوجود اس کے کہ سعودی عرب پاکستان کا قریب ترین تجارتی اور سٹریٹیجک سکیورٹی ساتھی ہے، یہ ملازمین کئی ہفتوں تک سعودی عرب میں پھنسے رہے جس کے بعد حکومت نے ان کی واپسی کا بندوبست کیا۔

پاکستان اور خلیج ممالک میں تارکین وطن محنت کشوں کی انصاف تک رسائی سے متعلق انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (آئی ایل او) کی ایک رپورٹ میں اس بات کا مشاہدہ کیا گیا کہ ''حکومت پاکستان کے پاس نقل مکانی سے متعلق کوئی پالیسی نہیں ہے جو پاکستان میں محنت کشوں کی نقل مکانی کے انتظام کے حوالے سے اداروں، تنظیموں اور افراد کی سمت متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ نتیجتاً، تارکین وطن محنت کشوں کے مسائل کے حل کے لیے کوئی حکمت عملی موجود نہیں۔ نہ ہی تارکین وطن محنت کشوں کو درپیش متعدد مسائل کے حل کے لیے کوئی پالیسی موجود ہے۔ واضح پالیسی اصول سرکاری ایجنسیوں اور دیگر فریقین کے درمیان بہتر رابطوں کو یقینی بنائیں گے، اور حکومت کو یہ موقع فراہم کریں گے کہ وہ ان ممالک کے ساتھ مفاہمت کی یادداشتوں (ایم او یوز) پر مشاورت کرتے وقت پاکستانی انسانی سرمائے کی درآمدگی شرائط طے کرے۔''

محنت کشوں پر اثر انداز ہونے والے قوانین، پٹیشنیں اور لابنگ

قانون سازی اور حقوق

پارلیمان نے رواں سال کے دوران وفاقی سطح پر محنت کشوں کے حقوق سے متعلق کوئی خاص قانون سازی نہیں کی۔ تاہم، زیر جائزہ سال کے دوران صوبائی اسمبلیوں کی جانب سے منظور کیے گئے قوانین میں محنت کشوں کے حقوق اور بہبود کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ ان میں درج ذیل قوانین شامل ہیں:

سندھ

☆ سندھ کمپنیز پرافٹ (ملازمین کی شرکت) ایکٹ 2015ء۔

☆ سندھ شرائط ملازمت (احکام جاریہ) ایکٹ 2015ء۔

☆ سندھ فیکٹریز ایکٹ 2015ء۔

☆ سندھ شاپس اینڈ کمرشل اسٹیبلشمنٹ ایکٹ 2015ء۔

☆ سندھ ایمپلائز سوشل سکیورٹی ایکٹ 2016ء۔

☆ سندھ ورکرز معاوضہ ایکٹ 2016ء۔

☆ سندھ کم ازکم اجرتوں کا ایکٹ 2015ء۔

بلوچستان

☆ بلوچستان چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ 2016ء۔

☆ بلوچستان صنعتی تعلقات (ترمیمی) ایکٹ نمبر 15 بابت 2015ء۔

☆ بلوچستان کام کی جگہ پر خواتین کو ہراساں کیے جانے سے تحفظ فراہم کرنے کا ایکٹ نمبر 1 بابت 2016ء۔

پنجاب

☆ پنجاب بھٹوں پر چائلڈ لیبر کی ممانعت کا بل 2016ء۔

خیبر پختونخوا

خیبر پختونخوا بوائلر ز اینڈ پریشر ویسلز ایکٹ 2016ء (سخت حفاظتی ضوابط)

بھٹوں پر چائلڈ لیبر

بھٹوں کا شعبہ، جو کہ زیادہ تر پنجاب میں موجود ہے، گروی مشقت کا دوسرا نام ہے۔ پاکستان کے گروی مشقت سے متعلق قانون "گروی مشقت کے خاتمے کا ایکٹ 1992ء میں گروی مزدوروں کی تعریف کی رو سے بھٹے کے شعبہ میں کام کرنے والے مزدور لازمی طور پر گروی مزدور ہیں، کیوں کہ وہ اپنے یا اپنے خاندان کی ضرورت کے لیے اپنے قرض خواہوں سے پیشگی رقم کے بدلے اپنی محنت پیش کرتے ہیں اور اپنی آزادیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کم اجرت، جو اس وقت 1,036 روپے فی ہزار اینٹ ہے، شدید غربت اور صحت اور رہائشی سہولیات تک عدم رسائی

کے علاوہ خاندانی اکائیوں کے طور پر کام کرنے والے مزدوروں کو بطور پیشگی معقول قرض لینے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

سال 2016ء میں، پنجاب حکومت نے بھٹے کے شعبہ میں خصوصی اقدامات متعارف کرانے کا فیصلہ کیا جن میں بچوں کے حقوق پر خاص توجہ دی گئی۔ ان اقدامات کا مقصد بھٹہ مزدوروں اور مالکان کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بنانا تھا۔ پنجاب حکومت نے مزدور کو دیے جانے والی پیشگی رقم کی حد 50,000 مقرر کی۔

یہ اقدامات ''پنجاب میں بھٹوں پر چائلڈ لیبر کی ممانعت کا ایکٹ 2016ء'' کا حصہ تھے جو جنوری میں آرڈیننس کے طور پر منظور کیا گیا تھا اور بعد ازاں صوبائی اسمبلی نے اگست 2016ء میں اسے بطور بل منظور کیا۔ یہ بل بھٹوں پر 14 سال سے کم عمر بچوں کی ملازمت کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والا فرد سات دن سے لے کر چھ ماہ قید کی سزا اور 50,000 سے 100,000 روپے جرمانے کا مستوجب ہوگا۔

پنجاب حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس بل پر عمل درآمد کے لیے اپنے مزدور کی نگرانی کے نظام کو مزید بہتر بنایا ہے۔ حکام کے مطابق، صوبے بھر میں بھٹوں کے 8,000 معائنے کیے گئے اور پنجاب بھٹوں پر چائلڈ لیبر کی ممانعت کے ایکٹ کی خلاف ورزی پر 500 سے زائد بھٹہ مالکان کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے 213 پر عدالتوں کی جانب سے سزائیں اور جرمانے عائد کیے گئے۔

اس اقدام کی بھٹہ مالکان نے شدید مخالفت کی جنہوں نے حکومت پر ان کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کا الزام عائد کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اینٹوں کی تیاری کے لیے بچوں کو استعمال کرنا مزدوروں کے خاندان کا اپنا فیصلہ تھا اور بھٹہ مالکان کو اس سرگرمی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ پنجاب حکومت کا دعویٰ تھا کہ اس بل کے نفاذ کے بعد بھٹوں پر چائلڈ لیبر 28 فیصد سے کم ہو کر 2 فیصد رہ گئی ہے۔

کسی آزادانہ تحقیق یا سروے کی غیر موجودگی کے باعث اس قانون پر عمل درآمد یا اس کے اثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم، سوائے اس قانون کے، بھٹے کا شعبہ جو مالکان اور ملازمین کے درمیان استحصالی تعلق کا گڑھ تھا، میں اصلاحات کے لیے کسی قسم کے ٹھوس اقدامات نہیں کیے گئے۔ پنجاب میں، بھٹہ مزدوروں نے، جو بھٹہ مزدور یونین کی شکل میں منظم ہیں،

متعدد احتجاجی مظاہرے کیے جن میں انہوں نے بھٹہ مزدوروں کے لیے 1036 روپے فی 1000 اینٹ کی کم از کم اجرت کے حکومتی نوٹیفکیشن پر عمل درآمد کا مطالبہ کیا۔ سال 2016ء کے دوران بھی بھٹہ مزدوروں کی غیر قانونی حراست پر مالکان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور ریاست عام طور پر محنت کش طبقے کی صرف آزادی کے بارے میں فکرمند رہی۔

ایچ آرسی پی نے چائلڈ لیبر پر ایک ورکشاپ منعقد کی جس میں سول سوسائٹی کی تنظیموں اور حکومتی نمائندوں نے شرکت کی۔ ورکشاپ میں کہا گیا کہ حکومت کی جانب سے مثبت اقدامات، تعلیمی سبسڈیوں کی فراہمی اور بھٹوں پر چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے کیے گئے اقدامات کے باوجود اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ایچ آرسی پی نے جن اہم معاملات پر حکومتی توجہ اور مداخلت کا مطالبہ کیا ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

- ☆ چائلڈ لیبر کا ایک جامع سروے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کے سروے کے برعکس، اس سروے میں زرعی اور گھریلو مزدور بھی شامل ہونے چاہئیں جن کی ایک بڑی تعداد چائلڈ لیبر کا شکار ہے۔
- ☆ تعلیم کے حق سے متعلق آئین کے آرٹیکل 25-A کے من و عن نفاذ کی ضرورت ہے۔
- ☆ بے گھر بچوں کے اندراج سے متعلق قانون سازی کی جائے اور ان کے تحفظ کے لیے سہولیات فراہم کی جائیں۔
- ☆ سرکاری تعلیم کا مقصد بچوں کی ملازمت کے معقول متبادل کی فراہمی ہونا چاہئے۔
- ☆ حکومت کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہئے کہ چائلڈ لیبر عمومی ترجیحی اسکیم (جی ایس پی +) کے نظام کا لازمی حصہ ہے اور اگر یورپی یونین کے معاشی فوائد کو برقرار رکھنا ہے تو اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔

سوشل سکیورٹی اور پنشنیں

2016ء میں تمام لوگوں کی سوشل سکیورٹی تک رسائی کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ ای او بی آئی کی ویب سائٹ کے مطابق بیمہ شدہ افراد کی کل تعداد 7,099,221 جبکہ فعال مالکان کی تعداد 78,000 تھی۔ ورکرز ویلفیئر فنڈ (ڈبلیو ڈبلیو ایف) مزدوروں کو دی گئی

مراعات کی ایک فہرست فراہم کرتی ہے۔ عدالت عظمیٰ نے اعلان کیا کہ ایف بی آر مالکان سے ورکرز ویلفیئر فنڈ غیر محصول شدہ شے کے طور پر وصول کرے گا۔ ایف بی آر پاکستان بھر کے مالکان سے ورکرز ویلفیئر فنڈ کی مد میں 20 ارب روپے وصول کرتا ہے۔ 2010ء میں اختیارات کی منتقلی کے بعد ڈبلیو ڈبلیو ایف ایک صوبائی موضوع بن گیا تھا لیکن سال کے آخر تک اس حوالے سے عملی اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔

اکتوبر 2016ء کے آخر میں عدالت عظمیٰ نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے ریٹائرڈ ملازمین کو پنشن کی عدم ادائیگی کا ازخود نوٹس لیا۔ اس ازخود نوٹس سے پہلے کئی پیش رفتیں دیکھنے میں آئی تھیں جن میں عدالت عالیہ لاہور کا ایک مقدمہ بھی شامل تھا جس کا تعلق معمر وظیفہ داروں کو واجب الا دا دگنی پنشن کی عدم ادائیگی سے تھا۔ کراچی میں کے ایم سی کے ایک ریٹائرڈ ملازم کو نامکمل دستاویزات کا بہانہ بنا کر پنشن سے مسلسل محروم رکھا گیا جس سے دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کر لی۔

عدالت نے پنشن کے مسئلے کو ایک بنیادی حق کے طور پر حل کرنے پر زور دیا اور پنشن کی عدم ادائیگی کے حوالے سے وفاقی اور صوبائی حکومت کے رویے کو غیر ذمہ دارانہ اور ادائیگی میں تاخیر کو ایک بنیادی حق کی خلاف ورزی قرار دیا۔ دوسری جانب حکومت نے اس مسئلے کو ایک انفرادی کیس قرار دیا اور کہا کہ تاخیر کا سبب انتظامی اور کاغذی کارروائی میں حائل رکاوٹیں تھیں۔

سال کے آغاز میں، عدالت نے ماضی میں ریاست کی زیر ملکیت رہنے والے ادارے پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی لمیٹڈ (پی ٹی سی ایل) کے ملازمین کو پنشنوں اور دیگر مراعات کی فراہمی سے متعلق اپنے 2011ء کے فیصلے کو بھی برقرار رکھا۔ مذکورہ ادارے کی 2006ء میں نجکاری کی گئی تھی۔ اپنے مختصر حکم میں بنچ نے فیصلہ دیا کہ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف (ٹی اینڈ ٹی) کے ملازمین کی ملازمت کے ضوابط کو قانونی تحفظ حاصل تھا اور نجکاری کے وقت ملازمین کو یہ حق دستیاب تھا۔

صحت اور تحفظ

پاکستان افرادی قوت سروے 15-2014 میں مشاہدہ کیا گیا کہ ملازمت کرنے والے 25 میں سے تقریباً ایک (4 فیصد) فرد نے سروے کی تاریخ سے قبل 12 ماہ کے دوران زخمی ہونے یا بیماری کی شکایت کی جس کے نتیجے میں یا تو کام کے اوقات کا ضیاع ہوا یا پھر ڈاکٹر

سے رجوع کرنے میں تاخیر ہوئی۔ سروے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ متاثرین کا تعلق عام طور پر زراعت (48 فیصد)، تعمیرات (16.3 فیصد)، مینوفیکچرنگ (15.9 فیصد)، ٹرانسپورٹ/سٹوریج اور ابلاغ (7.5 فیصد) اور تھوک فروش اور پرچون تجارت (7.1 فیصد) سے تھا۔ بقیہ گروہوں میں مردوں کو زیادہ خطرات کا سامنا ہے۔

2016ء میں کام کی جگہ پر پیش آنے والے ہر حادثے کی تفصیلات فراہم کرنا مشکل ہے جس کی دو وجوہات ہیں: اول یہ کہ کام کی جگہ پر حادثات، چوٹ یا اموات کا کوئی سرکاری ریکارڈ موجود نہیں۔ ایسے واقعات صرف میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آتے ہیں۔ دوم، میڈیا کے ذریعے جامع تفصیلات حاصل نہیں ہوسکتیں کیوں کہ ایسے کئی واقعات ہیں جو صرف مقامی میڈیا میں رپورٹ ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی قومی اخبارات کی زینت نہیں بنتے۔ جب تک حکومت کام کی جگہ پر ہر حادثے کے اندراج کے لیے اقدامات نہیں کرتی اس وقت تک صحت اور تحفظ سے متعلق قابل بھروسا اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوسکتے۔

ایچ آر سی پی کی ویب سائٹ پر یکم جنوری 2016ء سے 31 دسمبر 2016ء تک مزدوروں کے حقوق کی صورتحال سے متعلق شائع ہونے والی خبروں سے اکٹھے کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق، کام کی جگہ پر زیادہ تر حادثات کانوں میں (نوشہرہ، بانڈ، اڈا داؤد شاہ، لسبیلا، ضلع لورالائی اور اورکزئی ایجنسی میں ہوئے۔ 12 مارچ کو صوبہ خیبر پختونخوا میں اورکزئی ایجنسی کے علاقے ڈولی میں پیش آنے والے واقعہ میں 10 مزدور جاں بحق ہوئے)، بجلی کے شعبہ (لیسکو ملازمین کے مطابق، جنوری سے اکتوبر 2016ء تک ڈیوٹی کے دوران 120 سے زائد ملازمین اپنی زندگیوں سے محروم ہوگئے)، پانی اور صحت وصفائی کے شعبہ، تعمیرات کے شعبہ میں (اورنج لائن منصوبے میں دو بڑے حادثات پیش آئے) اور ٹیکسٹائل کے شعبے میں کیمیکل ڈیپارٹمنٹ میں پیش آئے۔ سب سے بڑا حادثہ اکتوبر 2016ء کے آخر میں گڈانی میں پیش آیا جہاں جاپان کے بنے ہوئے ایک 24,000 ٹن وزنی آئل ٹینکر ایم ٹی ایسز میں آگ بھڑک اٹھی۔ آتش زدگی کا سبب حفاظتی اصولوں کی عدم تعمیل کو قرار دیا گیا۔ یومیہ اجرت پر کام کرنے والے تقریباً 300 مزدور بحری جہاز کو توڑنے میں مصروف تھے جسے حفاظتی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، خالی نہیں کیا گیا تھا۔ گرمی اور ویلڈنگ کی وجہ سے بحری جہاز میں آگ لگ گئی۔ ملازمین نے میڈیا کو بتایا کہ ''مالکان چاہتے تھے کہ بحری جہاز کو جلد سے جلد ریزہ ریزہ کیا جائے تا کہ انہیں ان کے واجبات مل سکیں۔'' یہ حفاظتی پروٹوکول کی خلاف ورزی تھی جس میں سب سے پہلے بحری

بیس لاکھ بچے پاکستان کی بھٹہ فیکٹریوں میں کام کررہے ہیں۔ بارش کے دنوں میں ان کی تنخواہ آدھی ہوجاتی ہے۔
انہیں روزگار کا تحفظ یا صحت کی سہولیات دستیاب نہیں ہیں

جہاز میں سے تیل نکالنا لازمی ہے۔اس کے بعد حکومتی ایجنسیاں، کسٹمز، ماحولیاتی تحفظ کا ادارہ اور بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے معائنے/جائزے کا مرحلہ آتا ہے جو جانچ پڑتال کے بعد جہاز کو اکھاڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔اس حادثے میں 26 مزدور جاں بحق ہوئے جبکہ بحری جہاز تقریبا 48 گھنٹوں تک جلتا رہا۔

اس حادثے کے بعد (حتیٰ کہ اس سے پہلے بھی) میڈیا نے گڈانی میں کام کی جگہ سے متعلق حفاظتی اقدامات اور مزدوروں کے حقوق کی صورتحال کے بارے میں جامع تفصیلات فراہم کیں۔مزدوروں کا نہ صرف کم معاوضے (500 سے 800 روپے)، کام کے بدترین حالات اور تنظیم سازی کے خلاف شدید ردعمل کے ذریعے استحصال کیا جاتا تھا بلکہ انہیں معقول رہائش، پینے کا صاف پانی اور ہسپتالوں جیسی سماجی سہولیات بھی میسر نہیں تھیں۔ حادثے کے بعد زخمی مزدوروں کو کراچی لے جانا پڑا تھا۔

صحت کی نگہداشت کے فعال مراکز کی غیر موجودگی خاص طور پر ایک خوفناک امر تھا کیوں کہ شپ بریکنگ یارڈ پر غیر مقررہ جگہوں پر رکھی گئی بھاری اشیاء کی موجودگی، اور ٹھیکیداروں اور بحری جہاز کے مالکان کی جانب سے صحت اور تحفظ کو نظر انداز کیے جانے کے باعث حادثات روزمرہ کا معمول ہیں۔ چونکہ ملازمین کو ٹھیکیداروں کے ذریعے بھرتی کیا جاتا ہے اس لیے ایک ایسی ملازمت جس میں حادثے کا خطرہ سب سے زیادہ ہے، اس میں ملازمین کے لیے معاوضے

یا بیمہ کی سہولت موجود نہیں۔ ریاست بھی اس مجرمانہ نظام کی فریق ہے۔ صوبائی اور وفاقی حکومت نے نہ صرف ملازمین کے تحفظ کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے بلکہ وہ اس نظام میں سب سے بڑی حصہ دار بھی ہیں۔ بلوچستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی شپنگ یارڈ کا سب سے بڑا مالک ہے اور 134 میں سے 34 یارڈ اس کی زیر ملکیت ہیں۔ یہ تمام یارڈ نجی شپ بریکنگ کمپنیوں کو کرائے پر دیے گئے ہیں۔

صنعتی ملازمین کے علاوہ، میڈیا ملازمین (صحافی، رپورٹر، کیمرہ مین، عملے کے افراد) بھی اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران خطرات اور شدید عدم تحفظ کے احساس سے دوچار رہے۔ اس عدم تحفظ کا سبب مالکان کی جانب سے فراہم کیے گئے تحفظ کا فقدان بھی ہے۔ انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس کے مطابق 2016ء میں فرائض کی انجام دہی کے دوران میڈیا کے پانچ افراد اپنی زندگیوں سے محروم ہوئے۔ ان میں محمد عمر، محبوب شاہ آفریدی (آج ٹی وی)، شہزاد احمد، آج ٹی وی، محمود خان (ڈان نیوز) اور خرم ذکی (تعمیر پاکستان سے وابستہ بلاگر) شامل تھے۔

صحت اور صفائی کی صورتحال کی بہتری کے لیے قانون سازی اور حکومتی اقدامات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا صحت اور تحفظ کے نظام پر بہت کم اختیار ہے کیوں کہ اس کی پہنچ غیر مستقل قانون سازی، صحت اور تحفظ کی تربیت کی فراہمی (شعبوں کا انتخاب عام طور پر ڈونرز کے مفادات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے) کے لیے ڈونرز کے ساتھ ایڈہاک کی بنیاد پر اشتراک اور ہر حادثے کے بعد معاوضے کی فراہمی تک محدود رہی ہے۔

اگر عملی اقدامات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پنجاب حکومت نے جنوری 2016ء میں ایک ایکشن پلان جاری کیا جس کا مقصد صنعتی حادثات پر قابو پانا تھا۔ ایسا 2015ء میں سندر انڈسٹریل اسٹیٹ میں پیش آنے والے اس حادثے کے ردعمل کے طور پر کیا گیا جس میں ایک فیکٹری کی عمارت منہدم ہونے کے نتیجے میں 46 ملازمین جاں بحق اور 100 زخمی ہوئے تھے۔ موجودہ صنعتی یونٹوں کی جانب سے تعمیراتی ڈھانچے کی مضبوطی کے سرٹیفکیٹ، ہر انڈسٹریل اسٹیٹ کے لیے بلڈنگ کنٹرول ڈویژن کی گنجائش، بوائلر اینڈ پریشر ویسلز ایکٹ اینڈ رولز میں ترمیم اور تمام فیکٹریوں کے ملازمین کے لیے لازمی گروپ انشورنس اس ایکشن پلان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ایک ہیلپ لائن 0800-73774 بھی شروع کی گئی۔

فروری 2016ء میں سندھ اسمبلی نے سندھ ورکرز معاوضہ بل 2015ء کی منظوری

دی۔ قانون میں کام کی جگہ پر زخمی ہونے والے ملازمین کے لیے معاوضے کی درجہ بندی کی گئی۔ اس میں ملازمین کو معاوضے کی ادائیگی کا حق دار قرار دیا گیا۔

2012ء میں بلدیہ فیکٹری میں لگنے والی آگ کے بعد، سندھ لیبر ڈیپارٹمنٹ نے آئی ایل او پاکستان کی مدد سے، سندھ میں کام کی جگہ پر تحفظ اور صحت کے فروغ کے لیے ایک جوائنٹ ایکشن پلان (2013-2016) مرتب کیا۔ اس منصوبے کی مدت 2016ء میں ختم ہوگئی تاہم اس کی کارکردگی کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا۔ صحت اور تحفظ کا ایکٹ 2015ء کا مسودہ تیار کیا گیا لیکن اس حوالے سے کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

خیبر پختونخوا نے دسمبر میں خیبر پختونخوا منرلز سیکٹر گورننس ایکٹ 2016ء کی منظوری دی۔ یہ ایکٹ محکمے کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کانوں میں تحفظ کے معیارات تجویز کرے۔ تاہم، کم از کم درجن ایسے قوانین موجود تھے جو کان کنی کے شعبے اور فیلڈ میں ملازمین کے تحفظ کو باضابطہ بناتے ہیں۔ مسلسل حادثات اور جانوں کا ضیاع جاری رہا، جس سے حفاظتی طریق ہائے کار اور کانوں میں کام کی غیر محفوظ نوعیت کی عکاسی ہوتی تھی۔

گڈانی کے المناک حادثے کے باوجود بلوچستان حکومت نے صحت اور صفائی کے حوالے سے نہ تو کوئی قانون بنایا اور نہ ہی کوئی انتظامی کارروائی کی۔

ایچ آر سی پی کی جانب سے ستمبر میں کان کنی پر منعقد کی گئی ایک قومی مشاورت میں کہا گیا کہ پاکستان کے تمام علاقوں میں کان کنی کے شعبے کو فوری طور پر باضابطہ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو جسمانی چوٹوں اور جانوں کے ضیاع سے بچایا جاسکے، ماحولیاتی خطرات کو کم کیا جاسکے اور کان کنی کے باعث ہونے والی بے دخلی اور اس کے اثرات میں کمی کی جاسکے۔

مشاورتی اجلاس میں مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی گئیں:

☆ کان کنی کے شعبے میں افرادی قوت کی اصل تعداد کا فوری طور پر تخمینہ لگایا جائے اور ان کا اندراج کیا جائے؛

☆ ملک بھر میں چھوٹے پیمانے کی کان کنی سمیت صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کو باضابطہ نظام کے دائرے میں لایا جائے اور اس نظام کا موثر طور پر نفاذ کیا جائے؛

☆ کان کنی کے شعبے میں معاوضے اور مراعات کو کام سے متعلق مشکلات اور خطرات

کام کے مقامات پر حادثات، چوٹوں اور اموات کا کوئی سرکاری ریکارڈ موجود نہیں تھا

کے موافق بنایا جائے، اسی طرح خطرات کو باضابطہ طور پر کم کرنے کے لیے افرادی قوت کی مشاورت سے بامعنی اقدامات کیے جائیں؛

☆ حکومت کے معائنے اور قواعد وضوابط سے متعلقہ دیگر فرائض کو مضبوط بنانے اور مزید شفافیت، احتساب اور معلومات کی باقاعدہ فراہمی کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے؛

☆ کان کے مالکان / آپریٹروں کی جانب سے مقررہ معیارات پر عمل درآمد میں ناکامی اور دیگر جرائم کے لیے مقرر کی گئی موجودہ سزاؤں کو مزید سخت بنایا جائے تاکہ دوبارہ ایسے جرائم سرزد نہ ہوں؛

☆ ماحولیاتی اثرات کا آزادانہ طور پر اور ایک شفاف طریقے سے اندازہ لگایا جائے اور خلاف ورزی پر سزائیں دی جائیں؛

☆ اہم وسائل، خاص طور پر پانی کے تحفظ اور ان کے دوبارہ استعمال کو لازمی قرار دیا جائے اس پر عمل درآمد کرایا جائے؛

☆ کمیونٹیوں کی بے دخلی کو کم سے کم کیا جائے اور محض متاثرہ آبادیوں کو زمین کی قیمت کی ادائیگی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ انہیں معقول معاوضہ ادا کیا جائے تاکہ انہیں نقصانات سے دوچار ہونے سے بچایا جاسکے؛

☆ کان کنی کی سرگرمیوں کو آثار قدیمہ اور ثقافتی ورثے پر اثر انداز ہونے سے روکا جائے؛

بلدیہ فیکٹری میں آتش زدگی کے متاثرین اور خاندانوں کو معاوضے کی فراہمی

بلدیہ فیکٹری میں آتش زدگی کے واقعے، جس میں 255 ملازمین جاں بحق اور 57 زخمی ہوئے، کے چار سال بعد ایک معروف جرمن سورسنگ فرم کے آئی کے نے متاثرہ خاندانوں کو ایک ایسے بندوبست کے تحت 51 لاکھ پچاس ہزار امریکی ڈالر کے معاوضے کی آخری قسط کی ادائیگی کی جس کا نفاذ، انتظام اور نگرانی آئی ایل او کرے گا۔ یہ رقم کے آئی کے کی جانب سے 2013ء میں ادا کیے گئے دس لاکھ امریکی ڈالر اور پاکستان کے مختلف قوانین اور اداروں کے تحت دیے گئے معاوضے سے زیادہ ہے۔

یہ معاہدہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، این ٹی یو ایف اور پاکستان کی سول سوسائٹی کی دیگر تنظیموں کی جانب سے تین سال کی بین الاقوامی لابنگ اور قانونی جنگ کے بعد طے پایا۔

ایک متبادل اجرت فرضی اجرت کے طور پر مقرر کی گئی تاکہ مالی امداد کا اندازہ لگایا جا سکے (چونکہ اجرتوں کا اصل ریکارڈ دستیاب نہیں تھا)۔ ''ہر دعوے دار کو ملنے والی رقم ہر فرد کی مالی حالت اور دست نگر افراد کی تعداد کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہو گی۔''

معاوضے کی ادائیگی سول سوسائٹی کی کامیابی اور اس مقصد کے حصول کے لیے قانونی جنگ کی نشاندہی کرتی ہے۔ مرکزی فریقین کی جانب سے سرزد ہونے والی غلطیوں، جیسا کہ آگ لگتے وقت ملازمین کو ہنگامی انخلاء سے محروم کرنے میں مالکان کا کردار، اور سماجی آڈیٹروں رینا (RINA) کا فیکٹری کے آپریشنوں کو قانون کے مطابق قرار دینا اور ریاست کے معائنے کے نظام کی مکمل ناکامی جس نے غفلت کی راہ ہموار کی، نے اس سانحے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

سال 2016ء کے دوران 46 ارب امریکی ڈالر کے ترقیاتی منصوبے چین۔ پاکستان اقتصادی راہداری (سی پیک) کی رفتار میں بھی تیزی دیکھنے میں آئی۔ منصوبے کا مرکز تعمیرات، معاشی زونز اور توانائی کی پیداوار میں ہونے والی وسیع ترقی ہے۔ اس کے علاوہ 3,000 کلومیٹر پر مشتمل سڑکوں، ریلوے اور پائپ لائنوں کا نیٹ ورک بھی سی پیک کا حصہ ہے جس کے ذریعے تیل اور گیس جنوبی پاکستان کی بندرگاہ گوادر سے چاروں صوبوں سے ہوتا ہوا چین کے علاقہ شنجیانگ پہنچے گا۔

اس منصوبے کے تحت 23 لاکھ ملازمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے، جن میں سے زیادہ تر کا مرکز تعمیرات کا شعبہ ہے۔ تاہم اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ جیسے جیسے ترقیاتی سرگرمی بڑھے گی،

مزدوروں کے مسائل میں بھی اضافہ ہوگا۔ تعمیرات محنت کشوں کے حقوق کے لحاظ سے کم تحفظ شدہ شعبہ ہے۔ شعبہ تعمیرات کے ملازمین جو عام طور پر ٹھیکے کے غیر رسمی نظام کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں، انہیں نہ تو کام کی جگہ کے معائنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں حادثاتی بیمہ اور سوشل سکیورٹی تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

ایک ایسا معاہدہ جو چینیوں کی زیر نگرانی پایہ تکمیل کو پہنچے گا، اس کی مخصوص نوعیت کے پس منظر میں، سی پیک ایک سہہ فریقی لیبر کانفرنس کا موقع فراہم کرسکتا تھا تا کہ مزدوروں کے موجودہ حالات کا تجزیہ کیا جاسکے۔ لیکن سی پیک کے تحت مزدوروں کے لیے خصوصی انتظام سے متعلق کوئی بحث نہیں کی گئی۔

سفارشات

- ☆ لیبر سے متعلق ایک جامع ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو آئینی حقوق، قومی قانون سازی اور محنت کشوں سے متعلق بین الاقوامی اصولوں پر مبنی ہو، اور ایک آئینی طریقہ کار متعارف کرایا جائے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ صوبائی قوانین اس کے پابند ہیں۔
- ☆ پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت سے متعلق قوانین کو ترجیح دی جائے اور انہیں تمام صوبوں میں ہم آہنگ کیا جائے۔ حادثات اور اموات کے اعداد وشمار پارلیمان میں پیش کیے جائیں اور ویب سائٹ پر ڈالے جائیں۔ بجٹ میں اضافے اور لیبر معائنہ کاروں کو تربیت کی فراہمی کے ذریعے تمام صوبوں میں لیبر کے معائنے کے نظام کو مضبوط کیا جائے۔
- ☆ ٹریڈ یونین فیڈریشنوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے انہیں مضبوط بنایا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ سہ فریقی لیبر کانفرنسوں کا انعقاد کرے۔
- ☆ غیر ہنر مند مزدوروں کے لیے کم از کم تنخواہیں ایک اوسط گھرانے کے لیے باوقار زندگی کی ضمانت دینے کے لیے ناکافی ہیں۔ کم از کم تنخواہ کے نفاذ کا طریقہ کار تشکیل دیا جائے۔ کم سے کم تنخواہ کی عدم ادائیگی کو جرم قرار دیا جائے۔
- ☆ گروی مشقت سے متعلق قوانین پر عمل درآمد کیا جائے۔ تمام شعبوں میں بچوں کی مشقت کے خاتمے کے لیے بچوں کی مشقت کے پھیلاؤ سے متعلق ایک سروے کا انعقاد کیا جائے اور مفت اور لازمی تعلیم کے قانون کا نفاذ کیا جائے۔
- ☆ سی پیک کے منصوبوں میں ملازمت کے انتظام و انصرام اور کام کے حالات سے متعلق ایک دستاویز ہونی چاہیے۔

6
سماجی اور معاشی حقوق

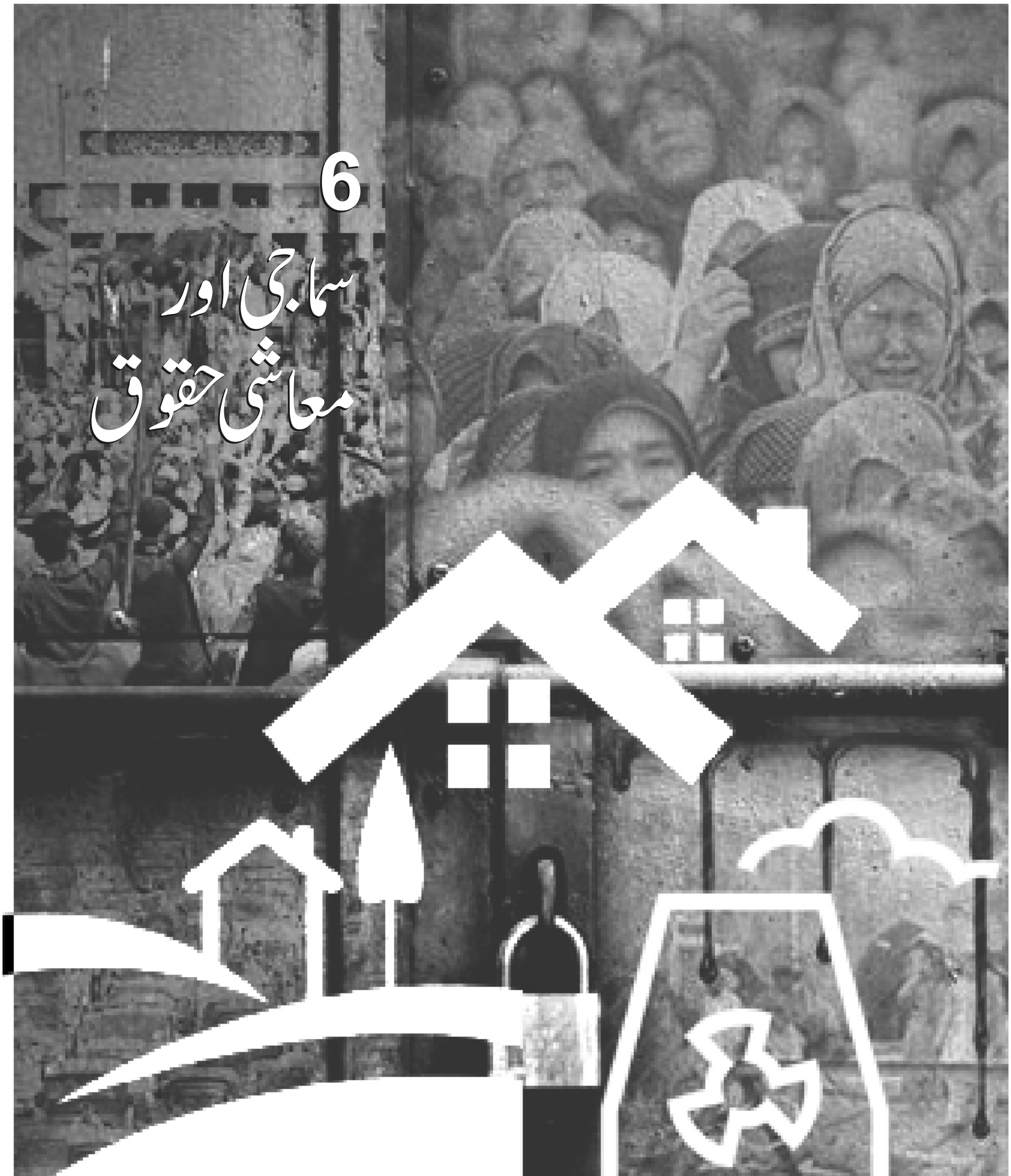

معاشی
اور
سماجی حقوق

تعلیم

ریاست قانون کے تجویز کردہ طریقہ کار کے مطابق 5 سے 16 برس کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل 25(الف)]

......ناخواندگی کا خاتمہ کرے گی اور ممکنہ حد تک کم سے کم عرصہ میں مفت و لازمی ثانوی تعلیم فراہم کرے گی۔

[آرٹیکل 37(ب)]

قانون کی عائد کردہ معقول پابندیوں اور ضوابط کے تابع رہتے ہوئے تمام شہریوں کو عوامی اہمیت کے تمام معاملات میں معلومات لینے کا حق حاصل ہے۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل 19(الف)]

(1) ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو عام کیا جائے گا اور قابلیت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم تک رسائی سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگی۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل نشو نما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل 26]

فریق ریاستیں متفق ہیں کہ بچوں کی تعلیم کے مقاصد درج ذیل ہوں گے۔

(الف) پورے امکانات کی حد تک بچے کی شخصیت، ذہانت اور ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو ترقی دینا۔

(ب) انسانی حقوق، بنیادی آزادیوں اور اقوام متحدہ کے منشور میں بیان کیے گئے اصولوں کے احترام کو فروغ دینا۔

(ج) بچے میں اپنے والدین، اپنی تہذیبی شناخت، زبان اور اقدار کا احترام پروان چڑھانے، اس ملک اور وطن جس میں بچہ رہ رہا ہے یا جس سے اس کا تعلق ہے اس کی قومی اقدار اور اس سے مختلف دوسری تہذیبوں کے احترام کو فروغ دینا۔

(د) بچے کو آزاد سماج میں ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے لئے تیار کرنا۔ یعنی امن، برداشت، مساوات، جنسی مساوات اور تمام لسانی، قومی و مذہبی گروہوں اور قدیم مقامی آبادیوں کے افراد کے درمیان، دوستانہ اقدار کی روح کا فہم و ادراک پیدا کرنا۔

(ہ) قدرتی ماحول کے تحفظ کو فروغ دینا۔

[آرٹیکل 29]

1- اس میثاق کے تمام رکن ممالک، افراد کے حصولِ تعلیم کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی نشونما اور انسانی عزت و وقار کی سربلندی ہونا چاہیے اور اس سے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو تقویت ملنی چاہیے۔ وہ اس بات سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد تمام افراد کو اس لائق ہونا چاہئے کہ وہ آزاد معاشرے میں موثر کردار ادا کر سکیں اور تمام قوموں، نسلوں، قبیلوں، اور مذہبی گروہوں کے درمیان افہام و تفہیم کو فروغ دیں اور قیام امن کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائیں۔

2- اس میثاق کے تمام ممالک تسلیم کرتے ہیں کہ اس حق کے مکمل حصول کی خاطر

(الف) تمام افراد کے لئے پرائمری تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔

(ب) ثانوی تعلیم اپنی مختلف شکلوں، بشمول فنی اور پیشہ ورانہ ثانوی تعلیم اس طرح عام کرنا ہوگی کہ یہ ہر شخص کی دسترس میں ہو۔ خاص طور سے بتدریج مفت تعلیم رائج کر کے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا۔

(ج) ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق، ہر ممکن ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم پر دسترس حاصل ہوگی۔ خاص طور سے بتدریج مفت تعلیم رائج کر کے یہ مقصد حاصل کیا جائے گا۔

معاشی، سماجی و ثقافتی حقوق کا عالمی میثاق

[آرٹیکل 13]

2016 کے دوران تعلیم کے شعبے میں چند معمولی مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں مگر شعبہ تعلیم مجموعی طور پر انحطاط پذیری کا شکار رہا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد دو کروڑ، 50 لاکھ (25 ملین) سے کم ہو کر دو کروڑ، 40 لاکھ (24 ملین) ہوگئی اور بالغ افراد میں خواندگی کی شرح 58 فیصد سے کم ہو کر 56.4 فیصد ہوئی۔ سیکھنے کے نتائج کا اسکور معمولی سی بہتری کے ساتھ گزشتہ برس کے 52.33 سے بڑھ کر رواں برس 54.78 فیصد تھا۔ اسکولوں کی ایک بڑی تعداد بنیادی سہولیات حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ تعلیمی سال کی سب سے تکلیف دہ خبر یہ تھی کہ وفاقی حکومت اور دو صوبائی حکومتوں پنجاب اور بلوچستان کی حکومت نے تعلیم کو ترجیح دینے کے بلند و بانگ دعوے کرنے کے باوجود تعلیمی بجٹ میں کمی کر دی۔

پاکستان میں تعلیم کی تشویشناک صورتحال

اقوام متحدہ کی گلوبل ایجوکیشن مانیٹرنگ رپورٹ ستمبر 2016ء میں جاری ہوئی جس میں دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان پرائمری تعلیم کے اہداف کے حوالے سے 50 برس جبکہ ثانوی تعلیم کے اہداف کے حصول میں 60 برس پیچھے ہے۔ چنانچہ یہ ملک اپنے تمام بچوں کو پرائمری تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے معین مدت سے نصف صدی پیچھے ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ

پاکستان میں 56 لاکھ بچے پرائمری اسکول، تقریباً 55 لاکھ ثانوی اسکول (ابتدائی ثانوی تعلیم کی عمر کے بچوں کی تعداد 48 فیصد ہے) اور ایک کروڑ 4 لاکھ (10.4 ملین) بالغ بچے بالائی ثانوی تعلیم کے اسکولوں میں نہیں جاتے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں 40 فیصد بچے جن میں پاکستان کے بچے بھی شامل ہیں، اپنی مادری زبان کی بجائے کسی اور زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق، غربا و امراء کے بچوں، شہروں و دیہاتوں کے بچوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اسکول کے دورانیے کی تکمیل اور تعلیم کے حصول کے حوالے سے بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے مردوں میں خواندگی کی شرح 64 فیصد ہے (سرکاری اعداد و شمار، اگرچہ ماہرین تعلیم کی نظر میں یہ اعداد و شمار شکوک سے بالا تر نہیں) جبکہ وہاں کی عورتوں میں شرح خواندگی صرف 14 فیصد ہے۔

امریکہ میں واقع ولسن سنٹر کی جولائی 2016ء میں جاری کردہ رپورٹ کے مطابق آٹھ برس کی عمر کے نصف بچوں نے 4/3 برس اسکول میں گزارنے کے باوجود کچھ بھی نہیں سیکھا۔ رپورٹ کے مطابق، گزشتہ چھ برسوں میں بجٹ دوگنا اضافے کے ساتھ 7.5 ارب ڈالر تک بڑھا ہے مگر اس کے باوجود خواندگی اور اسکولوں سے بچوں کے اخراج کی شرح مایوس کن ہے اور ''گھوسٹ اسکول'' بھی بدستور موجود ہیں۔

بلوچستان حکومت نے مئی 2016ء میں بلوچستان کی صوبائی اسمبلی کو بتایا کہ 15,000 اساتذہ کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جبکہ 900 گھوسٹ اسکولوں میں 300,000 طلباء کی جعلی رجسٹریشن کے بارے میں بھی اسمبلی کو مطلع کیا گیا۔

''پاکستان کا تعلیمی بحران: اصل داستان'' نامی ایک تحقیقی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور عالمی ورلڈ بنک نے ملک کے سرکاری شعبہ تعلیم کے لیے بہت زیادہ فنڈ زدیے جس کے باوجود پاکستان اسکول نہ جانے والے بچوں کے حوالے سے نائیجریا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

ولسن سنٹر کے اعداد و شمار کے مطابق، پنجاب میں گزشتہ پانچ برسوں کے دوران اساتذہ کی غیر حاضری کی شرح 20 فیصد سے کم ہو کر 6 فیصد تک آ گئی تھی۔

خیبر پختونخوا میں تقریباً 28,000 اسکول تھے جن میں سے زیادہ تر بنیادی سہولیات سے محروم تھے۔ خیبر پختونخوا انڈیپنڈنٹ مانیٹرنگ یونٹ نے اپنی مئی 2016ء کی رپورٹ میں

بتایا کہ 26 فیصد سرکاری اسکول پانی کی سہولت سے محروم تھے اور دس فیصد اسکولوں کی چار دیواری نہیں تھی، باوجود اس کے کہ صوبے میں امن عامہ کی صورتحال نہایت حساس تھی۔ 11 فیصد اسکولوں میں لیٹرین نہیں جبکہ 34 فیصد بجلی کی سہولت سے محروم تھے۔

تعلیمی بجٹ

مالیاتی سال 17-2016ء میں پاکستانی حکام ایک بار پھر اپنے جی ڈی پی کا کم از کم 4.6 فیصد اور ملکی اخراجات کا کم از کم 20-15 فیصد تعلیم پر خرچ کرنے کا وعدہ پورا نہ کرسکے۔ پاکستان کا تعلیمی بجٹ جی ڈی پی کا تقریباً دو فیصد تھا۔ 2016ء میں وفاقی وصوبائی حکومتوں نے تعلیم کے لیے 84.19 ارب روپے مختص کیے۔ یہ رقم جی ڈی پی کا 2.83 فیصد بنتی تھی۔ وفاقی حکومت نے پنجاب کے تعلیمی بجٹ سے نصف رقم تعلیم کے لیے مختص کی جبکہ سندھ کے تعلیمی بجٹ سے 70 ارب روپے کم تھی۔

صوبائی تعلیمی بجٹ

پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دینے کے دعوے کیے۔ مگر جب تعلیمی بجٹ کی تخصیص کا وقت آیا تو ان کا عمل ان کے لفظوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ 17-2016 میں صوبائی حکومتوں کے تعلیمی بجٹ کے سرسری جائزے سے ان کے دعووں کا کھوکھلا پن دیکھا جاسکتا ہے۔

پنجاب: پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ۔ این (پی ایم ایل۔این) کی حکومت نے تعلیمی بجٹ میں کٹوتی کے حوالے سے پی ایم ایل۔ این کی وفاقی حکومت کی اندھی تقلید کی۔حکومت نے مالیاتی برس 17-2016 میں تعلیمی بجٹ کم کر کے تعلیم جیسے انتہائی اہم شعبے کا بجٹ گھٹانے کی سابقہ روایت کو برقرار رکھا۔

پنجاب اسمبلی میں پیش کیے گئے مالیاتی بل کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے لگاتار نویں بجٹ میں، پی ایم ایل۔این کی صوبائی حکومت نے تعلیم کے لیے 323 ارب روپے مختص کیے جو کہ رواں مالیاتی سال کے 1,681 ارب روپے کے کل بجٹ کا 19 فیصد بنتا ہے۔

بجٹ کی دستاویزات بتاتی ہیں کہ تعلیمی بجٹ رواں برس کے سالانہ ترقیاتی پروگرام (اے ڈی پی) کا 58 فیصد تھا۔ گزشتہ برس یہ اے ڈی پی کا 77 فیصد تھا، چنانچہ 2016ء میں

تعلیم اورانفراسٹرکچر کے شعبوں میں فاٹا، بلوچستان اور سندھ کی کارکردگی ناقص تھی

19 فیصد کم رقم مختص کی گئی۔

بجٹ میں پنجاب ایجوکیشنل فاؤنڈیشن (پیف)، دانش اسکولز اور وقف شدہ سرمائے کے لیے مختص شدہ 112 ارب روپے بھی شامل تھے؛ بصورت دیگر، یہ رقم تقریباً 312 ارب روپے ہے جو کہ گزشتہ برس کے بجٹ سے کچھ حد تک ہی زائد ہے۔ گزشتہ برس، پنجاب کے 1,447 ارب روپے کے بجٹ میں سے تعلیم کے لیے 310 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔

2015-16 میں تعلیم کے لیے مختص 310 ارب روپے صوبے کے کل بجٹ کا 21 فیصد تھے جو کہ 2014-15 کے تعلیمی بجٹ سے 24 فیصد کم تھا۔ پنجاب کے مجموعی بجٹ سے تعلیمی بجٹ میں 2013-14ء سے 2016-17ء کے دوران 26 فیصد سے لے کر 19 فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے۔

البتہ، صوبائی وزیر تعلیم کے پاس ڈینگیں مارنے کی کئی وجوہات تھیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت اے ڈی پی 2016-17ء میں 5 ارب روپے کا اضافہ کیا تا کہ اسکولوں میں 12,500 اضافی کمرے تعمیر ہوسکیں اور کمروں میں طلباء کے ہجوم میں کمی لائی جا سکے۔

شعبہ برائے عالمی ترقی (ڈی ایف آئی ڈی) یو کے، کے 17.6 ارب روپے کی فنڈنگ سے تعمیر ہونے والے 11,000 کلاس رومز اس کے علاوہ ہیں‘‘۔

ذرائع ابلاغ سے گفتگو کرتے ہوئے، وزیر تعلیم نے کہا کہ صوبائی حکومت اپنے

پرائمری اسکولوں کے لیے 49,000 استاد بھرتی کرے گی۔

انہوں نے کہا کہ صوبائی حکومت نے تمام سرکاری اسکولوں میں سہولیات کے فراہمی کے لیے 50 ارب روپے مختص کیے ہیں۔ 4,063 اسکولوں کی مخدوش عمارتوں کی بحالی نو/تعمیر نو کے لیے اے ڈی پی 17-2016 میں آٹھ ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ 17-2016 میں پنجاب ایجوکیشن کمیشن کے نتائج کی بنیاد پر 6,313 وظائف دیئے جائیں گے۔ اگلے برس 500 نئے پرائمری اسکول بھی قائم کیے جائیں گے۔

موصوف وزیر نے کہا کہ 11,000 اضافی پرائمری اسکولوں میں اوائل کم عمری کی تعلیم کے لیے بھی فنڈز مختص کیے جائیں گے۔ وزیراعلیٰ کے تعلیمی روڈ میپ کے تحت پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو 2019ء تک 28 لاکھ (28 ملین بچوں) کے اندراج کا ہدف پورا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

ساہیوال، اوکاڑہ، وہاڑی اور جھنگ میں نئی یونیورسٹیوں کے قیام کے لیے بھی اے ڈی پی 17-2016ء میں فنڈز مختص کیے گئے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور جڑانوالہ میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کی ذیلی شاخیں قائم کرنے کے لیے بھی فنڈز مختص کیے گئے ہیں۔ جنوبی پنجاب کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رحیم یار خان میں ایک آئی ٹی و انجینئرنگ یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔ ہونہار طلباء میں 400,000 لیپ ٹاپ تقسیم کرنے کے لیے چار ارب روپے رکھے گئے ہیں۔

صوبائی حکومت نے فنی تعلیم کے لیے ساڑھے چھ ارب روپے مختص کیے ہیں جو کہ کل تعلیمی بجٹ کا دو فیصد ہے۔ تقریباً پچاس برس قبل جنرل ایوب کے دور حکومت میں فنی تعلیم کا بجٹ تعلیمی بجٹ کا تیرہ فیصد تھا۔

تعلیم کے فروغ کی خاطر اسکول کونسلز کے لیے چودہ ارب روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی ہے۔ وزیر نے فخریہ انداز میں تعلیم کے ترقیاتی بجٹ میں 71 فیصد اضافے کا ذکر کیا۔ اس میں تعلیمی شعبے کے لیے ملنے والی تمام بیرونی امداد بھی شامل ہے۔ تعلیمی شعبے کی ترقی کے لیے 56.76 ارب روپے مختص کیے گئے جس سے وزیر موصوف کے خیال میں اسکول میں 100 فیصد اندراج اور سہولیات کی دستیابی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔

البتہ، تعلیم و صحت کے اے ڈی پی کا بہت بڑا حصہ ہر برس غیر استعمال شدہ رہتا ہے۔

گزشتہ برس کے دوران، 23 ارب روپے سے زائد رقم 22.74 ارب روپے ترقیاتی بجٹ سے اور 38 کروڑ روپے غیر ترقیاتی بجٹ سے استعمال نہ کیے جا سکے۔ صوبائی حکومت نے اعلیٰ تعلیم، اسکول کی سطح کی تعلیم اور خصوصی تعلیم کے لیے 42.98 ارب روپے مختص کیے تھے جس میں سے 42.35 ارب روپے ترقیاتی بجٹ جبکہ 658.6 ملین روپے غیر ترقیاتی بجٹ کے لیے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے مختص 9.11 ارب روپے میں سے 3.63 ارب خرچ نہیں کیے گئے تھے۔ اسکول کی تعلیم کے لیے مختص 32.84 ارب روپے میں سے 18.92 ارب غیر استعمال شدہ رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے غیر ترقیاتی بجٹ کے لیے مختص ساڑھے 32 کروڑ (325 ملین) روپے میں سے 20 کروڑ 90 لاکھ (209 ملین) غیر استعمال شدہ رہے۔ اسکول کی تعلیم کے غیر ترقیاتی بجٹ کے لیے مختص ساڑھے 29 کروڑ روپے میں سے 19 کروڑ 20 لاکھ روپے خرچ نہیں کیے گئے تھے۔ خصوصی تعلیم کے غیر ترقیاتی بجٹ کے لیے مختص تین کروڑ 86 لاکھ (38.6 ملین) روپے میں سے 91 لاکھ (9.1 ملین) روپے غیر استعمال شدہ رہے۔

پنجاب میں ایک غیر سرکاری تنظیم نے جنوری میں ایک تحقیقی سروے کیا اور اپریل میں اس کے نتائج جاری کیے جس میں بتایا گیا کہ پنجاب کے تقریباً 72 فیصد سرکاری اسکولوں کو اساتذہ کی قلت کا سامنا تھا۔ صوبے کے سینکڑوں اسکول ایسے تھے جہاں صرف ایک ٹیچر تھا/تھی۔ مرکز برائے امن وترقیاتی اقدام (سی پی ڈی آئی) نے بتایا کہ صوبے میں کم از کم 2,611 سرکاری ہائی اسکول کئی برسوں سے انتظامی سربراہان کے بغیر چل رہے تھے۔

تاہم، وزیر تعلیم پنجاب نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ حکومت پنجاب نے 2016ء میں 40,000 اساتذہ بھرتی کرنے کا منصوبہ شروع کیا تھا۔ مگر، سال کے اختتام تک، اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکا تھا یا کم از کم ذرائع ابلاغ کو اس کی تکمیل کے متعلق آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

خیبر پختونخوا: صوبائی حکومت نے تعلیمی بجٹ کے لیے 143 ارب روپے مختص کیے۔ اسکول کی تعلیم کا بجٹ 16-2015ء میں 104 ارب روپے تھا جو کہ 17-2016ء میں 15 ارب روپے کے اضافے کے ساتھ 119 ارب روپے کیا گیا۔ ایلیمنٹری وسیکنڈری ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے بجٹ میں 14 فیصد اضافہ کیا گیا۔ 72 تعلیمی منصوبوں کے لیے 12.453 ارب روپے مختص کیے گئے۔ 64 پہلے سے جاری منصوبوں کے لیے 10.030 ارب روپے اور آٹھ نئے منصوبوں کے لیے 2.42 ارب روپے رکھے گئے۔ نئے منصوبوں میں 200

سمارٹ سکول، مردان میں پہلا گرلز کیڈٹ کالج، سوات کیڈٹ کالج، 1300 گرلز کمیونٹی سکول، 160 نئے پرائمری سکول، ہائی و ہائیر سکینڈری سکولوں میں پچاس آئی ٹی لیبارٹریاں، ضرورت کی بنیاد پر پچاس پرائمری، پچاس مڈل اور پچاس ہائی سکولوں کی اپ گریڈیشن اور دو سو ہائیر سکینڈری سکولوں کو معیاری بنانے کے منصوبے شامل تھے۔ تاہم، افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ 2015-16ء میں ای اینڈ ایس ای ڈی کا بجٹ 16 ارب سے کم کرکے 11.5 ارب روپے کر دیا گیا۔

100 مدارس کو پرائمری سکولوں میں بدلنے کے لیے بھی بجٹ رکھا گیا تھا۔ انسانی سرمائے اور فنی تعلیم کے لیے 197 کروڑ روپے (1970 ملین) کی خطیر رقم مختص کی گئی۔ صوبائی حکومت نے دارالعلوم حقانیہ کی ''تعمیر و بحالی نو'' کے لیے 30 کروڑ روپے (300 ملین) مختص ملک میں ایک متنازعہ صورتحال پیدا کردی۔

سرکاری سکولوں میں دستیاب سہولیات کی دستیابی کے لیے 18 ارب روپے (8000 ملین) جبکہ شعبہ تعلیم میں 1960 نئی بھرتیاں کرنے کے لیے 1.6 ارب روپے رکھے گئے تاکہ پرائمری سکولوں میں تعلیم تک رسائی اور تعلیم کے معیار میں بہتری لائی جائے۔

2016-17ء میں اعلیٰ تعلیم کا بجٹ 4 ارب روپے سے بڑھا کر 16 ارب روپے کیا گیا۔ نئے کالجوں میں تقریباً 800 نئے اساتذہ بھرتی کیے گئے۔

سندھ: صوبائی حکومت نے 2016-17ء میں تعلیم کے لیے 160.7 ارب روپے مختص کیے۔ یہ رقم کل بجٹ کا 19.22 فیصد ہے۔ البتہ، قبل از پرائمری اور پرائمری تعلیم کے لیے بجٹ 60.6 ارب روپے سے کم کرکے 55.3 ارب روپے کردیا گیا۔ صرف ثانوی تعلیم کے بجٹ میں 31 فیصد اضافہ کرکے اسے 36.6 ارب روپے سے 48 ارب روپے کیا گیا۔ ہائیر سکینڈری تعلیم کا بجٹ 0.2 فیصد کی معمولی کمی کے ساتھ تقریباً پہلے جتنا ہی رہا۔ گزشتہ برس یہ بجٹ 28.04 ارب روپے تھا جبکہ اس برس 28.5 ارب تھا۔ تنخواہوں کی مد میں 7.4 فیصد جبکہ تنخواہوں کے علاوہ دیگر شعبوں کے بجٹ میں 23.8 فیصد اضافہ کیا گیا۔

تنخواہوں کے علاوہ دیگر شعبوں کے بجٹ کی تفصیلات درج ذیل ہیں: سکول سے متعلقہ بجٹ کے لیے 4.68 ارب روپے، سکول کے انفرسٹرا کچر کو بہتر کرنے اور ''سکولوں و کالجوں کی مرمت'' کے لیے 5.5 ارب روپے، تعلیم کے انتظام و انصرام کی تنظیموں کے لیے ایک

ارب روپے، سکولوں کے انضمام کے لیے 1.8 ارب روپے، مفت درسی کتابوں کے لیے 2 ارب روپے، لڑکیوں کے وظیفے کے لیے 1.5 ارب روپے، سکولوں کو مزید قوت بخشنے کے لیے 27.3 ملین روپے، اور تعلیم کے نئے طرائق کار متعارف کروانے کے لیے 50 کروڑ روپے مختص کیے گئے۔

تعلیمی شعبے کے لیے اے ڈی پی فنڈ بڑھا کر 17.2 ارب روپے کیا گیا۔ اس میں بورڈز اور یونیورسٹیوں کے لیے الگ سے مختص کئے گئے تین ارب روپے، ٹیوٹا کے لیے ایک ارب روپے اور خصوصی تعلیم کے لیے 0.2 ارب روپے بھی شامل تھے۔ بیرونی فنڈنگ سے چلنے والے منصوبوں کے لیے 2.8 ارب روپے مختص کیے گئے۔

(گزشتہ برس (16-2015) صوبائی اے ڈی پی (بشمول ضلعی حکومتوں کے لیے مختص بجٹ) کا کل حجم 162 ارب روپے تھا۔ 17 جون 2016ء کو محکمہ مالیات سندھ کی ویب سائٹ پر دکھائی دینے والی معلومات کے مطابق، صرف 100 ارب روپے خرچ ہو سکے تھے۔ یعنی صوبائی حکومت اپنے مختص شدہ بجٹ کا صرف 61 فیصد خرچ کر سکی تھی۔ فارن پراجیکٹ اسسٹنس نے اس سے بھی مایوس کن تصویر پیش کی ہے۔ 27 ارب روپے کے مختص شدہ بجٹ میں سے صرف 2.85 ارب روپے یعنی صرف 10.5 فیصد رقم خرچ ہوسکی۔

بلوچستان: صوبائی حکومت نے 17-2016 میں تعلیم کے بجٹ میں بہت زیادہ کمی کی۔ کل بجٹ کا صرف 17 فیصد تعلیم کے لیے مختص کیا گیا۔ 289 ارب روپے کے کل بجٹ میں سے تعلیم کے لیے صرف 49.1 ارب روپے رکھے گئے۔ دیگر صوبوں سے موازنہ کیا جائے تو یہ بجٹ دیگر تمام صوبوں کے تعلیمی بجٹ سے کم ہے۔

16-2015ء میں بلوچستان نے تعلیم کے لیے 48.3 ارب روپے مختص کیے۔ اس لحاظ سے رواں برس اس میں صرف دو فیصد اضافہ کیا گیا۔ بجٹ کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے تعلیم کے غیر ترقیاتی اخراجات 42.67 ارب اور ترقیاتی اخراجات 5.65 ارب ہیں جو کہ ترقیاتی بجٹ کا 9 فیصد بنتا ہے۔ گزشتہ برس کے اعداد و شمار کے ساتھ موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر ترقیاتی اخراجات میں 15 فیصد اضافہ ہوا اور ترقیاتی بجٹ میں 40 فیصد کمی ہوئی۔

16-2015ء میں سکولوں کے لیے 7.5 ارب روپے مختص کیے تھے۔ تاہم 17-2016ء میں، اس شعبہ کے ترقیاتی بجٹ میں 42 فیصد کمی کر کے 4.4 ارب روپے کر دیا گیا۔ تعلیمی بجٹ میں 37.4 ارب روپے تنخواہوں اور ان سے متعلقہ اخراجات کے لیے مختص کیے

گئے۔ یہ رقم تعلیمی بجٹ کا 88 فیصد بنتی ہے۔ تنخواہوں میں اضافے اور نئی تقرریوں کے باعث تنخواہوں میں 15 فیصد اضافہ کیا گیا۔ تنخواہوں کے علاوہ دیگر بجٹ (اسکولوں اور سرگرمیوں اور محکموں کے دفاتر کی مرمت وغیرہ پر اٹھنے والے اخراجات) میں 9 فیصد کمی کی گئی۔ 2015-16 میں یہ بجٹ 5.8 ارب روپے تھا جسے 2016-17 میں 5.3 ارب روپے کر دیا گیا۔

2015-16ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ترقیاتی بجٹ 7.6 ارب روپے تھا جسے رواں برس بڑھا کر 13.7 ارب روپے کیا گیا۔ اس میں گزشتہ برس کی نسبت 80 اسی فیصد اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح، اسکول کی سطح پر تعلیم کے لیے غیر ترقیاتی بجٹ 2015-16 میں 29.5 ارب روپے تھا جس میں رواں برس دو فیصد کمی کر کے 28.9 ارب روپے تک لایا گیا۔ چنانچہ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے غیر ترقیاتی اخراجات کے حوالے سے اعلیٰ تعلیم پر پہلے سے زیادہ توجہ دی ہے۔ ترقیاتی بجٹ 2015-16 میں 3.7 ارب روپے تھا جس میں 2016-17ء میں 28 فیصد اضافہ کر کے 4.7 ارب روپے کیا گیا۔

تاہم، اسکولوں کے ترقیاتی بجٹ میں کمی کی گئی۔ 2015-16 میں یہ 17 ارب روپے تھا مگر 2016-17ء میں اس میں تقریباً 77 فیصد کمی کر کے 1.6 ارب روپے تک گھٹا دیا گیا۔

گلگت بلتستان: گلگت بلتستان حکومت نے تعلیم کے لیے ایک ارب روپے مختص کیے جو کہ 2016-17 کے مالیاتی برس کے کل بجٹ کا صرف آٹھ فیصد ہے۔ پبلک ڈویلپمنٹ پروگرام کے لیے دو ارب روپے مختص کیے گئے۔ اس میں تعلیم اور دیگر شعبوں کے لیے اسکیمیں بھی شامل تھیں۔ تعلیمی شعبے کے لیے 949,670,000 روپے مختص کیے گئے جنہیں 73 رواں اور 42 نئے منصوبہ جات پر خرچ کرنا مقصود ہے جن میں اسکولوں کی نئی عمارتوں، چار دیواریوں کی تعمیر، اسکولوں کی اپ گریڈیشن اور تعلیمی اداروں میں بنیادی سہولیات کی دستیابی جیسے منصوبے شامل ہیں۔

اضلاع کی کارکردگی

وفاقی حکومت کے ادارے اکادمی برائے تعلیمی منصوبہ بندی و مینجمنٹ (اے ای پی اے ایم) کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق 18 لاکھ بچے اسکول نہیں جاتے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، بلوچستان میں 13,279 سرکاری اسکول ہیں۔ ان میں سے 84 فیصد

پرائمری اسکول ہیں۔صرف سولہ فیصد اسکول طالبعلموں کو مڈل ثانوی تعلیم فراہم کر رہے ہیں۔ تقریباً 54 پرائمری اسکول صرف ایک ٹیچر کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بلوچستان کے تقریباً 26 فیصد اسکولوں میں صرف ایک کمرہ جماعت ہے۔ بلوچستان کے 83 فیصد پرائمری اسکولوں کی عمارتیں ''غیر تسلی بخش'' ہیں۔

ایک غیر سرکاری ادارے الف اعلان کے مطابق، بلوچستان میں 5 سے 16 برس کی عمر کی 75 فیصد لڑکیاں اسکول نہیں جاتیں جبکہ اسی عمر کے 65 فیصد لڑکے اسکول نہیں جاتے۔ صوبے میں لڑکیوں کو بدستور ناگوار صورتحال اور تعلیمی عمل سے محرومی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔الف اعلان نے انکشاف کیا کہ بلوچستان میں صرف 25 فیصد لڑکیوں کو اسکول جانا نصیب ہوا ہے جبکہ اس حوالے سے مردوں کی تعداد 60 فیصد ہے۔

ہر برس 130,000 طالبعلم اسکول میں داخل ہوئے جن میں سے صرف امتحان 61,000 میٹرک کے امتحان میں بیٹھتے ہیں اور صرف تیس ہزار امتحان پاس کر پائے۔ بلوچستان کے 32 اضلاع میں سے،23 اضلاع کا تعلیمی اسکور 50 فیصد سے کم ہے۔

گلگت بلتستان (جی۔بی) ایک پہاڑی علاقہ ہے مگر یہاں بچوں کے اندراج کی شرح دیگر صوبوں کی نسبت بہتر ہے۔گلگت بلتستان میں 85 فیصد بچے اسکول جاتے ہیں۔ پاکستان میں قومی سطح پر شرح 81 فیصد ہے۔اسکول سے خارج ہونے اور اسکول چھوڑنے والے بچوں کی شرح قومی سطح پر 81 فیصد ہے۔ جی بی میں اسکول سے خارج ہونے اور اسکول چھوڑنے والے بچوں کی شرح 2015ء کی نسبت کم ہوئی ہے۔ 2015ء میں 15 فیصد بچے کبھی بھی اسکول میں داخل نہیں ہوئے تھے اور 3 فیصد مختلف وجوہات کے باعث اسکول چھوڑ گئے تھے۔

ابتدائی برسوں سے جماعت دہم تک اندراج،جنسی مساوات اور والدین کی تعلیم کے حوالے سے ضلع ہنزہ۔نگر جی۔بی کے تمام ساتوں اضلاع سے آگے ہے جہاں اندراج کی شرح 97.6 فیصد ہے۔ جماعت اول سے دہم تک میں اندراج کے حوالے سے 96.9 فیصد کے ساتھ غذر دوسرے نمبر پر جبکہ 92.8 فیصد اندراج داخلہ کے ساتھ استور تیسرے نمبر پر ہے۔تاہم ضلع دیامر میں اندراج داخلہ کے حوالے سے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے زیادہ ہے اور جماعت اول سے دہم تک کی صورتحال یہ ہے کہ اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد اسکول جانے والے بچوں سے زیادہ ہے اور اسکول جانے والی بچیوں میں سے صرف 16 فیصد ایسی تھیں جو کہ کم از کم

ایک جملہ لکھ سکتی تھیں۔ دیا مر میں اوائل بچپن کی سطح کی تعلیم میں صرف نو فیصد بچے اسکول جاتے ہیں جبکہ 91 فیصد اسکول نہیں جاتے۔

غلط ترجیحات

وزیراعظم کی قومی لیپ ٹاپ اسکیم پر اربوں روپے خرچ کیے گئے اور پہلے مرحلے میں 4ارب روپے مالیت کی 100,000 مشینیں طالب علموں میں تقسیم کی گئیں۔ دوسرے مرحلے میں فروری۔مارچ 2016ء کے دوران طلباء کو 25,867 لیپ ٹاپ دیے گئے جس کے باعث پہلے مرحلے میں ہونے والے اخراجات میں مزید اضافہ ہوا۔

جبکہ دوسری طرف، یونیسکواور عالمی بینک کی رپورٹس کے مطابق، دو کروڑ، چالیس لاکھ (24 ملین) بچے اس وقت اسکول نہیں جاتے، پچاس فیصد اسکولوں میں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے (الف اعلان کی ضلعی تعلیم کی درجہ بندیاں 2016) اور صرف بلوچستان میں گھوسٹ اساتذہ کی تعداد 15,000 جبکہ گھوسٹ اسکول کی تعداد 900 ہے۔

آزاد اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں 17 سے 23 برس کی عمر کے صرف 5.1 فیصد لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بنیادی تعلیم کے علاوہ کسی اور چیز پر اربوں روپے خرچ کردینااوروہ بھی نوجوانوں کی انتہائی کم تعداد پر کہاں کی عقلمندی ہے؟ کیا حکومت نے دیگر نوجوانوں کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے؟

قانون سازی

پاکستان کے آئین میں مفت پرائمری تعلیم کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔اٹھارہویں ترمیم کے بعد تعلیم کا شعبہ صوبوں کو منتقل کردیا گیا تھا۔ چاروں وفاقی اکائیاں اور دیگر علاقے آئین کے آرٹیکل 25.A کے تحت تعلیم کے حق پر قانون سازی کرنے کے پابند ہیں۔ تاہم، پانچ برس سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود قانون سازی کا عمل مکمل نہیں ہوا۔ صوبے یاتو بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے حق پر قانون سازی کرنے میں یا قانون پر اس کی روح کے مطابق عملدرآمد کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

اسلام آباد دارالحکومتی علاقہ (آئی سی ٹی): اسلام آباد دارالحکومتی علاقہ کے لیے مفت ولازمی تعلیم کا ایکٹ 2012 سینٹ اور قومی اسمبلی سے منظور ہوا اور بعدازاں دسمبر

2012,19 کو صدر مملکت نے اس پر دستخط کیے۔ قانون کے تحت آئی سی ٹی میں رہائش پذیر تمام پانچ سے سولہ برس کے بچوں کے لیے پرائمری تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی مگر اس قانون کے نفاذ کا انحصار ضوابط پر ہے جو ابھی تک تشکیل نہیں دیئے گئے۔

پنجاب: گورنر پنجاب نے 13 مئی 2014ء کو پنجاب مفت و لازمی تعلیم کا آرڈیننس 2014ء نافذ کیا جسے بعد ازاں پنجاب اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ بعد ازاں، آرڈیننس کو قائمہ کمیٹی برائے تعلیم کو پیش کیا گیا تاکہ کمیٹی اس کا جائزہ لے سکے۔ 10 نومبر، 2014ء کو اسمبلی نے آرڈیننس کی منظوری دی جس کے نفاذ کا انحصار قواعد و ضوابط پر ہے جو ابھی تک ترتیب نہیں دیے جا سکے۔

خیبر پختونخوا: خیبر پختونخوا میں بچوں کی مفت تعلیم و لازمی تعلیم کا ایکٹ 2014ء سال کے اختتام پر اسمبلی میں زیر غور تھا۔

سندھ: بچوں کی مفت و لازمی تعلیم کا بل 2013ء سندھ اسمبلی سے منظور ہوا اور گورنر سندھ نے 6 مارچ، 2013ء کو اس کی منظوری دی۔ مگر اس قانون کا نفاذ بھی قواعد و ضوابط پر منحصر ہے جو ابھی تک تیار نہیں ہو سکے۔

بلوچستان: گورنر بلوچستان نے 12 مارچ، 2013ء کو بلوچستان کے لیے مفت و لازمی تعلیم کا آرڈیننس منظور کیا۔ بلوچستان اسمبلی نے 6 فروری، 2014ء کو بلوچستان مفت و لازمی تعلیم ایکٹ 2014ء منظور کیا مگر اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے درکار قواعد و ضوابط ابھی تک تشکیل نہیں دیئے گئے۔

وفاق کے زیر انتظام علاقہ جات (فاٹا)، گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر میں مفت و لازمی تعلیم کا قانون ابھی تک زیر التواء ہے۔

این ای پی **2009**ء نظر ثانی کمیٹی: قومی تعلیمی پالیسی 2009 نظر ثانی کمیٹی نے 25 جون، 2015ء کو اپنا اجلاس منعقد کیا اور تمام وفاقی اکائیوں کی طرف سے تشکیل دیئے جانے والے فوکس گروپ کی منظوری دی۔ گروپ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اٹھارہویں ترمیم، پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 25-A، تعلیمی وژن 2025ء، پاکستان کی عالمی ذمہ داریوں، عالمی رجحانات اور استحکام پذیر ترقیاتی اہداف (ایس ڈی ایس) کی روشنی میں این ای پی 2009ء میں کچھ چیزیں شامل کرنے یا ختم کرنے کے لیے ٹھوس سفارشات پیش کرے۔ یہ طے پایا تھا کہ

جنوری 2016ء میں نظرثانی شدہ این ای پی 2009ء جاری کی جائے گی مگر سال کے اختتام تک ایسا نہیں ہوسکا تھا۔

ضلعی تعلیمی درجہ بندی 2016

پاکستان کی سالانہ ضلعی تعلیمی درجہ بندی 2016ء کا چوتھا ایڈیشن مئی 2016ء میں شائع کیا گیا جس میں سکول میں برقرار رہنے، تعلیم جاری رکھنے، سیکھنے، صنفی مساوات اور سکولوں کی سہولیات کی بنیاد پر ملک کے تمام 151 اضلاع کے تعلیمی سکور کا جائزہ لیا گیا۔

رپورٹ کے مطابق ملک کے تقریباً 48 فیصد سکول بیت الخلاء، چار دیواری، بجلی اور پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں جبکہ پنجاب اور خیبر پختونخوا (کے پی) مختلف تعلیمی معیارات کے لحاظ سے دیگر دو صوبوں: سندھ اور بلوچستان سے آگے ہیں۔

سرفہرست 22 اضلاع کا تعلق پنجاب سے ہے جبکہ کے پی کا ضلع مردان 23ویں نمبر پر ہے۔ ایف آر لکی مروت اس فہرست میں سب سے آخری 146ویں نمبر پر ہے۔ سکولوں کی تکمیل سے متعلق نئی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے تمام سرکاری سکولوں میں سے صرف 52 فیصد میں تمام چار سہولیات یعنی بیت الخلاء، چار دیواریاں، بجلی اور پینے کا صاف پانی دستیاب ہے۔ سکولوں کے بنیادی ڈھانچے کے سکور کے لحاظ سے 146 میں سے صرف 24 کا سکور 90 سے زیادہ رہا۔

اس فہرست سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری سکولوں میں 81 فیصد تعداد پرائمری سکولوں کی ہے جس کا مطلب ہے کہ پرائمری تعلیم کے بعد ملک کے بچوں کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے خاطر خواہ مواقع میسر نہیں ہیں۔ سکولوں میں قیام اور صنفی مساوات کے لحاظ سے تمام صوبوں میں بتدریج تنزلی دیکھنے میں آئی، سوائے پنجاب کے جس کی کارکردگی میں مسلسل بہتری آئی ہے۔ تاہم ضلع لاہور جسے حکمران جماعت کا گڑھ کہا جاتا ہے 2015ء کے مقابلے میں تیسرے سے بائیسویں درجے پر چلا گیا۔

ضلع وار درجہ بندی ظاہر کرتی ہے کہ اسلام آباد، پنجاب اور خیبر پختونخوا کے مختلف اضلاع میں تعلیم اور انفراسٹرکچر کے حوالے سے نسبتاً بہتری آئی ہے۔ تاہم وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا)، بلوچستان اور سندھ مسلسل خراب کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔

کچھ اضلاع نے انفرادی طور پر بہتری دکھائی تاہم ان کے معیار تعلیم اور سکولوں کے

انفراسٹرکچر میں کوئی ملک گیر بہتری دیکھنے کو نہیں ملی۔ وفاقی دارالحکومت پہلی مرتبہ تمام صوبائی، علاقائی اور ضلعی درجہ بندیوں میں سب سے آگے رہا جہاں سیکھنے اور سکول میں داخلے کے سکور میں اضافہ ہوا۔

اسی طرح، اگرچہ اسکولوں میں تعلیم جاری رکھنے کے سکور میں کمی کے باعث پنجاب کا تعلیمی سکور کم ہوا تاہم صنفی مساوات کے لحاظ سے اس کا سکور سب سے زیادہ رہا۔ گزشتہ سال صوبے کا تعلیمی سکور مہارت کے حصول میں کمی کی وجہ سے متاثر ہوا۔ تاہم فہرست کے نچلے وسط میں موجود تینوں اضلاع: ڈیرہ غازی خان، مظفرگڑھ، اور راجن پور کا تعلق پنجاب سے ہے۔

اگرچہ خیبر پختونخوا نے سکول میں داخلے اور صنفی مساوات کے حوالے سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تاہم صوبے میں اسکولوں میں برقرار رہنے کی شرح کم ہوگئی جس کے نتیجے میں مجموعی تعلیمی سکور متاثر ہوا۔ دوسری جانب سکول انفراسٹرکچر کے سکور کے لحاظ سے خیبر پختونخوا تیسرے نمبر پر رہا جو نمایاں بہتری کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم صوبے کے 50 فیصد سکول اب بھی چاروں بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔

بلوچستان اور سندھ میں تعلیم اور بنیادی ڈھانچے کا سکور کم ترین رہا۔ بلوچستان کا تعلیمی سکور کم ہوگیا ماسوائے کوئٹہ کے (جو 50 سرفہرست اضلاع میں سے ایک ہے) بلوچستان کے تقریباً نصف اضلاع 100 سرفہرست شہروں میں شامل نہیں تھے۔ سندھ میں علم کے حصول کی شرح اس سال سب سے کم رہی۔ علاوہ ازیں، بلوچستان کے صرف چھ اضلاع سرفہرست نصف اضلاع میں شامل ہیں۔ ایک مرتبہ پھر صرف کراچی سرفہرست 50 اضلاع میں شامل ہے۔ سکول انفراسٹرکچر کی صورتحال بھی مایوس کن رہی اور صرف 23 فیصد سکول ایسے تھے جہاں تمام چار بنیادی سہولیات موجود تھیں۔

اگرچہ متعدد مشکلات کے باعث گزشتہ چار سالوں کے دوران گلگت بلتستان کی کارکردگی کی رفتار سست رہی تاہم اس کے باوجود علاقے نے تعلیمی سکور میں 3 فیصد اضافے کے ساتھ نسبتاً بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ فاٹا نے اپنے تعلیمی سکور میں تین فیصد اضافہ کر کے بلوچستان کو پیچھے چھوڑ دیا۔

صنفی عدم مساوات

تعلیم میں صنفی عدم مساوات ملک بھر میں موجود ہے۔ الف اعلان کی ضلعی درجہ

بندی 2016ء کے مطابق ملک بھر میں لڑکوں کے سکولوں کی تعداد 96,365 اور لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد صرف 57,779 ہے، حالانکہ ملک میں خواتین کی آبادی کی شرح مردوں سے زیادہ ہے۔

ان سکولوں میں مرد اساتذہ کی تعداد 407,795 جبکہ خواتین اساتذہ کی تعداد 286,832 ہے۔ سکولوں سے باہر لڑکوں کی شرح 43 فیصد اور لڑکیوں کی 52 فیصد ہے، جس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تعلیم کے میدان میں لڑکیوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ سکول ترک کرنے کی شرح لڑکوں میں 40 فیصد اور لڑکیوں میں 42 فیصد ہے۔ ایسے مرد جو کبھی سکول نہیں گئے ان کی شرح 31 فیصد جبکہ لڑکیوں میں یہ شرح 55 فیصد ہے۔

قدرتی وسائل سے مالا مال بلوچستان کی صورتحال بدترین ہے۔ صوبے میں لڑکوں کے سکولوں کی کل تعداد 9,399 ہے جبکہ لڑکیوں کے لیے صرف 3,880 سکول ہیں جو لڑکوں کے سکولوں کا تقریباً ایک تہائی ہیں۔ صنفی عدم مساوات اساتذہ کی تعداد میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ صوبے میں مرد اساتذہ کی تعداد 4 9 5 , 0 3 جبکہ خواتین اساتذہ کی تعداد صرف 15,287 ہے۔ الف اعلان کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ سکول جانے کی عمر کے بچوں کی 70 فیصد تعداد سکول سے باہر ہے اور ان میں لڑکیوں کی شرح 75 فیصد ہے۔ لڑکوں میں سکول ترک کرنے کی شرح 71 فیصد اور لڑکیوں میں 73 فیصد ہے۔ ایسے افراد جو کبھی سکول نہیں گئے ان میں لڑکیوں کی شرح بہت زیادہ ہے۔ لڑکیوں میں یہ شرح 83 فیصد اور لڑکوں میں 46 فیصد ہے۔

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات میں لڑکوں کے سکولوں کی تعداد 3,560 اور لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد 2,451 ہے۔ مرد اساتذہ کی تعداد 13,033 اور خواتین کی 6,417 ہے۔ سکول سے باہر لڑکوں کی شرح 45 فیصد جبکہ لڑکیوں کی 75 فیصد ہے۔ لڑکوں میں سکول ترک کرنے کی شرح 67 فیصد اور لڑکیوں میں 72 فیصد ہے۔

گلگت بلتستان میں لڑکوں کے سکولوں کی تعداد 859 اور لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد صرف 416 ہے، حالانکہ لڑکوں اور لڑکیوں کی آبادی کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ علاقے میں مرد اساتذہ کی تعداد 4,458 ہے لیکن خواتین اساتذہ کی تعداد 2,269 ہے۔ سکول سے باہر لڑکوں کی شرح 46 فیصد جبکہ لڑکیوں کی شرح 53 فیصد ہے۔

ملک کے سب سے خوشحال اور وسائل سے مالا مال صوبہ پنجاب میں مرد اساتذہ کی

تعداد 162,117 اور خواتین اساتذہ کی تعداد 158,947 ہے، تاہم لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد لڑکوں کے سکولوں سے زیادہ ہے۔ سکول سے باہر لڑکیوں کی شرح لڑکوں سے زیادہ ہے۔ لڑکیوں میں یہ شرح 46 فیصد اور لڑکوں میں 42 فیصد ہے۔ ایسے بچے جو کبھی سکول نہیں گئے ان کی شرح 40 فیصد رہی، جن میں مردوں کی شرح 40 فیصد اور خواتین کی 49 فیصد ہے۔

رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ خیبر پختونخوا کے سکولوں میں بھی وسیع صنفی عدم مساوات موجود ہے۔ خیبر پختونخوا میں لڑکوں کے لیے 17,649 جبکہ لڑکیوں کے لیے 10,529 سکول ہیں۔ ان سکولوں میں لڑکوں کے لیے 80,027 لیکن لڑکیوں کے لیے صرف 43,264 اساتذہ ہیں۔

صنفی عدم مساوات کے لحاظ سے دوسرا سب سے زیادہ متاثرہ صوبہ سندھ ہے۔ لڑکوں کے لیے سکولوں کی کل تعداد 35,551 ہے جبکہ لڑکیوں کے لیے یہ تعداد 10,488 ہے۔ صوبے میں مرد اساتذہ کی تعداد 99,493 اور خواتین اساتذہ کی تعداد 44,677 ہے۔ سکول سے باہر لڑکوں کی شرح 51 فیصد اور سکول سے باہر لڑکیوں کی شرح 61 فیصد ہے۔ لڑکوں میں سکول ترک کرنے کی شرح 49 فیصد اور لڑکیوں میں 50 فیصد ہے۔ ایسے مرد جو کبھی سکول نہیں گئے ان کی شرح 31 فیصد ہے، جبکہ ایسی خواتین کی شرح 54 فیصد ہے۔

اعلیٰ تعلیم

اپریل 2010ء میں اٹھارہویں ترمیم کی منظوری اور شعبہ تعلیم کی صوبوں کو منتقلی کے بعد اعلیٰ تعلیم ملک میں شدید بحران کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ پنجاب ہائیر ایجوکیشن کمیشن (پی ایچ ای سی) اور فیڈریشن آف آل پاکستان یونیورسٹیز اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن (ایف اے پی یو اے ایس اے) کے درمیان چپقلش سال بھر جاری رہی۔ بلوچستان کی یونیورسٹیوں کے پاس ہائیر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کے خلاف شکایات کی ایک طویل فہرست تھی، اور خیبر پختونخوا ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے ابھی تک کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔

اٹھارہویں ترمیم کے تحت صوبوں نے اپنے ہائیر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) تشکیل دینے تھے۔ لیکن چھ سال سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود صرف پنجاب اور سندھ نے اپنے ایچ ای سی قائم کیے تھے، جبکہ بلوچستان، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان اس حوالے سے کوئی حقیقی

پیش رفت کرنے میں ناکام رہے۔

کیو ایس (کواکوریلی سائمنڈز) کی اعلیٰ تعلیمی اداروں سے متعلق 17-2016 کی درجہ بندیوں میں پاکستان سب سے آخری نمبر پر تھا۔ ٹائمز ہائیر ایجوکیشن (یوکے) کی درجہ بندیوں کے مطابق دنیا کی 500 بہترین یونیورسٹیوں میں پاکستان کی ایک بھی یونیورسٹی شامل نہیں۔

خصوصی افراد کے لیے تعلیمی سہولیات

2015ء کی طرح 2016ء میں بھی جسمانی طور پر متاثرہ طلباء کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

3 دسمبر کو خصوصی افراد کے عالمی دن کے موقع پر وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے پیغام میں خصوصی افراد کے لیے ایک باوقار زندگی کو یقینی بنانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرنے کا عہد کیا۔ انہوں نے خصوصی افراد کی خودمختاری کو فروغ دینے، ان کے لیے مواقع کی فراہمی اور مساوی شرکت کا وعدہ کیا۔ تاہم سال کے دوران عملی طور پر ان کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ ان کے لیے نہ تو کسی قسم کے نئے تعلیمی ادارے کھولے گئے اور نہ ہی پہلے سے فعال اداروں میں خصوصی افراد کے لیے مخصوص سہولیات فراہم کی گئیں۔

جنوری کے دوسرے ہفتے میں بصارت سے محروم افراد نے لاہور میں سرکاری اداروں کے خلاف مظاہرہ کیا جس میں انہوں نے تعلیمی سہولیات کی فراہمی اور خصوصی افراد کے لیے تین فیصد ملازمتی کوٹہ پر عمل درآمد، اور ان کی ملازمتوں کو مستقل کرنے کا مطالبہ کیا۔

محتاط اندازوں کے مطابق ملک میں خصوصی بچوں کی تعداد 80 لاکھ سے زیادہ ہے جن میں سے زیادہ تر کو ملک کے عام یا خصوصی سکولوں تک رسائی نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ اداروں میں گنجائش کم ہے۔ جسمانی طور پر متاثرہ افراد اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ تعلیم ان کا بنیادی حق ہے لیکن امتیازی نظام کے باعث وہ اپنے اس حق سے محروم ہیں۔ آئین کا آرٹیکل 25-A اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ ریاست 5 سے 16 سال کی عمر کے تمام بچوں کو بلا تفریق تعلیم فراہم کرے لیکن جسمانی طور پر متاثرہ افراد کی تعلیم کے لیے کبھی بھی خصوصی انتظامات نہیں کیے گئے، جو ان کے بنیادی انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

یہ خصوصی افراد کے حقوق سے متعلق میثاق (سی آر پی ڈی) کی بھی خلاف ورزی ہے

ملک میں جسمانی طور پر متاثرہ طالبعلموں کی حالت میں بہتری نہ آ سکی

جس پر پاکستان سمیت 153 ممالک نے گزشتہ سال 5 جولائی کو دستخط کیے تھے۔ پاکستان ان 107 ممالک میں سے ایک ہے جنہوں نے اس معاہدے کی توثیق کر رکھی ہے۔ اس میثاق کا سب سے بنیادی اصول ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو زیادہ جامع ہو، رکاوٹوں سے آزاد اور حقوق پر مبنی ہو۔

پاکستان میں خصوصی افراد کو صحت، تعلیم اور سماجی خدمات سے مسلسل محروم رکھا جاتا ہے۔ انہیں اپنی برادری میں شرکت کے مواقع سے بھی اکثر محروم رکھا جاتا ہے اور انہیں تشدد اور ناروا سلوک کا بھی سامنا رہتا ہے۔ کافی عرصہ پہلے جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ایک آرڈیننس منظور کیا گیا تھا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ خصوصی افراد کی بحالی نو کے لیے اقدامات کیے جائیں اور انہیں سماجی تحفظ فراہم کیا جائے۔ لیکن یہ قانون کبھی بھی فعال نہیں ہو سکا۔

محتاط اندازوں کے مطابق پاکستان میں صرف 4 فیصد خصوصی بچوں کو سکولوں تک رسائی ہے۔ پاکستان میں 66 فیصد خصوصی افراد دیہی اور 34 فیصد شہری علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے 58 فیصد مرد ہیں۔ اندازوں کے مطابق سکول جانے کی عمر (4 سے 16 سال) کے 15 لاکھ بچے معمولی معذوری کا شکار ہیں جنہیں عام سکولوں میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔ تاہم خصوصی بچوں کی شناخت اور انہیں مرکزی دھارے میں لانا ایک مشکل کام ہے اور 2016ء میں اس حوالے سے کچھ نہیں کیا گیا۔

سکولوں میں جسمانی سزا

دسمبر کے دوسرے ہفتے میں سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو عام ہوئی جس میں ایک خوفزدہ بچے کو روتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ منظر ایک جماعت، یا شاید کئی جماعتوں کا تھا اور اس عمل کا ارتکاب کسی دیہات میں کھلی فضاء میں کیا گیا تھا۔ بچے کی عمر بظاہر چھ سے سات سال تھی؛ ویڈیو میں استاد کو نہیں دکھایا گیا تھا، لیکن اس کی آواز واضح طور پر سنی جاسکتی تھی۔ وہ اپنے طالب علم سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پاؤں پر رسی باندھ کر اسے درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دے گا۔

طالب علم اس کے سامنے کھڑا روتے اور آہ وزاری کرتے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پس منظر میں بیٹھے یا کھڑے طلباء بظاہر صورتحال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ہنس رہے تھے اور کچھ بظاہر اپنے استاد کا حکم بجالا رہے تھے تاکہ وہ اس کے غضب سے بچ سکیں۔

جیو نیوز کے ایک اینکر نے یہ ویڈیو دکھائی اور یہ انکشاف کیا کہ یہ ویڈیو موبائل سے بنائی گئی تھی اور غالب امکان یہ تھا کہ یہ واقعہ قصور کے نواح میں نومبر کے آخر میں پیش آیا تھا۔ اس دو منٹ اور پچاس سیکنڈ کی ویڈیو دیکھنے کے بعد اس انتہائی اہم سوال کا جزوی طور پر جواب مل سکتا ہے کہ: ''بچوں میں اسکول چھوڑنے کی انتہائی بلند شرح کی وجوہات کیا ہیں؟''

ٹیچر بظاہر صرف اپنے غیر اخلاقی لطف کے لیے بچے کا تمسخر اڑا رہا تھا لیکن وہ جس طرح سے بچے کو خوفزدہ کر رہا تھا وہ انتہائی ظالمانہ تھا۔ جس نے بھی یہ ویڈیو دیکھی ہے وہ اس بات سے اتفاق کرے گا کہ جلد یا بدیر یہ بچہ اسکول سے، یا اگر اس کے والدین نے اسے اسکول جانے پر مجبور کیا تو گھر سے فرار ہو جائے گا۔

یہ مکالمہ دیہات، حتیٰ کہ پاکستان کے چھوٹے شہروں اور قصبوں کے اسکولوں میں رائج ثقافت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ استاد اسے مزید سخت سزا دینے کے بارے میں سوچ رہا ہے، بچہ خود ہی تجویز کرتا ہے کہ اسے سزا کے طور پر ''مرغا'' بنا دیا جائے۔ یہ پاکستان اور برصغیر کے دیگر ممالک میں ایک عام سزا ہے۔

جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کا استاد سزا کی نوعیت سے مطمئن نہیں تو وہ اس سے کہتا ہے کہ وہ اسے مرغا بنانے کے بعد پائپ یا راڈ سے مارے مگر اسے درخت کے ساتھ نہ لٹکائے۔ بچہ سزا سے بچنے کے لیے اسے 20 روپے اور آخر میں انڈے کی پیشکش بھی کرتا ہے۔ بچہ کم سن ہے اور اس کی اپنے استاد کو کی گئی پیشکش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچے نے ضرور اسکول میں اکثر ایسا ہوتے

لاڑکانہ میں استاد کے تشدد نے ایک بچے کو قوت گویائی سے محروم کر دیا اور اسے اپاہج بنا دیا

دیکھا ہوگا۔ استاد بچے کو بار بار اس کے لیے انڈا لانے کو بھی کہتا ہے۔

اسکول کے بچوں میں اسکول ترک کرنے کی ایک بڑی وجہ اسکولوں میں دی جانے والی جسمانی سزا ہے، اگرچہ اس حوالے سے ایک قانون پارلیمان میں ایک طویل عرصے سے زیر التوا ہے۔ سندھ جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2013، پنجاب جسمانی سزا کی ممانعت کا بل، خیبر پختونخوا جسمانی سزا کی ممانعت کا بل، اور وفاقی سطح پر جسمانی سزا کی ممانعت کا بل کئی سالوں سے التوا کا شکار ہیں۔ وفاقی سطح پر جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2013ء کی اس وقت کی قومی اسمبلی نے 12 مارچ 2013ء کو اپنے آخری اجلاس میں منظوری دی تھی؛ تاہم پاکستان کے آئین کے آرٹیکل (3)76 کے مطابق اس بل کی معیاد ختم ہوگئی؛ قومی اسمبلی کی تحلیل سے پہلے سینیٹ نے اس کی منظوری نہیں دی تھی۔

حالیہ دنوں میں ایک اور واقعہ قومی میڈیا کی سرخیوں کی زینت بنا جس کا تعلق سندھ کیڈٹ کالج کے ایک طالب علم سے تھا جو استاد کے مبینہ تشدد کے باعث مفلوج ہو گیا تھا۔ کیڈٹ کالج لاڑکانہ کے 13 سالہ طالب علم محمد احمد تشدد کے باعث معذور اور مفلوج ہوگیا۔ احمد کا گلا دبایا گیا جس کے نتیجے میں اس کی گردن کی نازک ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ احمد جو کبھی ایک ذہین طالب علم تھا، اب بستر پر لاچار پڑا ہے اور اس کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ اس رپورٹ کے جاری ہونے تک احمد سندھ حکومت کے خرچ پر امریکا کے ایک ہسپتال میں علاج کا منتظر تھا۔

قومی ایکشن پلان کے تحت مدرسہ اصلاحات

مدرسہ اصلاحات، جو قومی ایکشن پلان (نیپ) کے تحت ایک اہم معاملہ ہے اس پر 2016ء کے دوران تقریباً کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کسی نہ کسی بہانے سے اس مسئلے کو مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔ مدارس اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کا کام شروع نہ کیا جا سکا۔

پارلیمان کے ایوان زیریں میں پیش کی گئی سرکاری دستاویز کے مطابق ،حکومت کا کہنا تھا کہ پنجاب نے صرف دو مدارس بند کیے حالانکہ صوبے میں مدارس کی کل تعداد 10,000 سے زیادہ ہے۔ تاہم سندھ نے 167 مدارس بند کیے جن کے مبینہ طور پر دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات تھے۔

خیبر پختونخوا میں، جہاں پاکستان تحریک انصاف اور اس کے اتحادیوں جماعت اسلامی اور قومی وطن پارٹی کی حکومت ہے، 13 مدارس بند کیے گئے۔

20 نکاتی قومی ایکشن پلان کے تحت، جس کی 2014ء میں پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر حملے کے بعد متفقہ طور پر منظوری دی گئی تھی ،حکومت نے مدارس کی تعلیم میں اصلاح کے علاوہ ملک کے ہر مدرسے کے اندراج اور انہیں باضابطہ بنانے اور ان مدارس کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے کا فیصلہ کیا تھا جن کے دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات تھے۔

اگرچہ وزارت داخلہ کے پاس مدارس کے اندراج سے متعلق کچھ تفصیلات موجود ہیں، تاہم دو سال گزرنے کے باوجود اس نے مدارس کی نگرانی اور انہیں باضابطہ بنانے کے حوالے سے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اصلاحات کے موضوع کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

نصابی اصلاحات

نومبر 2016ء کے تیسرے ہفتے میں مذہبی آزادی سے متعلق امریکی کمیشن (یو ایس سی آئی آر ایف) نے پاکستان کی نصابی کتب پر نظر ثانی کی سفارش کی۔ کمیشن کے خیال میں نصابی کتب میں اسلام پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسے ''واحد سچا'' مذہب قرار دیا گیا ہے جو پاکستان کے آئین کے علاوہ قائداعظم کے تصورات کے بھی خلاف ہے۔ 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آزادی کے اعلان سے پہلے بانی پاکستان محمد علی جناح نے اپنی تقریر میں کہا:

’’آپ کو آزادی ہے کہ آپ پاکستان میں اپنے مندروں میں جائیں، آپ کو آزادی ہے کہ آپ اپنی مسجدوں یا کسی بھی عبادت گاہ میں جائیں۔

’’آپ چاہے کسی بھی مذہب یا ذات یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں، اس سے ریاست کو کوئی سروکار نہیں ۔۔۔ہم ان دنوں میں آغاز کر رہے ہیں جہاں کوئی امتیاز نہیں ہے، جہاں کسی ایک برادری اور دوسری برادری میں کوئی امتیاز نہیں، جہاں کسی ایک ذات یا نسل اور دوسری ذات یا نسل میں کوئی امتیاز نہیں۔

’’ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ آغاز کر رہے ہیں کہ ہم ایک ریاست کے مساوی شہری ہیں۔۔‘‘

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ نے قائداعظم کی تقریر کا یہ حصہ آٹھویں اور نویں جماعت کے نصاب میں بھی شامل کیا ہے۔ لیکن عملی طور پر اسی صوبے کو جہاں قائداعظم کی جائے پیدائش (کراچی) بھی واقع ہے، اور بلوچستان کو اس بات کا سب سے زیادہ موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان کے اسکولوں میں قابل اعتراض مواد پڑھایا جاتا ہے۔

’’پاکستان میں رواداری کی تعلیم: سرکاری اسکولوں کی نصابی کتب میں مذہبی تعصب‘‘ نامی رپورٹ کا دعویٰ ہے کہ تمام جماعتوں کی نصابی کتب میں جنگ اور جنگی ہیروز کی تعظیم کی گئی ہے۔

پاکستانی تاریخ دان اور مصنف ڈاکٹر مبارک علی نے رپورٹ کے حقائق سے اتفاق کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کی نصابی کتب عام طور پر ہندوستانی برصغیر میں صدیوں تک قائم رہنے والی ’’اسلامی حکومت‘‘ اور جہاد کا حوالہ دیتی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ’’اسلامی دور حکومت‘‘ یا ’’ہندو دور حکومت‘‘ کہنا غلط ہے۔ ہندوستان میں ہونے والی جنگیں سیاسی تنازعات تھے نہ کہ مذہبی تنازعات۔

ان کا ماننا ہے کہ ہندوستانی برصغیر میں سیاسی تنازعے کو مذہبی تنازعے کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو دورخی مخالفت کے طور بیان کیا جاتا ہے۔ ہم تاریخ کو سیاہ اور سفید رنگوں میں دیکھنا چاہتے ہیں مگر حقیقت میں ایک واقعے کے پس پردہ کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

قومی کمیشن برائے امن وانصاف (این سی جے پی) کا کہنا ہے کہ حکومت اسکولوں

میں استعمال ہونے والی نصابی کتب میں سے ''نفرت انگیز مواد'' کے خاتمے سے متعلق اپنے وعدے کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ کمیشن کی رپورٹ، دم گھٹنے والی تعلیم سے آزادی، کہتی ہے کہ ماسوائے چند کتابچوں کے، اسکول کی سطح پر کسی قسم کی نصابی اصلاحات نہیں کی گئیں۔

رپورٹ میں 16-2015 کے تعلیمی سال کے دوران اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں پر توجہ دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نصابی کتب میں سے ''نفرت انگیز'' مواد کو خارج نہیں کیا گیا۔ این سی جے پی کی تحقیق میں نصابی کتابوں کے ایسے متعدد حصوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں دیگر مذاہب کے بارے میں غلط بیانی کی گئی ہے، یا ان پر تنقید کی گئی ہے یا ان سے نفرت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

جنرل ضیاء کی جانب سے متعارف کرائی گئی ''اسلامائزیشن'' کی پالیسیوں میں نصاب کو مکمل طور پر تبدیل کرنا بھی شامل تھا تاکہ پورے مواد کو اسلام کی ایک خاص تشریح کی بنیاد پر از سر نو مرتب کیا جا سکے جس کا بظاہر مقصد نوجوان نسل کے ذہنوں پر اسلامی نظریہ کی چھاپ لگانا تھا۔ اگرچہ سیاسی تجزیہ کاروں نے انتہا پسندی کو بنیاد فراہم کرنے پر ضیاء کے تعلیمی نظام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے تاہم اس کے بعد اقتدار میں آنے والی کسی بھی حکومت نے مبہم مواد کے خاتمے کے لیے کوئی عزم ظاہر نہیں کیا۔

اساتذہ کا احتجاج

مئی 2016ء میں صوبے کے تمام اضلاع سے آنے والے ایک ہزار سے زائد اساتذہ نے لاہور میں پنجاب اسمبلی کے سامنے سخت گرمی میں دو دن اور ایک رات گزاری۔ وہ اسکولوں کی مجوزہ ''نجکاری'' کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اساتذہ کے نمائندوں نے میڈیا کو بتایا کہ ''خراب کارکردگی'' کا بہانہ بنا کر سرکاری شعبہ کے پرائمری اسکولوں کو نجی شعبہ کے حوالے کرنا صوبے میں تعلیم کے خلاف ایک سازش ہے۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب حکومت نے 1,000 پرائمری اسکولوں کو پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن (پی اے ایف) کے ذریعے نجی شعبے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت 5,000 پرائمری اسکولوں کو سرکاری نجی اشتراک کے تحت چلانا چاہتی ہے۔

مارچ 2016ء میں سندھ پروفیسرز اینڈ لیکچررز ایسوسی ایشن (سپلا) نے صوبے بھر میں پروفیسروں اور لیکچراروں کی ترقی میں تاخیر کے خلاف مظاہرے کیے۔ پولیس نے مظاہرین کو

منتشر کرنے کے لیے واٹر کینن اور لاٹھیوں کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں کچھ افراد زخمی ہوئے۔

نومبر 2016ء میں صوبہ بلوچستان میں تربت، خضدار، لورالائی، اور ژوب میں بلوچستان ریزیڈنشل کالجز (بی آرسی) اسکولوں کے اساتذہ نے تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف کئی ماہ تک احتجاج کیا۔

سفارشات

1۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو تعلیم میں ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول کے لیے غیر معمولی اقدامات کرنا ہوں گے۔

2۔ ایسے قوانین جن کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ تمام بچے اسکول جائیں، ان کا نفاذ کیا جائے یا، جہاں ضروری ہو، ایسے قوانین متعارف کروائے جائیں۔صوبوں کو آئین کے آرٹیکل 25-A کی مطابقت میں مفت اور لازمی تعلیم کے حق سے متعلق قانون سازی کرنی چاہیے۔

3۔ تعلیم کے لیے جی ڈی پی کا کم از کم 4 فیصد بجٹ مختص کرنے سے متعلق بین الاقوامی رہنما اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

4۔ تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تعلیم میں صنفی عدم مساوات کا خاتمہ کیا جائے۔

5۔ تعلیم کے ذریعے فاصلے کو ختم کرنے اور لوگوں کو بااختیار بنانے کے لیے خواندگی بالغاں سے متعلق جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

6۔ نصابی کتب کے مواد پر نظرثانی، اور جہاں ضروری ہو، اسے ازسرنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ عقیدے پر مبنی ان تعصّبات کا خاتمہ کیا جاسکے جن کا مقصد ایک مخصوص نظریاتی نقطہ نظر کا فروغ ہے۔

معاشی
اور
سماجی حقوق

صحت

جنس، ذات، رنگ اور نسل کے امتیاز سے بالاتر، ریاست عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ایسے تمام افراد کو بنیادی ضروریات زندگی۔۔۔ مثلاً طبی سہولیات۔۔۔ فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقلاً یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل -38(اے) اور (ڈی)]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی پر حق رکھتا ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔ جس میں خوراک، لباس، رہائش، صحت برقرار رکھنے کی سہولیات، ضروری سماجی خدمات [بجلی، پانی، گیس وغیرہ] اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا ایسے حالات کے تحت جو اس کے بس سے باہر ہوں اور عدم روزگار کی کسی بھی صورت کے خلاف ضمانتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل 25(1)]

عوام کو بیماریوں سے تحفظ فراہم کرنے اور شفا بخشنے کے لیے معیاری طبی سہولیات کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے اور ان سہولیات سے مستفید ہونا عوام کا آئینی حق ہے۔ مگر زیادہ تر لوگوں کو صحت کی انتہائی مہنگی نجی خدمات پر انحصار کرنا پڑتا ہے یا وہ عطائیوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ غرباء کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ گندے پانی اور غیر صحت بخش حالات کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کے علاج پر صرف ہو رہا ہے جن سے بچا جا سکتا ہے، کے علاج پر صرف ہو رہا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں، ہسپتال اور صحت کے مراکز لوگوں کی پہنچ سے دور ہیں اور جن لوگوں کی پہنچ میں ہیں وہ بھی ان سہولیات سے محروم ہیں کیونکہ ان مراکز میں ضروری طبی سہولیات کی شدید کمی ہے اور کئی جگہوں پر مراکز فعال تک نہیں ہیں، مقامی با اثر افراد نے ان پر غیر قانونی قبضہ کر رکھا ہے اور انہیں اپنے مویشیوں کے باڑے یا سیاسی دفاتر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

ملک میں صحت سے متعلقہ اعداد و شمار حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ پاکستان میں متوقع اوسط عمر 59 برس ہے جو کہ دیگر قابل موازنہ ممالک کی اوسط سے کم ہے جہاں متوقع عمر 61 برس ہے۔ یونیسیف کے مطابق، گزشتہ دو عشروں میں نمایاں مثبت تبدیلیوں کے باوجود، پاکستان شیر خوار اور

نومولود بچوں میں شرح اموات کے حوالے سے پستی کی طرف رواں دواں ہے۔ 2014ء میں پاکستان حاملہ عورتوں کی شرح اموات کے حوالے سے 147ویں نمبر پر تھا مگر 2015ء میں 100,000 پیدائشوں پر 276 اموات کے ساتھ یہ 149ویں نمبر پر آ گیا۔ پاکستان ان ممالک کی فہرست میں تیسرے نمبر ہے جہاں شیر خوار بچوں میں شرح اموات بہت زیادہ ہے۔ پاکستان میں ہر ایک ہزار شیر خوار بچوں میں سے 95 مر جاتے ہیں جبکہ دیگر ممالک میں یہ تعداد 60 ہے۔ 94 بچوں کو مکمل نشو ونما نہیں مل پاتی۔ تقریباً 96 لاکھ بچے (9.6 ملین) غذائیت کی شدید کمی کا شکار ہیں۔ ہر سال 92,000 بچے نمونیا سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ماں اور بچے کی صحت کو لاحق مشکلات کا اسباب شدید غربت، حکومت کے پاس وسائل اور قابل انسانی سرمائے کا فقدان اور قوت بخش غذا کی قلت ہے۔

وفاقی حکومت نے نیشنل ہیلتھ انشورنس پروگرام کی بنیاد رکھی ہے۔ اسے پرائم منسٹرز نیشنل ہیلتھ انشورنس اسکیم، کہا جاتا ہے اور اس کے ذریعے مستحق گھرانے 300,000 روپے کی حد تک سات بڑی بیماریوں کا مفت علاج کرواسکتے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے اسکیم کے فوائد کا بہت زیادہ ڈھونڈورا پیٹا ہے مگر ناقدین کا خیال ہے کہ اس سے مفت طبی سہولیات کے مطالبے کو بہت زیادہ تقویت ملے گی اور جھوٹے دعووں کی منظوری کے لیے جعلی طبی بل جمع ہونے کے واقعات بھی پیش آئیں گے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس کی بجائے حکومت کو شعبہ صحت میں بہتری لانے پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے تاکہ لوگوں کو صحت کی سہولیات تک مساویانہ رسائی ہو سکے۔ تاہم جی ڈی پی کا صرف 0.9 فیصد صحت پر خرچ کیا جا رہا ہے جو کہ جمہوریہ کانگو اور بنگلہ دیش سے بھی کم ہے۔ جونیئر وزیر برائے نیشنل ہیلتھ سروسز، ریگولیشنز اور کوآرڈینیشن نے اسلام آباد میں ایک تقریب کے دوران ملک میں صحت کی حالت کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا: ”ترقی یافتہ ممالک مشینی سرجری متعارف کروا رہے ہیں۔ مگر ہمارے بچے ابھی بھی نمونیا، پیچش اور پولیو سے مر رہے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم جدید تکنیکوں سے مستفید ہونے سے پہلے ان بچوں کو طبی دیکھ بھال کی سہولیات فراہم کریں۔

وفاقی حکومت

2016-17 کے بجٹ میں صحت کے لیے 22.4 ارب روپے مختص کئے گئے جبکہ گزشتہ برس یہ رقم 11 ارب روپے تھی۔ اگرچہ اٹھارویں ترمیم کے بعد صحت صوبائی شعبہ بن گیا ہے مگر وفاقی حکومت نے بعض پروگراموں میں صوبوں کی معاونت کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

آخری نیشنل ہیلتھ پالیسی 2001 میں منظور ہوئی تھی۔ 2010ء میں پالیسی کا ایک مسودہ تیار ہوا تھا مگر صوبوں کو شعبے کی منتقلی کے باعث منظور نہیں ہوسکا تھا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں ایک مشترکہ نیشنل ہیلتھ وژن پر متفق ہوئی ہیں جو کہ صحت کی بنیادی سہولیات تک یونیورسل رسائی کے ذریعے تمام پاکستانیوں، بالخصوص عورتوں اور بچوں کی صحت میں بہتری لانے کا ایک لائحہ عمل فراہم کرتا ہے۔ اس کا مقصد ملک کی وفاقی وصوبائی ہیلتھ پالیسیوں کو صحت سے متعلقہ عالمی معاہدات اور ضوابط کی مطابقت میں لانا ہے جن پر پاکستان نے دستخط کر رکھے ہیں۔ صحت وآبادی کی بین الصوبائی کونسل کے ذریعے نگرانی اور جائزے کا انعقاد بھی اس لائحہ عمل کا حصہ ہے۔

وفاقی حکومت نے پرائم منسٹرز نیشنل ہیلتھ انشورنس اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت مستحق غریب گھرانے مخصوص سرکاری ونجی ہسپتالوں سے ایک خاص حد تک بعض بیماریوں کا علاج معالجہ کرواسکتے ہیں۔ چونکہ صوبوں کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ بھی اس اسکیم سے مستفید ہونا چاہیں تو اس حوالے سے مالیاتی معاونت کریں، چنانچہ سندھ اور کے پی اسکیم کا حصہ بننے سے گریزاں ہیں جس کے باعث وہاں اس منصوبے کا نفاذ نہیں ہوسکا۔ (پی ایم ہیلتھ انشورنس اسکیم کے تحت تفصیلات)

46 نئے ہسپتال

وزیراعظم نواز شریف نے 26 اگست کو وفاقی حکومت کی جانب سے پاکستان بھر میں نئے ہسپتال تعمیر کرنے کے منصوبے کی منظوری دی۔ ان میں سے تین ہسپتال اسلام آباد میں تعمیر ہوں گے۔

پنجاب

پنجاب نے شعبہ صحت کے لیے 43.8 ارب روپے مختص کئے: 24.5 ارب روپے خصوصی نجی نگہداشت اور طبی تعلیم کے لیے؛ 18 ارب روپے آبادی کی منصوبہ بندی کے لیے مختص کئے گئے۔ یہ رقم گزشتہ برس مختص کی گئی رقم سے 43 فیصد زائد تھی۔

خصوصی طبی نگہداشت کے شعبہ میں، حکومت نے 14 ارب روپے پاکستان گردہ و جگر انسٹی ٹیوٹ لاہور (پی کے ایل آئی) کے لیے جبکہ 12 ارب روپے صوبے میں تیسرے درجے کے چار ہسپتالوں کی مرمت کے لیے مختص کئے گئے۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ساہیوال اور ڈی جی خان میں ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں کو ٹیچنگ ہسپتالوں کا درجہ دینے کے لیے 4.31 ارب روپے مختص کیے گئے۔ اس منصوبے کے تحت ان ہسپتالوں میں آئی سی یوز، ڈینٹل یونٹ، برن

یونٹ اور فزیوتھراپی یونٹ قائم کیے جائیں گے۔ 3.7 ارب روپے تمام ڈی ایچ کیو ہسپتالوں جبکہ 1.5 ارب روپے 15 بڑے تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں کی مرمت کے لیے خرچ کیے جائیں گے۔

حکومت نے انسدادی طبی نگہداشت کو ترجیح دیتے ہوئے عمل تولید، ماؤں، نوزائیدہ بچوں کی صحت اور قوت بخش غذائیت کے پروگرام (آر ایم این سی ایچ) کے لیے 2.5 ارب روپے، قوت مدافعت کے توسیعی پروگرام (ای پی آئی) کے لیے ایک ارب روپے، پنجاب میں ہیپا ٹائٹس کی روک تھام اور اس پر کنٹرول پانے کے لیے پانچ سو ملین روپے اور جرائم کنٹرول پروگرام کے لیے چار سو ملین روپے مختص کئے گئے۔ حکومت نے صحت کے گردشی یونٹوں کی خریداری پر بھی ایک ارب روپے خرچ کرنا تھے۔

بجٹ کا اعلان کرتے وقت، وزیر خزانہ پنجاب نے کہا کہ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے 88 فیصد (30 ارب روپے) مزید فنڈ رکھا گیا ہے۔

علاوہ ازیں، وفاقی وصوبائی حکومت نے 13 ارب روپے کی لاگت کا 100 بستروں پر مشتمل زچہ۔ بچہ ہسپتال بنانے کے مشترکہ منصوبے کا اعلان بھی کیا۔ پنجاب کو اس پراجیکٹ کے لیے 45 کروڑ ملین روپے مختص کرنا تھے۔

چنانچہ، شعبہ صحت کے لیے پنجاب کا غیر ترقیاتی بجٹ 70.1 ارب روپے جبکہ ترقیاتی بجٹ 42.5 ارب روپے تھا۔ ترقیاتی اخراجات میں صحت کا حصہ 77.7 فیصد تھا۔ پنجاب کے صحت کے کل بجٹ میں پرائمری وثانوی طبی نگہداشت کا حصہ 42.4 فیصد تھا۔

زچہ وبچہ کی صحت کو درپیش مسائل کے بنیادی اسباب شدید غربت، اور حکومت کی سطح پر وسائل اور قابل انسانی سرمائے کا فقدان اور غذا کی قلت تھے

خیبر پختونخوا (کے پی)

خیبر پختونخوا نے شعبہ صحت کے لیے 21.576 ارب روپے مختص کیے۔ 11 ارب روپے جاری اور نئی سکیموں کے لیے۔ گزشتہ برس کی نسبت صحت کا بجٹ 18.29 فیصد زیادہ تھا۔ صحت کی جاری اسکیموں میں خیبر ٹیچنگ ہسپتال پشاور میں شعبہ حادثات وایمرجنسی اور ضلعی ہسپتال نوشہرہ کا قیام شامل تھا۔ گومل میڈیکل کالج ڈیرہ اسماعیل خان کے قیام کے لیے 340.069 ملین روپے مختص کئے گئے۔ گزشتہ برس اس کے تعمیراتی کام پر 2.551 ارب روپے خرچ ہوئے تھے۔ خیبر گرلز میڈیکل کالج میں آپریشن تھیٹرز اور مردہ خانے کی تعمیر کے لیے بھی 56.572 ملین روپے رکھے گئے۔ 12.9 ارب روپے صحت کے ضلعی دفاتر کو دیئے جائیں گے۔ صحت کے مختلف محکموں میں 338 پوسٹوں پر نئی تعیناتیاں کی جائیں گی جن پر 36 ملین روپے خرچ ہوں گے۔ 14,942 لیڈی ہیلتھ ورکرز اور 1.088 پرائمری ہیلتھ کیئر ویکسینیٹرز بھی بھرتی کئے جائیں گے جس کے لیے 3.1 ارب روپے خرچ ہوں گے۔

حکومت نے 36,232 نئی بھرتیاں کرنے کی منصوبہ بندی بھی کی ہے۔ ہیلتھ انشورنس کا اطلاق صوبے کے تمام علاقوں پر کیا جانا تھا جس پر اندازاً 3 ارب روپے خرچ آئے گا اور اس سے ایک کروڑ غریب گھرانے مستفید ہوں گے۔ اس اسکیم کے تحت 18 لاکھ گھرانوں کو ہیلتھ انشورنس کارڈز جاری کئے جائیں گے جس کے باعث وہ ثانوی اور تیسری سطح کی صحت کی سہولیات سے مستفید ہوسکیں گے۔ اور انہیں ادویات، عام سرجری، امراض نسواں کا علاج، دایہ گیری، آنکھوں کی بیماریوں کے علاج اور ای این ٹی جیسی طبی سہولیات میسر ہوں گی۔ ہسپتال میں داخل ہونے سے ایک دن قبل اور فارغ ہونے کے پانچ دنوں تک طبی نگہداشت کی فراہمی بھی اس منصوبے کا حصہ تھا۔ ہسپتال میں کسی مریض کی ہلاکت کی صورت میں، کفن دفن کے اخراجات کے لیے دس ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ حمل یا زچگی کی صورت میں، سفری الاؤنس کی مد میں دس ہزار روپے دیئے جائیں گے۔

سندھ

سندھ حکومت نے جاری مالی سال میں مختص کئے گئے 13 ارب روپے کے مقابلے میں سالانہ ترقیاتی منصوبے (اے ڈی پی) 17-2016ء میں 14 ارب روپے مختص کر کے صحت کے بجٹ میں گزشتہ برس کی نسبت 7.7 فیصد اضافہ کیا۔

صحت کے حالیہ ریونیو اخراجات میں گزشتہ برس کی نسبت 13.8 فیصد اضافہ کیا گیا۔ اس میں طبی تعلیم کے اخراجات بھی شامل تھے۔ گزشتہ مالی برس میں 57.9 ارب روپے رکھے گئے تھے جبکہ اس برس یہ رقم 65.9 ارب روپے تھی۔

بیرونی امداد سے چلنے والے منصوبوں، نیوٹریشن سپورٹ پروگرام سندھ کے لیے (1.4 ارب روپے؛ آئی ڈی اے) اور سکھر میں بچوں کی صحت کی دیکھ بھال کے ادارے کے لیے (40 کروڑ روپے، کوریا) کے قیام کے لیے 1.8 ارب روپے مختص کیے گئے۔

حکومت نے کہا کہ اس نے یو ایس ایڈ کی مدد سے شعبہ صحت کے تیار کردہ اخراجات کے تخمینے کے آلات کو بروئے کار لاتے ہوئے اور ضلعی ہیلتھ انفارمیشن سسٹم اور صحت کے مراکز کے قرب جوار کی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے ادویات کی فراہمی، امراض کی تشخیص، اور ڈی ایچ کیو، ٹی ایچ کیو، آر ایچ سیز، بی ایچ یوز اور ڈسپنسریوں پر اٹھنے والے اخراجات سمیت عملی سرگرمیوں کے اخراجات کے لیے وسائل میں اضافہ کیا ہے۔

ادویات کے بجٹ میں اضافہ ضرورت کی بنیاد پر کیا گیا جبکہ امراض کی تشخیص، سرجری کے آلات، آکسیجن گیس، کھانے پینے کی اشیاء اور مریضوں کی خوراک کے بجٹ میں 35 فیصد اضافہ کیا گیا۔ ٹیچنگ ہسپتال کا بجٹ دوگنا کیا گیا۔

سندھ حکومت اپنے گزشتہ برس کے صحت کا بجٹ صرف 31 فیصد استعمال کر سکی۔ پنجاب حکومت نے 80 فیصد، کے پی نے 85 سے 90 فیصد جبکہ بلوچستان نے صحت کے بجٹ کا 35 فیصد استعمال کیا۔ چنانچہ، مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ صحت کے لیے کم بجٹ رکھا جاتا ہے بلکہ مختص شدہ بجٹ کے استعمال میں حکومتی ناکامی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

بلوچستان

بلوچستان نے شعبہ صحت کے ترقیاتی و غیر ترقیاتی اخراجات کے لیے 17.36 ارب روپے مختص کیے۔ صحت کے نئے مراکز تعمیر ہونے تھے جبکہ ہسپتالوں اور صحت کے بنیادی مراکز کو مشینری اور آلات فراہم کیے جانے تھے۔ غریب اور ضرورت مند مریضوں کو مفت ادویات کی فراہمی پر 11.57 ارب روپے خرچ کیے جائیں گے۔ بلوچستان حکومت نے گزشتہ برس شعبہ صحت کے لیے 15.482 ارب روپے مختص کیے تھے۔

بلوچستان میں شیر خوار بچوں اور ماؤں کی اموات کے اعداد و شمار دیگر تمام صوبوں سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ پانی سے متعلقہ بیماریاں عام ہیں۔ پانی کی فراہمی اور صفائی کے انتظامات کی کمی، ناقص بندوبست، فضلے کو ٹھکانے لگانے کا ناقص انتظام اور آلودہ پانی بیماریوں کے بنیادی اسباب ہیں۔

یونیسیف کے مطابق بلوچستان کے نصف بچے ناقص غذا کا شکار ہیں جبکہ نوزائیدہ بچوں اور ماؤں میں اموات کی شرح کا دیگر صوبوں سے موازانہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یونیسیف کے مطابق، بلوچستان میں 16 فیصد بچے غذائیت کی کمی کا شکار ہیں۔ 52 فیصد مکمل نشو ونما پانے سے محروم ہیں اور 39.6 فیصد بچوں کا وزن کم ہے۔ صوبے کے تقریباً 63 فیصد بچے غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ صوبائی حکومت 9 اضلاع میں غذائی قلت کا شکار بچوں، حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی خواتین کی امداد کر رہی ہے تا کہ ان اضلاع میں ناقص نمو اور غذائیت بخش خوراک کے فقدان پر قابو پایا جاسکے تاہم صوبے میں امن وامان کی خراب صورتحال اور بکھری ہوئی آبادی نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔

صوبے کو پرائم منسٹر ہیلتھ انشورنس کے تحت خاص ترجیح دی گئی تھی۔ بلوچستان کے ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ اضلاع کو اس اسکیم کے دائرہ کار میں لایا جائے گا۔

نیشنل ہیلتھ انشورنس سکیم

وزیراعظم کی ہیلتھ انشورنس اسکیم کے تحت سرکاری ہسپتالوں اور مخصوص نجی ہسپتالوں میں مستحق افراد کی صحت کی بیمہ کاری کی جائے گی۔ ابتدائی منصوبے کے تحت، 23 اضلاع میں چلائی جانے والی اس اسکیم کے لیے 2015ء سے 2018ء تک ابتدائی طور پر 9 ارب روپے مختص کیے جائیں گے۔

سکیم کے تحت مستحق افراد ہسپتال میں داخل رہ کر کئی بیماریوں کے علاج معالجے کی سہولت سے مستفید ہو سکتے ہیں اور حکومت ہسپتالوں کو آسان شرائط پر قرضے دے گی تا کہ وہ صحت کی سہولیات میں بہتری لاسکیں۔

سکیم کے ڈائریکٹر کا کہنا تھا کہ اس پالیسی نے غریب مستحق افراد کو موقع دیا ہے کہ وہ چاہیں تو سرکاری ہسپتالوں کا رخ کریں یا پھر نجی ہسپتالوں میں اپنا علاج کروائیں۔ انہوں نے کہا کہ مخصوص ہسپتال پی این ایچ پی کو اپنے رعایتی نرخ جمع کروا چکے ہیں اور اس سے زیادہ وصول نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان ہسپتالوں کو ادائیگیاں روک دی گئیں تھیں جو مقررہ حد سے زیادہ

وصول کر رہے تھے یا دھوکہ دہی کی کوشش کر رہے تھے۔

اس پالیسی کے تحت ان غریب خاندانوں کی ہیلتھ انشورنس کی جائے گی جن کی فی دن آمدنی دو سو روپے یا اس سے کم ہے۔ مستفید ہونے والے افراد کا چناؤ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام (بسپ) کے کوائف کا استعمال کر کے کیا گیا تھا۔ اگر کوئی فرد اس پروگرام سے مستفید ہونے کا استحقاق رکھتا/رکھتی ہے تو وہ ہیلپ لائن 8500 پر اپنا کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ نمبر (سی این آئی سی) بھیجے تو اسے فوراً مطلع کیا جائے گا۔ اسٹیٹ لائف انشورنس کمپنی (ایس ایل آئی سی) ہیلتھ انشورنس کرتی ہے۔ منتخب مستحق افراد کو صحت کارڈ جاری کیے جاتے ہیں جنہیں وہ ہسپتالوں میں پیش کرتے ہیں۔

پاکستان میں صحت (ہیلتھ) کارڈ رکھنے والا گھرانہ ایک برس کے دوران ثانوی درجے کی صحت کی سہولیات کے لیے 50,000 ہزار جبکہ صحت کی ترجیحی سہولیات کے لیے 250,000 روپے تک اس کارڈ کا استعمال کر سکتا ہے۔ پچاس ہزار روپے تک کی رقم کا استعمال ہسپتال میں زیرِ علاج مریض کے لیے، (تمام میڈیکل اور جراحت سے متعلقہ اخراجات کے لیے) ہنگامی علاج کے لئے جس میں مریضوں کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہو، زچگی کی سہولیات کے لئے (بچے کی معمولی حالات میں پیدائش/سرجری کے ذریعے پیدائش) زچگی کے معاملات میں طبی مشاورت کے لئے (بچے کی پیدائش سے پہلے زیادہ سے زیادہ چار بار اور ایک مرتبہ بعد میں) ہڈی کا ٹوٹنا/زخم لگنا، ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد کا علاج کے لیے اور 350 تک کے مقامی سفر (ایک برس میں تین مرتبہ) کے اخراجات کے لئے کئے جا سکتے ہیں۔ ترجیحی علاج کے لیے مختص 250,000 روپے ان سات بیماریوں کے اخراجات کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں: دل کی بیماریاں (انجیو پلاسٹی/بائی پاس) جیسا کہ زندگی اور جسم کے اعضاء کے تحفظ کے لیے علاج معالجہ، پیوندکاری کے آلات، مصنوعی اعضاء کی پیوندکاری، گردوں کی بیماریوں کا علاج جو اپنے آخری مراحل میں ہوں/گردوں کی صفائی، متعدی بیماریاں (ہیپا ٹائٹس/ایچ آئی وی)، کسی عضو کا ناکارہ ہو جانا (جگر، گردہ، دل، پھیپھڑے) اور کینسر (کیموتھراپی، ریڈیوتھراپی، اور آپریشن)۔

ذہنی صحت

ذہنی صحت کے معاملے کو پاکستان میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ذہنی امراض کا شکار ہونے والوں میں سے صرف چند ایک ہی ایسے ہیں جنہیں علاج کی سہولت میسر ہے۔ ملک میں تقریباً پانچ کروڑ افراد

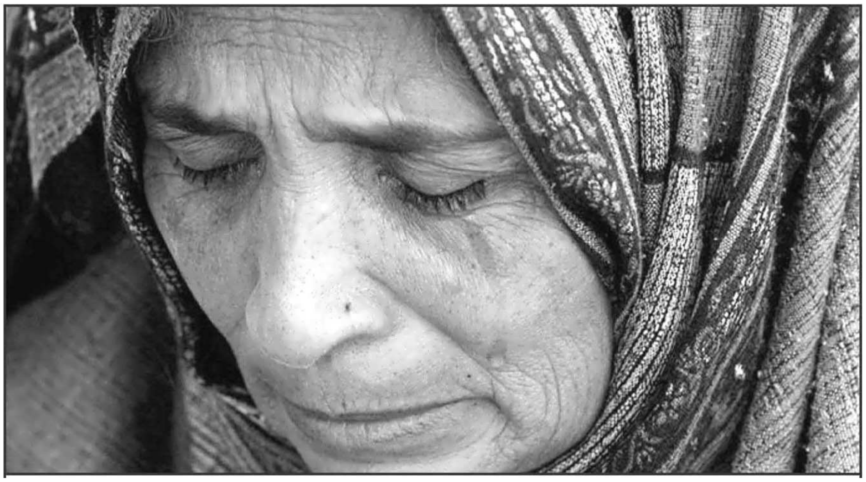

ملک میں تقریباً پانچ کروڑ افراد نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں مگر ڈبلیو ایچ او کے مطابق
ملک میں صرف 320 ماہرین نفسیات جبکہ نفسیاتی امراض کے 5 ہسپتال ہیں

مختلف نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں، تاہم عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کے پاس صرف 320 ماہرین نفسیات جبکہ نفسیاتی امراض کے صرف پانچ ہسپتال ہیں۔

پریشانی اور ذہنی بے چینی کے کیسز سب سے زیادہ ہیں جس کے بعد بالترتیب مزاج میں اتار چڑھاؤ، غیر مربوط ذہنی رویہ، جسمانی و نفسیاتی بگاڑ، ایک ہی کام کو بار بار کرنے کی عادت اور صدمے کے بعد کا ذہنی دباؤ کے کیسز کی تعداد آتی ہے۔ ذہنی مریضوں کو معاشرے کی رسوائی اور احساس بیگانگی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں شدید ذہنی امراض کا شکار 75 فیصد لوگوں کو کسی قسم کی نگہداشت نہیں ملتی۔

شعبہ نفسیاتی امراض، آغا خان یونیورسٹی (اے کے یو) کے مطابق، پاکستان میں اڑھائی کروڑ سے ساڑھے تین کروڑ بالغ افراد ذہنی بیماری کا شکار ہیں۔ مطلب یہ کہ ملک کی تقریباً دس سے پندرہ فیصد آبادی ذہنی مریض ہے۔ مزید برآں، تقریباً دو کروڑ (بیس ملین) بچوں یا ملک کی دس فیصد آبادی کو ذہنی امراض کے ڈاکٹروں کی توجہ کی ضرورت ہے۔

بعض ٹیچنگ ہسپتالوں میں پوسٹ گریجوایٹ تربیت اور تعلیم دستیاب ہے مگر چائلڈ، فورینسک، جبری ایٹرک (بوڑھوں کا طبی علاج) اور بحالی نو جیسے شعبوں میں ماہرین کی شدید کمی ہے اور مذکورہ ٹیچنگ ہسپتال تک دیہاتی آبادی کی رسائی بہت کم ہے۔

غذائیت کی کمی اور ناقص نشوونما

عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے مطابق، غذائیت کی کمی اور حفظان صحت کے ناقص بندوبست کے باعث پاکستان کے تقریباً ایک کروڑ (دس ملین) بچوں کی افزائش متاثر ہو رہی ہے۔

پاکستان گزشتہ کئی برسوں سے کوشش کر رہا ہے کہ ملک میں غذائیت کی کمی کی شرح کم کی جائے تاہم ملک میں بچوں کی کثیر تعداد کو دن میں ایک بار کا کھانا بھی نہیں ملتا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے بھوک کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ عالمی سطح پر صورتحال یہ ہے کہ ہر سال ہلاک ہونے والے پانچ برس سے کم عمر بچوں (27 لاکھ) میں سے آدھے غذائیت کی کمی کے باعث ہلاک ہوتے ہیں جن میں سے چھ فیصد ہلاکتیں پاکستان میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ غذائیت کی کمی نمو پذیر بچوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ ان میں ذہانت کی سطح کم ہوتی ہے، ان کی بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت کمزور ہوتی ہے اور بالغ ہو کر وہ ذیابیطس اور کینسر جیسی بیماریوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

غذائیت پر ہونے والے قومی سروے 2011ء میں پانچ مسائل کی نشاندہی کی گئی تھی۔ پہلا، تقریباً تیس فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے رہ رہی ہے جس کے باعث کئی گھرانے غذائیت بخش خوراک کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ دوئم، عورتیں اپنی زندگی میں اوسطاً 6.8 مرتبہ بچے پیدا کرتی ہے۔ یہ چیز تولیدی عمل کی بہت زیادہ شرح اور بچوں کی پیدائش میں وقفہ کم ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ عورتوں کو غذائیت بخش خوراک کا نہ ملنا اور ان کی طرف سے بہت زیادہ بچوں کی پیدائش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غذائیت کی کمی کا مسئلہ آنے والی نسلوں میں منتقل ہو جاتا ہے اور صورتحال یہ بن جاتی ہے کہ غذائیت کی کمی کا شکار خواتین غذائیت کی کمی کا شکار بچوں کو جنم دیتی چلی جاتی ہیں۔ تیسرا، پانچ برس سے کم عمر بچے جو ہلاک ہوتے ہیں ان میں سے 35 فیصد ہلاکتیں غذائیت کی کمی کے باعث واقع ہوتی ہیں۔ چوتھا، پانچ برس سے کم عمر تقریباً پندرہ فیصد بچے شدید غذائی کمی جبکہ 44 فیصد مستقل غذائی کمی کا شکار ہیں۔ پانچواں، پاکستان میں تقریباً 42 فیصد گھرانے غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں اور بچے پیدا کرنے کی عمر کو پہنچنے والی 18 فیصد خواتین وزن کی کمی (بی ایم آئی کے معیار کے مطابق 185 سے نیچے) کا شکار ہیں۔

پولیو

پاکستان پولیو وائرس (ڈبلیو پی وی 1) جیسی بیماری کا مسلسل نشانہ بن رہا ہے۔ 2016ء میں پاکستان میں پولیو کے 20 کیسز رپورٹ ہوئے تھے۔ افغانستان اور نائیجریا کے

ساتھ پاکستان دنیا کا تیسرا ملک ہے جو ابھی بھی پولیو سے متاثر ہو رہا ہے۔ پولیو بچپن میں لگنے والی عام بیماریوں میں شامل ہے جو جسم کو ناکارہ کرسکتی ہے یا مریض کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔

2016ء میں پنجاب اور گلگت بلتستان میں پولیو کا کوئی کیس رپورٹ نہیں ہوا تھا۔ کل 20 کیسز میں سے 8 کے پی سے، 8 سندھ سے، 2 فاٹا میں سے جبکہ دو کیس بلوچستان سے رپورٹ ہوئے تھے۔ البتہ 2016ء میں پنجاب سے 10 مثبت ماحولیاتی نمونے برآمد ہوئے تھے۔ تین راولپنڈی سے، تین فیصل آباد سے، دو ملتان اور ایک ڈی جی خان سے۔

پاکستان نے پولیو سے تحفظ کی خصوصی مہمیں چلائیں اور آخری مہم کا ہدف ملک بھر میں 37.2 ملین بچوں کو پولیو ویکسین دینا تھا۔ افغانستان کے تعاون سے پاک۔افغان بارڈر پر بھی رابطہ سازی کا کام کیا گیا تھا تاکہ اس متعدی بیماری کو ایک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونے سے روکا جاسکے۔

پولیو سے مقابلے کی ٹیکنالوجی

پنجاب انفارمیشن ٹیکنالوجی بورڈ (پی آئی ٹی بی) نے پنجاب میں پولیو، ڈینگی اور دیگر کئی بیماریوں کی ویکسینیشن کے لیے موبائل ایپس متعارف کروائی ہیں۔ ان ایپس کی مدد سے، علاقہ انچارج سمارٹ فون اور جغرافیائی انفارمیشن سسٹم پر مبنی نقشے (جی آئی ایس) استعمال کرکے پولیو کی مہموں کی افادیت کا جائزہ لے سکتا/سکتی ہے اور رپورٹ ارسال کرسکتا/سکتی ہے۔

جی آئی ایس کا مقصد یہ ہے کہ پولیو ٹیموں کو ان کے متعلقہ علاقوں کے بارے میں رہنمائی فراہم کی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ نقشے میں شامل تمام علاقوں کو پولیو

پاکستان پولیو کے وائرس کا بدستور نشانہ بنا رہا اور 2016ء میں پولیو کے 20 کیس رپورٹ ہوئے

ویکسینیشن فراہم ہو۔اس پروگرام کی مدد سے پولیو ورکرز کے مقام کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے اورانہیں بروقت مدد فراہم کی جاسکتی ہے۔

پولیو ورکرز کا تحفظ

پولیو ویکسینیشن کے خلاف پراپیگنڈہ ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پولیو ویکسینیشن کے بارے میں اجاگر ہونے والے شعور کی بدولت، والدین میں زبانی پولیو ویکسین (او پی وی) کی طلب بڑھ گئی ہے۔

2013ء سے لے کر اب تک 39 پولیو ورکرز مشتبہ شدت پسندوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔ 2016ء میں پولیو ویکسین عملے کے تحفظ پر مامور 19 پولیس اہلکار دو حملوں میں ہلاک ہوئے

13 جنوری کو سیٹلائٹ ٹاؤن کوئٹہ میں ایک پولیو ویکسینیشن سنٹر کے قریب ہونے والے خودکش بم دھماکے میں 12 پولیس اہلکاروں سمیت 14 افراد ہلاک جبکہ 10 سے زائد زخمی ہوئے۔ پولیس اہلکار پولیو ورکرز کے تحفظ کے لیے سنٹر کے باہر کھڑے تھے۔ 21 اپریل کو دہشت گردوں نے کراچی میں پولیو ویکسینیشن ٹیم کی حفاظت پر مامور سات پولیس اہلکاروں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔

پولیو سے متعلقہ سفری پابندیاں

پاکستان میں رہائش پذیر تمام افراد اور پاکستان کا دورہ کرنے والے ایسے تمام افراد جو چار سے زائد ہفتوں سے پاکستان میں قیام پذیر ہیں، کو اپنے بین الاقوامی سفر سے قبل چار ہفتوں سے 12 ماہ کے دوران او پی وی یا آئی پی وی کی ایک خوراک لینا پڑے گی۔ تمام بڑے ہسپتالوں، ای ڈی او کے دفاتر، صحت کے دفاتر، ڈی ایچ کیو ہسپتالوں اور ہوائی اڈوں پر پولیو ویکسینیشن کے مراکز قائم ہیں۔ ویکسین اور سٹرفکیٹ مفت فراہم کئے جاتے ہیں۔ نجی ڈاکٹرز اور نجی طبی کلینک ویکسین اور سٹرفکیٹ جاری نہیں کر سکتے۔ درست سٹرفکیٹ کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اجراء سرکاری ویکسینیشن کارڈ پر یا ڈبلیو ایچ او/ آئی ایچ آر کی ''زرد کتابچے'' پر ہو۔

صحت و صفائی کے اصول

حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ صفائی و پانی کے مسائل کے باعث پاکستان کو ہر سال خام

ملکی پیداوار (جی ڈی پی) میں چار فیصد کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور صفائی کی ناقص صورتحال کے باعث ہر سال 39,000 بچے موت کے منہ میں جاتے ہیں۔

اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے، حکومت نے 2016ء میں صاف وصحت مند پاکستان کے نام سے ایک ملک گیر مہم چلائی تا کہ معاشرے کے لوگوں کو پانی، صفائی اورحفظان صحت سے متعلقہ بری عادات چھوڑنے پر مائل کرنے کے لیے ان میں شعور اجاگر کیا جائے اور صحت مند طرز زندگی کو فروغ دیا جا سکے۔

پلان انٹرنیشنل کے مطابق، پاکستان دنیا کے ان پانچ ممالک میں شامل ہے جہاں پیچش کے باعث ہونے والی اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ ہر سال 53,000 بچے صرف پیچش کے باعث ہلاک ہوتے ہیں۔ ایک ایسی بیماری جس کا غیر معیاری پانی، صفائی اورحفظان صحت خاص طور پر ہاتھوں کی صفائی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے اور 60 فیصد شیر خوار بچے ناقص صفائی کے باعث ہلاک ہوتے ہیں اور دیانتداری کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام ہلاکتوں سے بچا جا سکتا ہے۔ پاکستان آبادیاتی وصحت سروے 2013ء کے مطابق، پانچ برس سے کم عمر تقریباً 53,000 بچے پیچش کے باعث مرتے ہیں۔ ہر 1,000 زندہ پیدائشوں میں سے 104 بچے اپنی پانچویں سالگرہ سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ پانی، صفائی اورحفظان صحت کی سہولیات میں بہتری لا کر اور لوگوں کو صحت کی سہولیات تک رسائی دے کر انسانی زندگیوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

ڈینگی

2016ء میں ملک کو ایک بار پھر ڈینگی کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ایک تحقیق کے مطابق، ان علاقوں میں ڈینگی کے وائرس پائے گئے تھے جو پہلے بھی اس بیماری سے متاثر ہوئے تھے اور بہت سے نئے علاقوں میں بھی بیماری کے پھیلنے کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔ شدید بارشوں کے باعث، گھروں میں پڑے پانی کی ٹینکیوں، روم کولرز، چھتوں اور کھلے مقامات پر پانی جمع رہنے سے اور پرانے قبرستانوں میں گھنی گھاس میں ڈینگی لاروا کی بہت زیادہ افزائش ہوئی۔ ٹائروں والی دکانوں پر بھی ڈینگی لاروا کی بہت زیادہ افزائش ہوئی تھی۔ 2016ء میں، راولپنڈی کے ہسپتالوں میں ڈینگی بخار کے 3,340 کیس رپورٹ ہوئے جبکہ سات افراد ہلاک ہوئے۔ سرکاری اہلکاروں کے مطابق، 2015ء میں پانچ ہزار کیس رپورٹ ہوئے جبکہ 10 ہلاکتیں پیش آئی تھیں۔

2016 میں ڈینگی کی بیماری نے ایک بار پھر حملہ کیا

لاہور میں کام کرنے والی صفائی کی گردشی ٹیموں نے موسم مون سون کے دوران 3,34,000 گھروں میں صفائی کی صورتحال کا معائنہ کیا۔ چار ہزار گھروں میں ڈینگی لاروا پایا گیا اور اسے ختم کیا گیا۔

سندھ میں ڈینگی کی روک تھام اور اس کے کنٹرول پروگرام کی سالانہ رپورٹ کے مطابق، 2016ء میں، سندھ میں ڈینگی بخار کے تقریباً 2,452 کیسز رپورٹ ہوئے جن میں سے 984 کیسز صرف کراچی سے رپورٹ ہوئے تھے جبکہ ڈینگی نے تین افراد کی جان لی۔

ہیپا ٹائٹس

تقریبا دو کروڑ پاکستانی جگر کو متاثر کرنے والی بیماری ہیپا ٹائٹس سے متاثر ہیں۔ خون سے پیدا ہونے والے جراثیم، بی اور سی سب سے زیادہ مہلک ہیں۔ ہیپا ٹائٹس سی کے لیے کوئی ویکسین نہیں ہے اور پاکستان میں اس کے پھیلاؤ کا بنیادی سبب خون کی غیر محفوظ طریقے سے منتقلی ہے۔ پاکستان ینگ فارماسسٹ ایسوسی ایشن کے مطابق، ادویات کی عدم دستیابی کے باعث، ہر سال چار ہزار سے زائد پاکستانی ہیپا ٹائٹس سی کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں اور دو کروڑ سے زائد پاکستانی اس بیماری سے متاثر ہوتے ہیں جن میں سے 60 لاکھ (چھ) ملین کو جگر کی مہلک بیماری لاحق ہوتی ہے اور بارہ لاکھ کو جگر کے کینسر کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

ہیپا ٹائٹس کا علاج انتہائی مہنگا تھا مگر اس کی ادویات کی قیمتیں بہت زیادہ کم ہوئی ہیں۔ عدالت عظمیٰ پاکستان نے ہیپا ٹائٹس سی کی انتہائی مہنگی ادویات کے حوالے سے ازخود نوٹس لیا تھا اور

حکومت کو ہدایات دیں تھیں کہ ہیپاٹائٹس کے مریضوں کو قیمتوں پر ادویات فراہم کی جائیں۔ پاکستان میں ہیپاٹائٹس کے مریض اب 32,000 روپے میں معجزانہ دوائی سوالڈی (Sovaldi) جبکہ اس کی عام قسم پانچ ہزار روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ گزشتہ دو برسوں سے ہیپاٹائٹس سی کی نئی اور انتہائی معیاری دوائی دستیاب ہے جس سے 12 ہفتوں میں ہیپاٹائٹس سی کا علاج ہو سکتا ہے اور مریض کو دن میں صرف ایک گولی کھانا پڑتی ہے۔

ملیریا

تقریباً 17 کروڑ، 70 لاکھ ملین پاکستانی ملیریا کا نشانہ بن سکتے ہیں اور تقریباً 35 لاکھ لوگ ہر سال ملیریا سے متاثر ہوتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کے بقول ہر سال P.viax ملیریا کی بدولت دنیا بھر میں ہونے والی ہلاکتوں میں سے 81 فیصد ہلاکتیں جن چار ممالک میں پیش آتی ہیں، پاکستان بھی ان میں شامل ہے۔

ملک نے اس بیماری پر قابو پانے کے لیے ملک گیر پروگرام شروع کیا تھا مگر نتائج غیر تسلی بخش ہیں۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے ملک میں اس بیماری کے پھیلاؤ کا ذمہ دار ناقص منصوبہ بندی، بدانتظامی اور سیاسی عزم کے فقدان کو قرار دیا ہے۔ ایسوسی ایشن کا کہنا تھا کہ ہر سال ملیریا کے کیسز رپورٹ کرنے والے ممالک میں پاکستان دوسرے نمبر پر ہے جہاں ہر سال تقریبا 16 لاکھ کیسز رپورٹ ہوتے ہیں۔ ان میں سے 60 فیصد کی توثیق نہیں ہو پاتی کیونکہ ان کے نمونوں کو معائنے کے لئے لیبارٹریوں میں نہیں بھیجا جاتا۔ پاکستان میں ملیریا کا پھیلاؤ کسی ایک موسم تک محدود نہیں ہے تاہم مون سون کے بعد اگست سے نومبر تک اس کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ بیماری کا بنیادی سبب بننے والی انواع میں Anopheles culicifacies اور A.Stephensi ہیں اور یہ دونوں موجودہ وقت میں زیر استعمال جراثیم کش ادویات سے جنم لے سکتی ہیں۔

Palsmodium Falciparum (ایک یک خلوی جاندار جو طفیلی ہوتا ہے اور ملیریا کا سبب بنتا ہے اور Plasmodium Vivax (vivax، تپے کا بخار) ایسے دو جاندار ہیں جو زیادہ تر ملیریا کا سبب بنتے ہیں۔ زیادہ پھیلاؤ Vivax malaria کا ہے مگر بلوچستان اور سندھ میں اس کی زیادہ خطرناک قسم Falciparum میں اضافے کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے۔

پاکستان میں ملیریا کے پھیلاؤ کے حوالے سے جو عوامل خطرے کی علامتیں ہیں ان میں ملیریا کے پھیلاؤ کے غیر متوقع رجحانات، انتہائی دور دراز علاقوں کے لوگوں میں ملیریا کے خلاف قوت مدافعت کی کمی، غیر موافق سماجی و معاشی حالات، اندرون و بیرون ملک (افغانستان و ایران میں) آبادی کی بڑے پیمانے پر نقل و حرکت، قدرتی آفات بشمول چند علاقوں میں شدید بارشیں، زیادہ دور دراز علاقوں میں صحت کے مراکز میں معیاری طبی سہولیات کا فقدان اور ایجنسیوں اور مغربی سرحد کے ساتھ متصل اضلاع میں اندرن ملک نقل مکین آبادی (آئی ڈی پیز) کا بحران شامل ہیں۔

ٹی بی

پاکستان میں ہر برس تقریباً 430000 افراد تپ دق کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جن میں 15000 بچے ہوتے ہیں۔ ملک میں ہر برس تقریباً 70000 افراد اس بیماری کی وجہ سے اپنی زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پاکستان ان 22 ممالک میں چھٹے نمبر پر ہے جہاں ٹی بی مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے دائرہ کار میں آنے والے مشرقی بحیرہ روم کے علاقے میں ٹی بی کا 43 فیصد پھیلاؤ بھی پاکستان سے ہو رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان ان ممالک کی فہرست میں چوتھے نمبر پر ہے جہاں ایم ڈی آر۔ ٹی بی عام ہے جس کے خلاف مختلف قسم کی ادویات بھی کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ دنیا بھر میں ہر برس 96 لاکھ لوگ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جبکہ 15 لاکھ لوگ اس بیماری کے باعث ہلاک ہوتے ہیں۔ ٹی بی کے باعث ہلاکتیں نچلے اور درمیانی آمدنی کے ممالک میں زیادہ ہوتی ہیں۔

پاکستان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ٹی بی کے مرض کا شکار ہے مگر غربت یا اس بیماری کی سنگینی سے لاعلمی کی بدولت وہ بیماری کی تشخیص نہیں کروا پاتے۔ مزید برآں، سرکاری ہسپتال ٹی بی کے مریضوں کی مدد کے لیے براہ راست نگرانی میں ہونے والے علاج کا مختصر کورس نہیں کرتے۔ علاج نہ کروانے کی وجہ سے، ٹی بی کا ایک مریض دس سے پندرہ لوگوں میں یہ بیماری پھیلا سکتا ہے۔

پاکستان نے اس وقت نیشنل ٹی بی پروگرام شروع کر رکھا ہے جس کا مقصد 2025 تک ملک سے ٹی بی کے مرض میں 50 فیصد کمی لانا ہے۔ نیشنل ٹی بی پروگرام پرائمری ہیلتھ کیئر سسٹم کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور صحت کے ضلعی حکام صوبائی ٹی بی پروگرامز کی مدد سے اس کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں۔

ایچ آئی وی ایڈز

2002 سے 2013ء کے دوران پاکستان میں ایچ آئی وی ایڈز سے اموات کی شرح میں 11 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ دنیا بھر میں یہ شرح 1.5 فیصد کم ہوئی ہے۔ ایڈز کی بیماری اب تک پاکستان میں 6000 لوگوں کی جان لے چکی ہے۔ حکومت نے 21 شفا خانے قائم کیے تھے اور مریضوں کا علاج ان کی دہلیز پر کرنے کے لیے دور افتادہ علاقوں میں کمیونٹی مراکز، گھروں میں طبی نگہداشت کے مراکز اور امدادی مراکز قائم کیے تھے۔

اقوام متحدہ کے اندازوں کے مطابق، پاکستان میں ایچ آئی وی کے مریضوں کی تعداد 92000 سے 12,5000 کے درمیان ہے جن میں سے 50,000 لوگ صرف پنجاب سے ہیں۔ سندھ ایڈز کنٹرول پروگرام کے مطابق، ایچ آئی وی/ایڈز کے 45,000 مریضوں کا تعلق سندھ سے ہے۔ اس حوالے سے جو لوگ زیادہ خطرناک صورتحال میں ہیں ان میں دور دراز سفر پر جانے والے ٹرک ڈرائیورز، جسم فروشی کرنے والی خواتین، جسم فروشی کرنے والے خواجہ سراء، مردوں کے ساتھ ہم بستری کرنے والے مرد (ایم ایس ایمز) نشے کے ٹیکے لگوانے والے نشئی، قیدی، ایڈز والے والدین کے ہاں جنم لینے والے بچے، بے گھر بچے اور علاج معالجے کے غیر محفوظ طرائق کا رکا نشانہ بننے والے افراد شامل ہیں۔

2005ء سے 2014ء کے دوران، ملک میں ایچ آئی وی/ایڈز کے نئے مریضوں میں سالانہ 16 فیصد اضافہ ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ہر 100,000 میں سے اوسطاً ایک سے بھی کم کیس ایڈز کا ہوتا تھا مگر اب ہر 100,000 میں 6.7 کیسز ایڈز کے ہوتے ہیں۔ اگر باقاعدہ تشخیص کی جائے تو ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں لاکھوں لوگ ایڈز کے مریض نکلیں۔

کئی عوامل اس مرض کا سبب بن سکتے ہیں مثلاً غیر محفوظ ہم بستری، غیر محفوظ طبی آلات کا استعمال، استعمال شدہ سرنجوں اور سوئیوں کا استعمال، جراثیم والی سرنجوں اور سوئیوں کا مشترکہ استعمال، عطائیت، کمیونٹی سطح پر دانتوں کے کلینک، گلیوں میں بیٹھے حمام، جسم فروشی، مردوں کا مردوں کے ساتھ ہم بستری کرنا، مزدوروں کی نقل مکانی، منشیات استعمال کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور کنڈوم کا کم استعمال وغیرہ ایسی وجوہات ہیں جو پاکستان میں ایچ آئی وی کے تیز پھیلاؤ کا باعث بن سکتی ہیں۔ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں نے لوگوں میں اس بیماری کے متعلق شعور اجاگر کرنے کے لیے آ گہی مہمیں چلائی تھیں۔

سرطان

پاکستان میں ہر برس سرطان کے 300,000 نئے مریض سامنے آتے ہیں جس سے پہلے سے زیرعلاج لاکھوں مریضوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ پاکستان میں ہر برس 100,000 لوگ سرطان سے ہلاک ہوتے ہیں۔ ایشیا میں سرطان کے مریضوں کی سب سے زیادہ تعداد پاکستان میں ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق، پاکستان میں ہر آٹھویں خاتون چھاتی کے سرطان کے مرض میں مبتلا ہے۔ تحقیقی رپورٹس کے مطابق پاکستان میں سرطان کے مریضوں میں سب سے زیادہ پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں کی ہے جس کے بعد بالترتیب چھاتی کا سرطان، معدہ کی نالی کا سرطان، غذائی نالی کا سرطان، جگر کا سرطان، منہ کا سرطان، مثانے کا سرطان، خون کا سرطان، قولون کا سرطان اور معدے کے سرطان کے مریضوں کی تعداد ہے۔

ایکسرے کے ذریعے امراض کی تشخیص کرنے والے ماہرین (Rediologists) کا کہنا ہے کہ چھاتی کے سرطان کی تشخیص تاخیر سے ہوتی اور زیادہ تر نوجوان لڑکیاں اس کا نشانہ بنتی ہیں۔

پاکستان میں چھاتی کے سرطان میں مبتلا تقریباً 50 فیصد خواتین علاج کروائے بغیر ہلاک ہوجاتی ہیں۔ ملک میں ہر سال عورتوں میں سرطان کے 90,000 کیسز رپورٹ ہوتے ہیں جن میں 40,000 اس بیماری کا نشانہ بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔

کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز پاکستان نے پاکستان میں سرطان کے علاج کے لیے، سہولیات کے فقدان کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ ملک میں ہر برس 300,000 مریضوں کو سرطان کے علاج کی ضرورت ہوتی ہے تاہم ان میں سے صرف 10 فیصد کو یہ سہولت میسر ہوتی ہے۔ دیگر درد کی حالت میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ سرطان کے درد سے آرام پہنچانے والی ادویات، سرطان کے مریضوں کے لیے ہنگامی طبی سہولتیں اور ہڈی کے گودے کی پیوندکاری کے انتظامات بہت محدود ہیں جس کے نتیجے میں مریضوں کی اکثریت باقاعدہ علاج معالجے یا دیکھ بھال سے محروم رہ جاتی ہے۔ آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ صحت کے کسی بھی مرکز میں ہڈی کے گودے کی پیوندکاری کی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ عالمی سطح پر مسلمہ اصول کے مطابق ملک میں 50 لاکھ افراد کے لیے سرطان کا ہسپتال ضروری ہے۔ پاکستان میں تقریباً 20 کروڑ لوگوں کے لیے سرطان کے صرف دو باقاعدہ ہسپتال ہیں۔ ایک لاہور میں جبکہ دوسرا پشاور میں ہے۔ بعض سرکاری ہسپتالوں میں کچھ سہولیات ہیں تاہم وہ ناکافی ہیں۔

پاکستان میں سرطان کے مریضوں کی بہت بڑی تعداد کو شعور کی کمی کے باعث بیماری کے بہت اگلے مرحلے پر اپنی بیماری کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ اگر سرطان کی بروقت تشخیص اور علاج ہو جائے تو سرطان کے حوالے سے تقریباً ایک تہائی بوجھ کم ہو سکتا ہے۔ سرطان کی زیادہ اقسام مثلاً چھاتی، بڑی آنت، منہ کے سرطان اور گردن کے سرطان کی بروقت تشخیص اور علاج ہو جائے تو مریض کی صحت یابی کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی اور صحت کی بنیادی سہولیات

آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چھٹے بڑے ملک پاکستان، جس کی آبادی 1.92 فیصد کی شرح سے بڑھتی ہوئی تقریباً 19 کروڑ، 20 لاکھ افراد تک پہنچ چکی ہے، میں خاندانی منصوبہ بندی ایک متنازعہ معاملہ ہے۔ آبادی بڑھنے کی اس شرح کے ساتھ 2050ء تک ملک کی آبادی 34 کروڑ، 30 لاکھ تک پہنچ جائے گی جس کے نتیجے میں پہلے سے سکڑتے وسائل کی وجہ سے لوگوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔

ملک کی تقریباً 60 فیصد آبادی، جن میں اکثریت دیہاتوں میں مقیم ہے، کے لیے خاندانی منصوبہ بندی اور صحت کی بنیادی سہولیات کے انتظامات موجود ہیں اور اس حوالے سے ملک میں 90,000 سے زائد لیڈی ہیلتھ ورکرز تعینات ہیں۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز کی خدمات کا عورتوں اور خاص طور پر بچوں کی صحت پر نمایاں اثر پڑا ہے۔ اس مقصد کے لیے پیدائش میں صحت مند وقفہ، آئرن کی مقدار میں اضافہ، بیماریوں کے خلاف قوت میں اضافہ اور حاملہ عورتوں کو زچگی سے قبل اور بعد میں طبی سہولیات فراہم کرنے جیسے طریقے اختیار کیے گئے۔

حفاظتی ٹیکوں کا وسیع تر پروگرام (ای پی آئی):

بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت بڑھانے کا وسیع پروگرام (ای پی آئی) ان سات بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتا ہے جن پر ویکسین سے قابو پایا جا سکتا ہے مثلاً ایک برس سے کم عمر بچوں کو بچپن کی تپ دق، پولیو، خناق، کالی کھانسی، نوزائدہ بچوں میں تشنج کی بیماری، خسرہ اور ہیپاٹائٹس بی سے تحفظ کے لیے انہیں ویکسین دی جاتی ہے۔ یونیسف کے تعاون سے پنج گرفتہ (Pentavalent) نامی ویکسین بھی متعارف کروائی گئی ہے۔ 2015-16ء کے دوران 0 سے 11 ماہ کے 70 لاکھ بچوں اور 65 لاکھ حاملہ عورتوں کو سات مہلک بیماریوں اور تشنج کی بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے ویکسین دی گئی۔

شعبہ صحت کا سرکاری ڈھانچہ

پاکستان کا شعبہ صحت بتدریج وسیع ہوا ہے اور ملک بھر میں صحت کی سہولیات، افرادی قوت اور خدمات میں اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری شعبہ صحت میں 1167 ہسپتال، 5695 ڈسپنسریاں، 5464 صحت کے بنیادی یونٹ، 675 دیہی مرکز صحت، 733 زچہ و بچہ مراکز صحت اور سرکاری طبی اداروں کے ساتھ وابستہ طبی ماہرین، ڈاکٹرز، نرسیں، دائیاں اور ادویات ساز شامل ہیں۔ مالیاتی سال 2016ء میں ملک میں 184711 ڈاکٹرز، 16652 دندان ساز اور 118,869 ہسپتال موجود تھے۔ چنانچہ ملک میں 1038 افراد کے لیے ایک ڈاکٹر، 1613 افراد کے لیے ایک ہسپتال کا ایک بستر اور 11513 افراد کے لیے ایک دندان ساز دستیاب ہے اور یہ تناسب انتہائی ناکافی ہے۔

جعلی ادویات

پاکستان میں ادویات کی صنعت اور تجارت بری طرح بے ضابطگی کا شکار ہے اور نگرانی کا نظام ناقص اور ناقابل بھروسہ ہے۔ جعلی، غیر معیاری اور نقلی ادویات منڈی میں دستیاب ہیں جس کے باعث بے شمار مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

پاکستان فارماسسٹ ایسوسی ایشن کے مطابق، پاکستان میں رجسٹرڈ دواخانوں کی تعداد تقریباً 4,000 ہے مگر تقریباً 100,000 غیر قانونی تاجر ادویات کی فروخت کے کام میں ملوث ہیں۔

اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے تمام صوبے کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، پنجاب حکومت نے جعلی ادویات کی فروخت اور تیاری کو ناقابل ضمانت جرم قرار دے دیا ہے اور مجرموں کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیمیں تشکیل دی ہیں۔ ایف آئی اے بھی اس تگ و دو کا حصہ ہے۔

سفارشات

☆ صوبوں کو چاہیے کہ وہ اپنے صحت کے بجٹ میں اضافہ کریں اور بیماری کی روک تھام پر خاص توجہ دیں۔ اس مقصد کے لیے لوگوں کو صحت مند طرز زندگی سے آگاہ کیا جائے اور ان میں شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ حفاظتی تدابیر اپنا کر خود کو بیماری کے حملے سے محفوظ رکھ سکیں۔ پینے کا صاف پانی، آلودگی سے پاک ہوا اور صحت مند خوراک تک ہر

شہری کی رسائی ہونی چاہیے۔ مقامی حکومتوں کے منتخب نمائندوں کو چاہیے کہ وہ صحت کی معیاری سہولیات کی نگرانی کریں اور پولیو ویکسینیشن پر بھی نظر رکھیں تاکہ مطلوبہ مقاصد پورے ہو سکیں۔

☆ بیماریوں کی تشخیص کے لیے لوگوں کے طبی معائنوں کو یقینی بنایا جائے تاکہ ان کا بروقت علاج ہو سکے۔ حکومت کو نئے ہسپتال تعمیر کرنے چاہئیں اور ان میں بستروں کا اضافہ کیا جائے تاکہ مریضوں کی بہت بڑی تعداد کو سنبھالا جا سکے۔ ابتدائی ہیلتھ یونٹ، بنیادی ہیلتھ یونٹ اور ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال (ڈی ایچ کیو) میں بہتری لائی جائے اور انہیں مناسب عملہ اور آلات فراہم کئے جائیں۔ دیہی علاقوں میں صحت کے مراکز میں قابل ڈاکٹروں اور پیرامیڈکس تعینات کئے جائیں اور انہیں خاص سہولتیں فراہم کی جائیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ نیم حکیموں کو بالکل بھی برداشت نہ کرے۔ قابل ڈاکٹروں کو ملازمت کی خاطر بیرون ملک جانے سے روکنے کی پالیسیاں بھی متعارف کروائی جائیں۔

☆ جعلی، غیر معیاری، نقلی اور اسمگل شدہ ادویات کی تیاری اور فروخت کے لیے مناسب طریقہ کار وضع کیا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ منڈی میں ادویات کی دستیابی کو کسی بھی قیمت پر یقینی بنائے۔

معاشی
اور
سماجی حقوق

رہائشی سہولیات

ریاست،جنس،ذات،رنگ اورنسل سے بالاتر ہوکر معیارزندگی بہتر کرکے،عوام کی فلاح و بہبود کویقینی بنائے گی۔۔۔

آئین پاکستان

[آرٹیکل نمبر- 38 (a)]

ہرشخص ایک معقول معیار زندگی کا حق رکھتا ہے۔ جو اس کے خاندان کی صحت اور فلاح اور بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔۔۔جس میں رہائش کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

[آرٹیکل نمبر-25(1)]

موجودہ میثاق کی توثیق کرنے والے تمام رکن ممالک ہر شہری کے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے معقول معیار زندگی......بشمول مناسب خوراک،لباس اور ہاؤسنگ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی حالات زندگی میں مسلسل بہتری لانے کے اس کے حق کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

معاشی،سماجی اور ثقافتی حقوق کا بین الاقوامی میثاق

[آرٹیکل 11 (1)]

2016ء میں رہائشی سہولیات سے متعلق کوئی خاطرخواہ تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی اگرچہ بہت سی انتظامی اور سیاسی تبدیلیاں ضرور وقوع پذیر ہوئیں جن میں رہائشی سہولیات کے حوالے سے مطلوبہ تبدیلیاں لانے کی قوت ضرور موجود تھی۔ 2015ء کے آخر میں بالآخر بلدیاتی الیکشن بھی منعقد ہوگئے جن کا کافی مدت سے انتظار تھا۔ میونسپل اور مقامی حکومتوں کا قیام بھی عمل میں آ گیا اگرچہ بہت ہی محدود معاشی اور انتظامی اختیارات کے ساتھ۔ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی جو کہ 2002 سے عملی طور پر معطل تھی دوبارہ بحال ہوگئی۔ سندھ، بلوچستان اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے اکثر بلدیاتی اختیارات اور انتظامی امور بدستور اپنے پاس رکھے۔ تمام تر سیاسی نعروں کے باوجود غریبوں اور پسماندہ طبقوں کو کوئی حقیقی فائدہ نہ مل سکا۔ رئیل اسٹیٹ کی منڈیوں نے پراپرٹی کے کاروبار کے لیے شہری، نیم شہری اور علاقائی زمینیں ہڑپ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ صدیوں پرانی دیہی بستیوں کی بربادی کی قیمت پر شروع کیے گئے کئی منصوبے مقامی کسانوں، پھلوں کے باغات کے مالکان اور مال مویشیوں پر گزر بسر کرنے والی کمیونٹیوں کے موسمیاتی اعتبار سے پائیدار ذرائع معاش کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

اکتوبر 2016ء کا تیسرا ہفتہ تھا جب اقوام متحدہ کی پائیدار شہری ترقی کانفرنس ایکواڈور کے دارالحکومت کیوٹو میں منعقد ہوئی۔حکومت پاکستان نے بھی اس کا رکن ہونے کے ناطے وزارت موسمی تبدیلی کے ذریعے ملک کو درپیش رہائشی سہولیات کے مسائل کے حوالے سے ایک قومی رپورٹ تیار کی۔ رپورٹ میں بہت اہم معاملات کی نشاندہی کی گئی جو کہ قومی،صوبائی اور مقامی حکومتوں کے جواب اور عمل کی منتظر ہے۔ رپورٹ میں دیگر فریقین کے اہم معاملات کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ان معاملات میں زمین تک رسائی، گھر کے لیے قرضہ، غیر رسمی آبادیوں کو یکجا اور باضابطہ کرنے کا عمل، بڑے شہروں کے شہری علاقوں میں آبادی کے پھیلاؤ پر ریگولیٹری کنٹرول اورشہروں کے گردونواح کی زرعی اراضی کے لیے حفاظتی انتظامات شامل تھے۔تاہم رپورٹ میں زمین پر قبضہ جیسے مسائل،شہروں میں اوران کے اردگرد غیر رسمی آبادیاں پھیلنے کی وجوہات،شہری سہولیات کی معطّلی، بڑے منصوبوں کے حوالے سے وفاقی حکومت کی غلط ترجیحات اور خاص طور پر ہرشہری ذرائع آمدورفت اور صوبائی انتظامیہ کی متوازی مقامی ادارے بنانے کی کوششوں کے حوالے سے بات نہیں کی گئی تھی۔ آبادی کی پرتوں، رہائشی سہولیات، مال مویشی، تجارت اور زراعت کی صورت حال کا احاطہ کرنے والی جامع منصوبہ بندی میں طویل تاخیر بھی ایک ایسا اہم معاملہ تھا جس کا رپورٹ میں ذکر نہیں تھا۔مردم شماری ایک ایسا عمل ہے جو کہ وسائل کی بہتر تقسیم اور منصوبہ بندی، خاص طور پر رہائشی سہولیات اورشہری ترقی کی منصوبہ بندی کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ مارچ 2017ء میں ہونے والی مجوزہ مردم شماری ان مسائل کوحل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرے گی۔ پراپرٹی کے حوالے سے بڑے بڑے سکینڈلز اور شہروں میں مختلف طریقوں سے ہونے والی غیر رسمی آبادکاری بڑے پیمانے پر میڈیا میں رپورٹ ہوتی رہی۔

زمین پر قبضے

سال بھر زمینوں پر قبضوں کے واقعات رپورٹ ہوتے رہے۔بحریہ ٹاؤن کراچی ایک اہم مثال ہے۔کراچی ڈویژن کے دہانے پر یہ پروجیکٹ ڈی ایچ اے کراچی کے بالمقابل ہے۔ اس پروجیکٹ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی سرحدیں ضلع جامشورو سے ملتی ہیں۔اخبار میں چھپنے والی ایک رپورٹ میں اس پروجیکٹ میں پائی جانے والی کئی بے ضابطگیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بحریہ ٹاؤن کراچی کا پراجیکٹ ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی حدود میں واقع ہے۔اس علاقے کی زیادہ تر زمین پہلے زرعی رقبہ تھی جس میں کھجوروں اور پھلوں کے باغات تھے۔راج کے دور سے یہ معینہ مدت کے لیے زرعی ٹھیکے پہ دی جاتی تھی جس کا مقصد زمین

ایک قصبے میں دیہاتیوں کی مزاحمت سے نبٹنے کے لیے پولیس اہلکار تعمیراتی کام کی نگرانی کررہے ہیں

کو قابل استعمال رکھنا ہوتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ریونیو حکام نے یہ عمل جاری رکھا۔ چونکہ یہ زرخیز زمین معیار اور حجم کے حوالے سے کافی زیادہ تھی چنانچہ برساتی پانی سے زرعی پیداوار ہوتی رہی جو کہ کراچی کے لوگوں کو پھل، سبزیاں اور دوسری زرعی مصنوعات مہیا کر رہی تھیں اور اس سے طلب ورسد کا لازم وملزوم تعلق استوار ہوا۔ کراچی کے جامع شہری منصوبے بھی زراعت کے فروغ اور تحفظ پہ زور دیتے ہیں۔ 85-1974ء کے کراچی ڈویلپمنٹ پلان میں بھی زمین کے مستحکم زرعی استعمال کے لیے پانی سے کاشتکاری کے طرائق کار تجویز کیے گئے تھے۔ بدقسمتی سے بدعنوان سرکاری اہلکاروں نے جائیداد کا کاروبار کرنے والے دلالوں سے مل کر زمین ہتھیانے کا دھندا شروع کیا اور اِس مقصد کے لیے زمین کی الاٹمنٹ اور خرید وفروخت کی خاطر اراضی کے نیم تیارشدہ قطعے متعارف کروائے۔ جنہوں نے انکار کیا ان سے متشدد قانونی ہتھکنڈوں سے نمٹا گیا۔ مثال کے طور پر کنڈا گبول خان ایک مقامی کسان، کوئی بار پولیس نے اپنی تحویل میں لیا اور اسے اپنی زمین فروخت کرنے کے لیے مجبور کیا گیا، پراپرٹی ڈیلرز کے حق میں اس کا ذہن بدلنے کے لیے اس کے خلاف دہشت گردی کی دفعہ کے تحت مقدمہ بھی درج کیا گیا۔ متعدد دیہاتیوں کو تھوڑے سے پیسے دے کر یا کچھ بھی نہ دے کر ان کے آبائی گھروں سے بے دخل کردیا گیا۔ بحریہ ٹاؤن کراچی کے گیٹ کمپلیکس تعمیر کرنے اور اسفالٹ کی سڑکیں بنانے کے لیے پھلوں کے درختوں کو بے رحمی سے کاٹا گیا۔ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق بحریہ ٹاؤن کراچی 93 کلومیٹر یا پھر دوسرے لفظوں میں 23,300 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ اس کا حجم سمجھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے کہ کراچی ڈسٹرکٹ سنٹرل کا رقبہ 69 مربع کلومیٹر ہے۔

بحریہ ٹاؤن والے کہتے ہیں کہ انہوں نے باضابطہ طور پر صرف 7631 مربع کلومیٹر زمین حاصل کی تھی۔ ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے مالکان سے قانونی طریقہ کار کے تحت زمین کے حصول کی چھان بین کیے بغیر اس کو بحریہ ٹاؤن میں شامل کر دیا۔ ضابطہ کی ایک اور صریح خلاف ورزی یہ ہے کہ ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے پاس صرف پبلک ہاؤسنگ سکیم کے لیے زمین وقف کرنے کا اختیار ہے یعنی وہ سکیم جس سے مقامی لوگوں کو فائدہ ملے اور ان کی سماجی واقتصادی حالت بہتر ہو۔ بحریہ ٹاؤن کراچی اس طرح کے کسی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس کے علاوہ کئی تاریخی مقامات بے حسی سے تباہ کئے گئے۔ اس پروجیکٹ سے شہر کو پانی کی ترسیل کا نظام بھی متاثر ہوا۔ کراچی واٹر سپلائی بورڈ (کے ڈبلیو ایس بی) کے مطابق 13 انچ قطر کے چار پائپ جو کہ کراچی کو پانی سپلائی کرتے تھے ان کا راستہ مرکزی پائپ سے تبدیل کیا گیا۔ بحریہ ٹاؤن نے اتنے گہرے ٹیوب ویل لگائے کہ پانی ذخیرہ کرنے کے مقامی نالے خشک ہو گئے اور اُن کو پانی کی سپلائی بند ہو گئی۔ وہ غریب لوگ جو ملحقہ آبادیوں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں نے شکوہ کیا کہ پانی بہت حد تک نیچے چلا گیا ہے۔ سندھ ہائیکورٹ نے اس لاپرواہی سے پانی نکالنے سے منع کر دیا۔ کراچی کے گردنواح میں موجود دیہاتوں کو باضابطہ کروانے کے لیے اورنگی ٹاؤن پائلٹ پراجیکٹ (او پی پی) کی پروین رحمان نے وہاں کے دیہاتوں کا ریکارڈ قلمبند کرنا شروع کیا تھا۔ او پی پی نے 1131 دیہاتوں کو قلمبند کیا جن میں سے 817 تو صرف گڈاب کے علاقے میں تھے۔ 518 دیہاتوں کو باضابطہ قرار دے دیا گیا تھا۔ مارچ 2013ء میں پروین کے قتل کے بعد یہ عمل خاصا سست ہو گیا۔

ایچ آر سی پی نے ملک میں سب سے بڑے لینڈ ڈویلپرز کی طرف سے اس طرح زمین کے حصول کے حوالے سے فوری اور مفصل تحقیق کا مطالبہ کیا تھا قانونی مالکوں کو ان کی اراضی سے محروم کرنے کے لیے ریاستی مشینری اور طاقت کے استعمال کی اطلاعات پر بھی تشویش کا اظہار کیا تھا۔

اس قابل مذمت سکینڈل سے عوام پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو جانی چاہیے کہ ریاست کا کردار ایک نگہبان کا ہونا چاہیے جسے اپنے شہریوں کے مفاد کا خیال رکھنا چاہیے۔ شکایات اور ان کی تلافی کے نظام پر بھی نظرثانی کی ضرورت ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ ان غیر قانونی سرگرمیوں کو کیوں نہیں روکا گیا۔

کمیشن نے کہا؛ غریبوں کی رہائش کی ضروریات پورا کرنے کے حوالے سے ریاست کی نااہلی اور کافی حد تک عدم دلچسپی تو پہلے ہی واضح ہے۔ اگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ امراء کی رہائشی سہولیات کی خاطر زمین ہتھیانے کے لیے ریاست کی طاقت استعمال ہو رہی ہے جس کی قیمت مقامی مکینوں کو اپنی بربادی اور بے دخلی کی صورت میں چُکانا پڑ رہی ہے تو یہ ایک بہت بڑا المیہ ہو گا۔

ایک مینجمنٹ ایجنسی کے سرکاری اہلکاروں کی طرف سے غیر قانونی قبضہ کی ایک اور مثال قیوم آباد ہے جس میں ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ یہ اراضی سرکاری قبضے میں لی گئی ہے۔ یہ علاقہ مخصوص خدمت پر مامور لوگوں کی آبادی کا ہے جو 1960ء میں ڈیفنس فیز I اور II ٹو کے دہانے پر نمودار ہوا تھا۔ یہاں کے اکثر مکین مزدور اور گھریلو ملازمین ہیں۔ یہ جگہ 109 ایکڑ پر محیط ہے جہاں ستر ہزار لوگ آباد ہیں۔ اس کا شمار شہر کے سب سے گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔ بہت سا علاقہ بغیر کسی ترتیب کے انتہائی گنجان آباد رہائشی گھروں پر مشتمل ہے جس میں صحت، تعلیم اور تفریح کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب کہ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ 30.32 ایکڑ زمین عام سہولیات کے لیے وقف ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق عام سہولیات کے لیے وقف زمین قانونی طور پر قیوم آباد کی ہی تھی مگر کراچی میونسپل کمیٹی کافی لمبے عرصے تک یہ سہولتیں یہاں مہیا نہ کرسکی۔ لیز کے معاملے پر متعلقہ فریقین کے مابین ہونے والی کشمکش اور ''تصفیے'' (Adjustment) کے بعد بالآخر ڈی ایچ اے کراچی اس علاقے کا قبضہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد قیوم آباد کے مکینوں کی طرف سے ان سہولیات کے دعویٰ کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی نے ایک دیوار کھڑی کردی تاکہ دولت مندوں کی کالونی میں کوئی داخل نہ ہوسکے۔ نتیجتاً، قیوم آباد کے مکین انتہائی تنگ ماحول میں رہنے پر مجبور ہیں۔

زمینوں پر قبضے اور کمزوروں کو ان کے گھروں سے بے دخل کرنے کے واقعات صرف کراچی تک محدود نہیں تھے۔ ایل ڈی اے سٹی لاہور کو ایکٹ برائے حصول زمین کے تحت زمین ہتھیانے جیسے عمل کی بنیاد رکھنے والا منصوبہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس پروجیکٹ کے بھی کئی حصے ہیں جیسا کہ دو ہزار کینال پر مشتمل ڈپلو انکلیو۔ کم و بیش 70 ہزار کنال زمین حاصل کی گئی ہے۔ اس میں پرائیویٹ ہاؤسنگ اسکیمیں، رنگ روڈ، قبرستان اور فوجی املاک ہوں گی اور 5800 ہزار کنال قیمتی زرعی زمین ہے۔ زمین کی حوالگی اور پیسوں کی ادائیگی کے طریقہ کار کے مطابق غریب آدمی کے لیے اس سکیم سے فائدہ کے امکان بہت کم تھے۔ پہلے ہی بروکر اور ایجنٹوں نے زیادہ نفع بخش اسکیموں پر جال بچھا لیے تھے جس سے عام آدمی کے لیے اس پروجیکٹ سے مستفید ہونے کے مواقع بہت کم ہوگئے تھے۔

اورنج لائن میٹرو پروجیکٹ بھی کئی ماہ تک خبروں کی زینت بنا رہا۔ مئی میں لاہور کی مسیحی برادری نے گرجا گھر کی تین کنال زمین پر قبضہ کی کوششوں کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ مسیحیوں نے یہ کہہ کر زمین حوالے کرنے سے انکار کردیا کہ یہ ان کی عبادت کی جگہ ہے اور ان کے لیے بہت مقدس اور اہم ہے؟ اور اسے انتظامیہ کا انتہائی غیر مناسب فعل قرار دیا کہ وہ انہیں ان کے

حقوق سے محروم کر رہی ہے جو اُنہیں بطور پاکستانی حاصل ہیں۔ نقل مکانی، تجارتی سرگرمیوں میں رکاوٹ، اور رہائش گاہوں تک رسائی میں رکاوٹ اورنج لائن میٹرو ٹرین منصوبے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل میں سے قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح، ننکانہ صاحب میں سکھ برادری نے مئی میں متروکہ املاک بورڈ کے ریکارڈ جل جانے پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ سکھ برادری کو اُن کے مقدس مقامات کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے لینڈ مافیا حرکت میں آ سکتا ہے۔ سکھ برادری نے وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ پنجاب سے صورتحال کا نوٹس لینے کا مطالبہ بھی کیا۔

گزشتہ دو عشروں تک شہروں کی بنیادی پہچان رہنے والی بدنام زمانہ 'چائنہ کٹنگ' کے رجحان میں کراچی آپریشن 2013 کے بعد سے کمی آئی ہے۔ تاہم نئے وزیراعلیٰ سندھ نے کہا ہے کہ چائنہ کٹنگ کا مسئلہ ابھی تک موجود ہے۔ سرکاری زمین کو رہائشی مکانات یا پھر دیگر مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کے لیے سرکاری اہلکاروں اور علاقے کے بااثر لوگوں کی ملی بھگت سے چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس عمل کے لیے عام طور پر 'چائنہ کٹنگ' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس عمل کا تعلق کراچی کی ان سیاسی جماعتوں کے کارکنوں سے جوڑا جاتا ہے جن کا شہر کی سیاست پر تسلط ہے۔ کراچی بدامنی کیس میں سپریم کورٹ نے متحدہ قومی موومنٹ، پیپلز پارٹی، اور جماعت اسلامی کے کچھ عناصر کے ملوث ہونے کا عندیہ بھی دیا تھا۔ وزیراعلیٰ نے کہا ہے کہ اس مسئلہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس علاقہ کا ایس ایچ او ذمہ دار ہوگا جہاں زمین پر قبضہ کا واقعہ رونما ہوگا۔ سروے سے معلوم ہوا کہ بہت سے سرکاری پلاٹوں پر، بنیادی سہولیات جیسا کہ سکول، ڈسپنسری اور کھیل کے میدانوں کے لیے وقف تھے رہائشی استعمال کے لیے قبضے کئے گئے تھے۔ ریلوے لائن کے اطراف کی سرکاری زمین، گلشن اقبال میں عزیز بھٹی پارک کے پیچھے زمین اور گزری کے قریب جی اینڈ ٹی کالونی کے پاس کی زمین اس طرح کی چند ایک مثالیں ہیں۔

جعلی رہائشی سکیمیں

جعلی رہائشی سکیمیں اور فراڈ پر مبنی پراپرٹی کا کاروبار کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی چلتا رہا جیسا کہ راولپنڈی میں سال 2016ء کے دوران تین درجن کے قریب جعلی رہائشی سکیمیں اپنا دھندا کرتی رہیں۔ راولپنڈی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے بقول عملہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان جعلی سکیموں کے خلاف کریک ڈاؤن نہ کر سکے۔ راولپنڈی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے

آ گہی مہموں اور قانونی کارروائیوں کے باوجود جعلی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کا سلسلہ جاری رہا

ایک ڈائریکٹر کے اخباری بیان کے مطابق ''ان جعلی سکیموں سے نمٹنے کے لیے کوئی جوڈیشل مجسٹریٹ بھی مقرر نہیں ہے۔ عملدرآمد کرانے والے سیل کا عملہ بھی ناکافی ہے۔ انہیں پولیس کا تعاون بھی حاصل نہیں ہے۔'' جعلی ہاؤسنگ سکیموں کے نام اخبار میں چھپوانے کے علاوہ راولپنڈی ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے لوگوں کو تاکید کی کہیں بھی پلاٹ لینے سے پہلے اس رہائشی سکیم کے متعلق صحیح معلومات ان سے ضرور لیں۔

ملتان الیکٹرک پاور کمپنی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کے خلاف پولیس نے ایک مقدمہ درج کیا جن پر الزام تھا کہ انہوں نے غیر قانونی طور پر ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا نشان استعمال کیا اور لوگوں کے ساتھ مبینہ طور پر دھوکہ دہی کی۔

شکایت کنندہ نے کہا کہ ''ہاؤسنگ سوسائٹی کی انتظامیہ کی طرف سے عوام کے لیے اشتہار چھپوایا گیا جس پر ایم ڈی اے کا لوگو لگا ہوا تھا جس سے تاثر یہ ملتا تھا کہ ایم ڈی نے فیز تھری کی منظوری دی ہے۔ ایف آئی آر کے مطابق فیز تھری ایک غیر قانونی سکیم ہے۔ یہ ہاؤسنگ سوسائٹی ایم ڈی اے کا لوگو استعمال کر کے لوگوں کے ساتھ فراڈ کر رہی ہے۔''

کیس درج کرانے کے بعد ایم ڈی اے نے یہ فیصلہ کیا کہ فیز تھری سکیم کو جعلی سکیموں کی فہرست میں شامل کیا جائے اور عوام کو خبردار کرنے کی مہم چلائی جائے۔

بیدخلی/انخلاء

2016ء کے دوران بہت سے شہری اور نیم شہری علاقوں سے بیدخلی جاری رہی۔

اس ضمن میں بحریہ ٹاؤن کراچی اور قیوم آباد کے شواہد پہلے ہی پیش کیے جا چکے ہیں۔ گجر نالہ کے حوالے سے تحقیقی مطالعہ بھی ایک اور واضح مثال ہے۔ تیرہ کلومیٹر تک پھیلا پانی کی نکاسی کا یہ قدرتی نالہ شہر کے بیچ سے گزرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نالے کے کنارے بہت سی غیر رسمی بستیاں آباد ہوتی رہیں جو اپنے حجم اور پھیلاؤ کے حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ان مکینوں میں سے اکثر دیہاڑی دار مزدور ہیں اور غیر رسمی صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ انسداد تجاوزات مہم کا نتیجہ ہمیشہ مکینوں کے ایک گروہ کو بیدخل کر کے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور مقامی سیاسی کارکنوں کے اثر ورسوخ سے دوسرے گروہ کو وہاں آباد کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ انسداد تجاوزات کی ایک بڑی مہم جو 2015ء میں شروع ہوئی اور 2016ء کے دوران بھی نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ جاری رہی، کا مقصد مون سون کی بارشوں کی آمد سے پہلے اس مسئلے سے نبٹنے کی پیشگی تیاری کرنا تھا۔ یہ مہم بہت ہی ناقص اور غیر معیاری طریقے سے سرانجام دی گئی۔ جس سے بہت سے لوگوں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور بہت سے زخمی ہوئے۔ مثال کے طور پر جولائی 2016ء کو کراچی میونسپل کارپوریشن (کے ایم سی) نے بھاری مشینری کے ساتھ نالہ صفائی کی مہم کا آغاز کیا۔ ناقص منصوبہ بندی اور غیر منظم طریقہ کار کی بدولت نالے کے کمزور کنارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے۔ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے والے گھروں میں سے ایک گھر ایک پینٹر کا بھی تھا۔ وہ صبح سویرے اپنے کام پر جا رہا تھا تو اس نے کے ایم سی کو اپنے گھر کی کمزور بنیادوں سے آگاہ کیا۔ کے ایم سی کے عملے نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اس حوالے سے پورا خیال رکھیں گے۔ تاہم جب کام شروع ہوا تھا تو کھدائی مشین سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ سے اس کے گھر کا ایک حصہ گر گیا۔ اور ساتھ ہی ایک عورت اور اس کی تین سالہ بیٹی ڈوب گئیں۔ اس نالے کی اصل اوسط چوڑائی 210 فٹ ہوا کرتی تھی۔ کراچی میونسپل کارپوریشن اسے اب 60 فٹ تک کرنا چاہتی ہے۔ بہت سے مکانات جو کہ لیز پر دیئے گئے تھے۔ ان پر غیر قانونی ہونے کا الزام لگایا گیا اور ان کی لیز منسوخ کر دی گئی۔ اگر نالہ کے گرد بے دخلی مہم کے مقاصد حاصل کر لیے جاتے ہیں تو کم وبیش تیس ہزار مکانات اور دو لاکھ چالیس ہزار لوگوں کی آبادی بے دخل ہوگی۔

تجاوزات اور زمینوں پر قبضے کا دھندہ ملک کے اکثر حصوں میں جاری رہا اور ساتھ ہی ساتھ غریبوں کی رہائشی جھونپڑیوں اور کچی آبادیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) نے سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس میں سی ڈی اے کی زمین پر موجود کچی آبادیوں کو گرانے کی اجازت مانگی گئی جو کہ غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی تھیں۔ اگست میں عدالت عالیہ نے کسی بھی گھر جو پہلے سے کچی آبادی میں موجود تھا کو گرانے سے منع

کر دیا۔ کچی آبادیوں کا اضافہ زیادہ تر مسلم کالونی، بری امام، ڈھوک تحیلی، محلّہ ڈوری باغ، جی ایٹ مرکز، جی سیون، ایف سیون، ایف ایٹ، جی سکس ون۔فور، جی سیون/تھری۔ٹو H-9, i-9, H-10 ,12-1 مرکز عیسیٰ نگر، مسکین کالونی اور ماڈل گاؤں سید پور میں دیکھا گیا۔

عمارتوں کی تعمیر کے ضوابط کی صریح خلاف ورزی بھی دیکھنے کو ملی۔عدالت کے احکامات کے محض تین ماہ بعد کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کیخلاف کریک ڈاؤن صرف چھوٹے ملزمان تک محدود ہوکر رہ گیا البتہ متعدد بااثر لوگ قانون شکنی کا کھلے عام مظاہرہ کرتے رہے۔ بلڈنگ کنٹرول سیکشن (بی سی ایس) نے دسمبر تک 736 عمارتوں کو سیل کیا۔جبکہ دارالحکومت میں اب بھی 591 ایسی عمارتیں موجود تھیں جنہوں نے قانون کی خلاف ورزی کی تھی۔

گھر کے لیے قرضہ

شعبہ ہاؤسنگ فنانس میں مالی سال کی پہلی سہ ماہی کے دوران 0.23 فیصد کا معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔سٹیٹ بنک آف پاکستان کے مطابق شعبہ ہاؤسنگ فنانس میں سالہ بہ سال 13.48 فیصد کا قابل قدر اضافہ دیکھنے میں آیا۔

30 ستمبر 2016ء تک تمام بنکوں اور ترقیاتی مالیاتی اداروں کے کے کل واجب الادا قرض کی رقم 65.85 ارب روپے تھی جو کہ گزشتہ سہ ماہی کے مقابلے میں 0.15 ارب روپے کے ساتھ 0.23 فیصد اضافہ ہے۔

ہاؤس بلڈنگ فنانس کمپنی لمیٹڈ (ایچ بی ایف سی ایل) 22 فیصد مجموعی قرض کے ساتھ سب سے بڑی شیئر ہولڈر رہی۔تاہم اسلامی بینک 39 فیصد کے ساتھ نمایاں ہیں۔سہ ماہی میں نئے قرضوں کی ترسیل 4.12 ارب روپے رہی جو کہ 851 قرضداروں کو ملے۔قرضوں کی نادہندگی میں کمی دیکھنے میں آئی جو کہ پچھلے سال کے 12.75 ارب روپے کے مقابلے میں 11.28 ارب تک رہی۔جو کہ 11.53 فیصد کی سہ ماہی کمی ہے۔

ہاؤس بلڈنگ فنانس کمپنی لمیٹڈ نے ہاؤسنگ فنانس کی منڈی میں سب سے بڑا ادارہ ہونے کی حیثیت سے 42 فیصد نئے قرض داروں کو قرض دیا اور 14.50 نئے قرضوں کی ترسیل کی جو کہ تقریباً 59 کروڑ، 70 لاکھ روپے تھے۔اسلامی بنکوں نے 1.83 ارب روپے کے قرضوں کی ترسیل کی۔

مجموعی قرض میں سے 66.6 فیصد قرضہ گھر خریدنے کے لیے، 23.30 فیصد تعمیر اور 10.54 فیصد تزئین و آرائش کے لیے استعمال ہوا۔

کچی آبادیوں کی بے دخلی سے پاکستان میں رہائشی سہولیات کا بحران ہی بے نقاب ہوا

اسلامی اور نجی بنک گھروں کی تعمیر کے لیے قرض کے حوالے سے پیش پیش رہے۔ اور پاکستان میں لوگوں کو گھر کے لیے قرض دینے کے حوالے سے بہتر ماحول پیدا کیا۔

رہائشی سہولیات کی فراہمی سے منسلک 40 صنعتوں میں مثبت تبدیلیوں کے نتیجے میں معاشی ترقی میں بھی بہت زیادہ مدد ملے گی۔ گھر بنانے کے لیے قرضے کا رجحان پاکستان میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ سہ ماہی کے آخر میں، نجی بنکوں، اسلامی بنکوں اور ایچ بی ایف سی ایل کا واجب الادا مجموعی قرض میں حصہ بالترتیب 31، 39 اور 22 فیصد تھا۔

اسلامی بنکنگ انڈسٹری کے کل واجب الادا قرضہ میں اسلامک شعبہ اسلامی بینکاری (آئی بی ڈیز) کا 15 فیصد اور اسلامی بنکوں کا 85 فیصد حصہ رہا۔ پچھلی سہ ماہی کے مقابلے میں روایتی بینکاری کا حصہ کم ہوا اور اسلامی بینکاری میں اضافہ ہوا جو کہ بالترتیب 54 اور 46 فیصد تھا۔

رسمی بینکنگ کے مطابق ہاؤسنگ فنانس گزشتہ سال کی نسبت تھوڑا بہتر ہوا۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے مطابق پچھلے سال جو کہ 31 مارچ کو ختم ہوا میں 67,625 نئے قرض خواہوں کو گھر کے لیے قرضہ دیا گیا۔ جو کہ بہت ہی کم تعداد ہے۔ اگر سٹیٹ بنک آف پاکستان کے اپنے اعداد و شمار بھی مان لئے جائیں تو اس کے مطابق ملکی سطح پر ایک کروڑ (10 ملین) لوگوں کو گھر کی ضرورت ہے۔ مرکزی بینک نے ہاؤسنگ سیکٹر کی امداد کے لیے گھر کے لئے قرضہ کے حصول کے طریقہ کار اور اس حوالے سے عوام میں سمجھ بوجھ کے لیے سیمینار منعقد کرائے۔ ان کوششوں کے باوجود جی ڈی پی تناسب پر رہن کی قیمت ایک فیصد سے بھی کم رہی۔ ماہرین کے

مطابق عوام کے لیے رہائش کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کم از کم تین سو ارب روپے کی ضرورت ہے۔ اور پچھلے انبار کو صاف کرنے کے لیے ہر برس اضافی 250 ارب روپے اضافی چاہیے ہوں گے۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن نے عموماً ان منصوبوں کے لیے قرضے دیے جو کہ ان بلڈرز اور ڈویلپرز نے شروع کئے جو ایسوسی ایشن آف بلڈرز اینڈ ڈویلپرز کے ممبر تھے اور تجارتی بنکوں نے بھی عموماً ان بڑے منصوبوں کے لیے قرضے دیئے ہے جو کہ ان بلڈرز اور ڈویلپرز نے شروع کئے جو ایسوسی ایشن آف بلڈرز اینڈ ڈویلپرز (اے بی اے ڈی) کے ممبر تھے اور کمرشل بنکوں نے عموماً ان بڑے لوگوں کو قرضے دیئے جن کو اپنے بنگلوں میں اضافے یا پھر تزئین و آرائش کے لیے پیسے چاہیے تھے۔

جون میں سٹیٹ بنک آف پاکستان نے مورٹگیج ریفنانس کمپنی (پی ایم آر سی) قائم کی جس کا کام گھروں کے لیے قرضہ دینے والے اداروں اور تجارتی بنکوں کی معاونت کرنا تھا، خاص طور پر ان اداروں کو جو تھوڑی آمدنی والے لوگوں کو قرض دیتے ہیں۔

ہاؤسنگ میں سرمایہ کاری کے محرکات

پچھلے کئی سالوں سے شعبہ ہاؤسنگ میں خاصی سرمایہ کاری ہو رہی ہے، پراپرٹی کے کاروبار اور شہری علاقوں کی خام اراضی پر بہت سے بڑے اور درمیانی سطح کے سرمایہ کاروں نے سرمایہ کاری کر کے ٹھیک ٹھاک منافع کمایا۔ ایک خبر کے مطابق ہاؤسنگ سے متعلق پراپرٹی کے کاروبار کا حجم 70 کھرب (7 ٹریلین) تھا۔ تاہم اگر کاروبار کے مجموعی حجم سے موازنہ کیا جائے تو نئی نئی ملازمتیں پیدا کرنے اور بلاواسطہ ٹیکس میں اس کا حصہ بہت کم رہا۔ وفاقی حکومت نے 2016 میں کئی اہم فیصلے کیے۔ فنانس بل 2016ء میں سالہا سال سے رائج مختلف جائیدادوں کی قیمت کے تعین کے نظام کو بدلنے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ جائیداد کی قیمت کا منڈی کے مطابق صحیح تعین ہو سکے۔ پہلے اس طرح کی جائیداد کی قیمت کے تعین کے لیے ڈپٹی کمشنر فہرست کو معیار سمجھا جاتا تھا۔ ہر ضلع کا ڈپٹی کمشنر مارکیٹ کا نرخ مقرر کرنے کے لیے ایک فہرست جاری کرتا تھا۔ یہ نرخ بہت کم ہوتا تھا اور اس میں سرمایہ کاروں کے لیے کافی منافع ہوتا تھا، ٹیکس کی شرح بھی بہت کم ہوتی تھی۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) نے متعلقہ فریقین کے ساتھ مشاورت کر کے یہ فہرست دوبارہ بنائی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس اقدام سے حکومت کی آمدنی میں 70 ارب روپے کا اضافہ ہوگا۔ اس اقدام سے اس شعبہ میں کالے دھن کی سرمایہ کاری کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔ اگر منصوبہ سازوں نے اس سمت چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس سے شہروں میں بسنے والے غریب لوگوں کی رہائش کے لیے اراضی کی دستیابی کی امید بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

آگ اور حادثات

ملک میں گھروں سے متعلق بہت سے ناخوشگوار واقعات بھی دیکھنے کو ملے۔ کراچی میں تین مارچ کو گلشن اقبال کے 19 نمبر بلاک میں ایک غیر رسمی آبادی میں آگ لگ گئی اگرچہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا مگر اردگرد کی بہت سی جھونپڑیاں جل گئیں۔ 21 ستمبر کو فیصل آباد میں عثمان ٹاؤن میں ایک گیس سلنڈر پھٹنے سے ایک خاتون زخمی ہوگئی۔ اس سلنڈر کے پھٹنے سے اور کئی سارے سلنڈر پھٹے جس سے علاقہ مکینوں اور دکانداروں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ ملک کے تقریباً تمام شہروں کے نچلے اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کے قرب وجوار میں بہت سے خطرناک کاروبار بغیر کسی رکاوٹ کے چلتے رہے۔ جن میں سے ایک کاروبار کھلی گیس کے ڈپو کا تھا جو کہ حکومت کی سخت پابندی کے باوجود اکثر جگہوں پر دیکھے جاسکتے تھے جہاں بڑے سلنڈروں سے چھوٹے سلنڈروں میں گیس منتقل کی جاتی ہے۔ 24 اکتوبر کو راولپنڈی میں ایک آئل ٹینکر حادثے کا شکار ہوا جس نے رہائشی اپارٹمنٹس سمیت بہت سی عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ آگ بجھانے والے عملے کی کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد آگ بجھائی جاسکی مگر اس وقت تک گھروں اور ان میں موجود کافی چیزوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچ چکا تھا۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ بہت سی جھونپڑیوں میں آگ لگنے، چولہے اور سلنڈروں کے پھٹنے اور کئی دیگر حادثات رپورٹ نہیں ہوئے تھے۔ اگر کسی کم آمدنی والی بستی کا دورہ کیا جائے تو وہاں پر بہت سے ایسے خطرات کا اندازہ ہوتا ہے جن کا تعلق آگ سے ہوتا ہے۔

ہندوؤں کی عبادت کے لئے جگہ

دسمبر میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے ہندو برادری کے لیے اسلام آباد میں مندر، کمیونٹی سنٹر اور شمشان گھاٹ کے لئے جگہ کی منظوری دی۔

اسلام آباد میں کم وبیش آٹھ سو ہندو رہتے ہیں۔ انہیں مندر نہ ہونے کی وجہ سے دیوالی اور دوسری مذہبی رسومات گھر میں منانا پڑتی تھیں۔ وفاقی حکومت دارالحکومت میں ان کے لیے کوئی شمشان گھاٹ نہیں تھا لہٰذا انہیں نعشیں جلانے کے لیے راولپنڈی یا اپنے آبائی علاقوں میں جانا پڑتا تھا۔ جڑواں شہروں میں واحد بڑا مندر کرشن مندر ہے جو صدر کے علاقہ کبیر بازار میں واقع ہے۔ راولپنڈی کے کنٹونمنٹ کے رہائشی علاقوں میں چند ایک چھوٹے مندر موجود ہیں۔ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے جو پلاٹ H-9/2 میں انہیں دیا ہے اس کے بالکل پاس پہلے ہی ایک پلاٹ آل پاکستان بدھسٹ سوسائٹی کو دیا جاچکا ہے۔

قبرستان

میڈیا رپورٹس کے مطابق کراچی میونسپل کارپوریشن، کراچی کے 237 میں سے 224 قبرستانوں پر اپنا کنٹرول کھو چکی ہے جہاں پر اب خودساختہ منتظمین، تجاوزات کرنے والے گروہ اور لینڈ مافیا کے لوگ قابض ہیں جس کے سبب شہری انتظامیہ نے شہر کے قبرستانوں پر مزید تدفین پر پابندی عائد کرنے اور تین مرکزی شاہراہوں کے پاس چھ نئے قبرستان بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ ایک سرکاری اہلکار کے مطابق کراچی کے قبرستانوں پر مافیا کا بڑھتا ہوا کنٹرول نہ صرف شہریوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے بلکہ اس سے تجاوزات اور چائنہ کٹنگ (سرکاری اراضی پر قبضہ کر کے اُس کے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنا کر عام لوگوں کو فروخت کرنے کا عمل) جیسے دھندے کو بڑھاوا ملا ہے۔

بلدیات کے وزیر نے تازہ اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے کراچی کے مضافات میں نئے قبرستان بنانے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی شہر کے اندر تدفین پر پابندی کا عندیہ بھی دیا ہے۔

قبرستانوں کا انتظام و انصرام

قبرستانوں کو باضابطہ بنانے اور غیر قانونی تجاوزات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک خود مختار ادارہ بنانے کی طرف کچھ پیش قدمی کی گئی۔ یہ اتھارٹی لوکل کونسل کی درخواست پر یا خود اپنی طرف سے خاص طرز کے نئے قبرستان بنائے گی۔ قبرستان کی اسکیم تعمیراتی، انتظامی اور باغبانی کے منصوبے کو مدنظر رکھ کر تشکیل دی جائے گی۔ یہ ادارہ تمام مذہبی فرقوں کے لوگوں کو تدفین کی سہولیات فراہم

قبرستانوں میں جگہ کی کمی کے باعث تہہ در تہہ قبریں تعمیر کی گئی ہیں

کرے گا۔اس ادارے کا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا شعبہ پورے پنجاب میں ''شہرخموشاں قبرستانوں'' کی ویب سائٹ، ہیلپ لائن اور کوائف کا بندوبست کرے گا۔اسکیم کے نفاذ کا شعبہ انسپکٹرز کا تقرر کرے گا جو کہ قبرستان کی جائیداد کو تجاوزات سے تحفظ فراہم کریں گے اور اس حوالے سے قانون کی باقی شقوں پر بھی عملدرآمد کرائیں گے جن کے تحت قبرستان کی حدود میں کسی غیر قانونی معاشی سرگرمی، تجاوزات یا قبرستان کی املاک کو نقصان پہنچانے کی سزا تین ماہ قید یا ایک لاکھ جرمانہ ہے۔

لاہور میں پہلا ماڈل قبرستان جو کہ 15 کروڑ، 50 لاکھ (155 ملین) کی لاگت سے تیار ہوگا، کا افتتاح 2017ء میں متوقع ہے۔''شہرخموشاں'' کے نام سے یہ قبرستان ملتان سرگودھا اور فیصل آباد میں بھی زیرتعمیر ہیں۔ یہ ادارہ پنجاب کے تمام 36 اضلاع میں اس طرح کے قبرستان بنانے اور شہریوں کو تدفین کی سہولیات دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سفارشات

- ☆ پاکستان ادارہ برائے شماریات کی مدد سے ہر ضلع میں زمین اور مکانات کا تخمینہ لگایا جائے جو کہ رہائشی سہولیات کی صورت حال کے حوالے سے بنیادی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ مکانوں کی قیمت کا گوشوارہ (ایچ پی آئی) اور رہائشی سہولیات تک رسائی کا گوشوارہ (ایچ اے آئی) متعارف کروایا جائے۔
- ☆ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کو ایک موثر اور کارگر ادارہ بنانے کے لیے اس کی تنظیم نو کی جائے۔محروم طبقوں کی مدد کی جائے اور وہ رہائشی منصوبے جو شہر کے غریبوں کے لیے ہیں ان میں چھت کی اوسط جگہ کی گنجائش میں رعایت برتی جائے۔ترقی کے قابل انتقال حقوق کا آغاز کیا جائے۔موجودہ شہری علاقوں میں گنجائش کے معیارات پر نظرثانی کی جائے۔اور پہلے ہی سے شروع کم آمدنی کے منصوبوں کو مزید مؤثر بنانا اور شہری زمین کے مخلوط استعمال کی طرز کے منصوبے کارآمد ہوسکتے ہیں۔
- ☆ مختلف طرز اور حجم کی رہائشی سکیمیں تعمیر کرنے کے لیے تحقیق کی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ملک میں مکانات کی ضرورت کے حوالے سے کونسی سکیم ممکن اور موزوں ہوسکتی ہے۔
- ☆ شہری سہولیات کے اداروں جیسا کہ فائر بریگیڈ اور ریسکیو کے اسکواڈز میں باہمی روابط بہتر ہونے چاہئیں اور عوام عامہ کی عمارتیں کم از کم بعض حفاظتی معیارات کو مدِنظر رکھ کر تعمیر کی جائیں اور ان معیارات کی پاسداری یقینی بنائی جائے۔

معاشی
اور
سماجی حقوق

ماحولیات

تمام انسان، ایسے ماحول کا بنیادی حق رکھتے ہیں، جو ان کی صحت اور فلاح و بہبود کے تمام تقاضوں کو پورا کرے۔
تمام ممالک، ماحول کا تحفظ کریں گے اور قدرتی وسائل کو، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے استعمال کریں گے۔
تمام ممالک، ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں مناسب اور موزوں معیار قائم کریں گے اور ماحولیاتی معیار اور قدرتی وسائل کے استعمال میں آنے والی تبدیلی کو مانیٹر اور متعلقہ اعداد و شمار کو منظر عام پر لائیں گے

ماحولیاتی تحفظ اور پائیدار ترقی کے لیے مجوزہ قانونی اصول
[آرٹیکل 1-2اور 4]

2016ء کے دوران وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے ماحول کے تحفظ کے لیے کئی اقدامات کیے، لیکن ماحولیاتی مسائل کی ایک کثیر تعداد پاکستان کے رہائشیوں کے لیے تکلیف کا باعث بنی رہی۔ بہت سے ماہرین کی یہ رائے تھی کہ پاکستان کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ موسمی تبدیلی ہے۔

موسم میں تیزی سے ہونے والی تبدیلیاں ہماری معیشت، آبادیوں، فصلوں کی پیداوار، صاف پانی تک رسائی، ذریعہ معاش اور کمزور برادریوں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ جرمن واچ کے عالمی موسمی خطرات کے گوشوارے 2017ء کے مطابق پاکستان دنیا کے ان ممالک میں ساتویں نمبر پر ہے جنہیں موسمی تبدیلی کے خطرے کا سب سے زیادہ سامنا ہے۔ عالمی بینک کی ایک 2015ء کی تحقیق کے مطابق، ماحولیاتی مسائل کی وجہ سے پاکستان ہر سال اپنے نو فیصد جی ڈی پی سے محروم ہو رہا ہے۔

پاکستان نے نومبر میں موسمی تبدیلی سے متعلق پیرس معاہدے کی توثیق کی۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک عالمی درجہ حرارت کو دو ڈگری سے نیچے رکھنے کے پابند ہیں۔ تاہم، ہم ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، کیا ہم اپنی پالیسیوں میں تبدیلی اور ضروری اقدامات کرنے کے قابل ہو سکیں گے؟

پاکستان کے لوگوں کو اب بھی بنیادی حقوق اور ضروریات زندگی جیسے کہ پینے کے

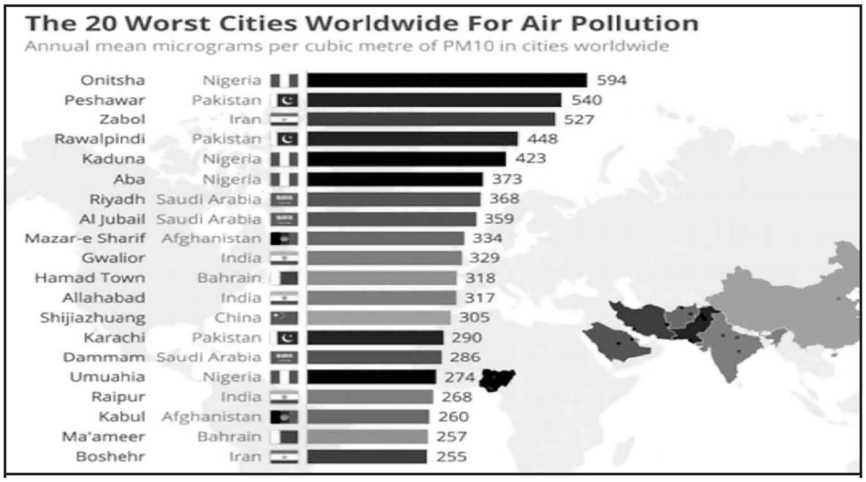

ذریعہ: ڈبلیو ایچ او، https://www.statista.com/chart/4887/the-20-worst-cities-worldwide-for-air-pollution/

صاف پانی، صاف ہوا اور حفظان صحت کے مناسب انتظامات تک رسائی میں مشکلات کا سامنا ہے۔ ستمبر میں سینیٹ کے ایک اجلاس میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ 80 فیصد پاکستانی آلودہ یا غیر صحت بخش پانی پی رہے ہیں۔ واٹر ایڈ کی ایک رپورٹ نے پاکستان کو ان دس ممالک میں شامل کیا ہے جہاں شہر میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کو حفظان صحت کے مناسب انتظامات تک رسائی نہیں ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی 2016ء کی ایک رپورٹ کے مطابق، پشاور اور راولپنڈی کا دنیا کے ان شہروں میں بالترتیب دوسرا اور چوتھا نمبر ہے جہاں فضائی آلودگی سب سے زیادہ ہے۔

موسمی تبدیلی

اگرچہ موسمی تبدیلی دنیا کی تمام اقوام پر اثر انداز ہوتی رہی تاہم ترقی پذیر ممالک میں رہنے والے لوگوں، خاص طور پر کمزور برادریوں کو اس کے خوفناک ترین اثرات کا سامنا کرنا پڑا۔ 2016ء تاریخ کا گرم ترین سال رہا اور سائنسی تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ آئندہ سالوں میں ہمیں اس سے بھی زیادہ درجہ حرارت کی توقع رکھنی چاہئے۔ اقوام متحدہ نے اس مسئلے کو اتنا اہم سمجھا کہ اس نے مستحکم ترقیاتی اہداف (ایس ڈی جیز) میں جو 169 اہداف مقرر کیے ان میں سے 45 کا تعلق ماحولیات سے تھا۔

ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دوسرے ممالک کی نسبت پاکستان کو اس تیزی سے بڑھتے ہوئے مسئلے کو زیادہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ جرمن واچ کی ایک حالیہ تحقیق

ذریعہ: ڈبلیو ایچ او، https://thenaturenews.com/2015/09/thar-deseert-climate-change-poses-threats-to-agriculture-and-livestock/

ظاہر کرتی ہے کہ پاکستان کا ان ممالک میں ساتواں نمبر ہے جنہیں موسمی تبدیلی کے اثرات کا سب سے زیادہ سامنا ہے۔ تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موسم کے بدلتے انداز ملک میں کاشت اور کٹائی کے سلسلے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

موسمی تبدیلی نے ترقی کے دیگر پہلوؤں کو بھی متاثر کیا۔ یو این ڈی پی کی ایم ڈی جیز رپورٹ 2013ء کے مطابق، پاکستان کی جانب سے اہداف پر مناسب توجہ نہ دیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قدرتی آفات پر قابو پانے کے لیے ابھی تک فنڈ مختص نہیں کیے جا سکے تھے۔ عالمی بینک کی 2015ء کی ایک تحقیق میں انکشاف ہوا کہ ماحولیاتی مسائل کے باعث پاکستان ہر سال اپنے تقریباً 9 فیصد جی ڈی پی سے محروم ہو رہا ہے۔

پہلا انتباہ 2010ء کے تباہ کن سیلاب کی شکل میں آیا جس نے لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا۔ سندھ کے علاقے تھرپارکر میں طویل خشک سالی اور ملک کے مختلف حصوں میں گرمی کی خلاف معمول لہریں موسمی تبدیلی کی دیگر علامات تھیں۔

سائنسی برادری میں اس بات پر وسیع اتفاق پایا جاتا ہے کہ انسانی سرگرمی، خاص طور پر کوئلے اور تیل کو جلانا، گلوبل وارمنگ میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے۔ مرکری کی مقدار میں بے مثال اضافہ ہو رہا ہے جو پوری دنیا کے لیے تباہی کا باعث بن رہا ہے۔ عالمی درجہ حرارت میں محض چند ڈگری کا اضافہ تباہ کن موسمی سانحات جیسے کہ سیلاب، خشک سالی، جنگلات میں لگنے والی آگ،

لینڈ سلائیڈنگ، گلیشیروں کے پگھلنے اور سطح سمندر میں اضافے کا باعث بنے گا۔

حکومت نے موسمی تبدیلی پر قابو پانے کے لیے کئی قابل تعریف اقدامات کیے ہیں، اگرچہ اب بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان جنوبی ایشیا کا وہ پہلا ملک تھا جس نے موسمی تبدیلی کی وزرات قائم کی۔ دسمبر میں، قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے موسمی تبدیلی نے پاکستان کلائمیٹ چینج بل 2016ء کی منظوری دی۔ اس کا مقصد پاکستان کونسل برائے موسمی تبدیلی، پاکستان اتھارٹی برائے موسمی تبدیلی اور موسمی تبدیلی فنڈ کا قیام تھا۔ اگر یہ بل دونوں ایوانوں سے منظور ہوگیا تو پاکستان ان پانچ ممالک میں شامل ہوجائے گا جہاں موسمی تبدیلی سے متعلق ایک مخصوص قانون موجود ہے۔

نومبر میں، پاکستان موسمی تبدیلی سے متعلق پیرس معاہدے پر دستخط کرنے والا دنیا کا 104واں ملک بن گیا۔ اس معاہدے کا مقصد گلوبل وارمنگ کو دو ڈگری سے کم رکھنا ہے۔

آلودگی

زیر جائزہ سال کے دوران پاکستان کے لوگوں کو، سموگ سے لے کر بیماریوں تک، آلودگی کے کئی نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ عالمی ادارہ صحت کی 2016ء کی ایک رپورٹ نے پشاور اور راولپنڈی کو دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں سے ایک قرار دیا۔ رپورٹ کے مطابق نائجیریا کے شہر اونتشا کی فضاء سب سے زیادہ آلودہ ہے جس کے بعد پشاور کا نمبر آتا ہے۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں چوتھے نمبر پر تھا جہاں فضائی آلودگی سب سے زیادہ تھی۔

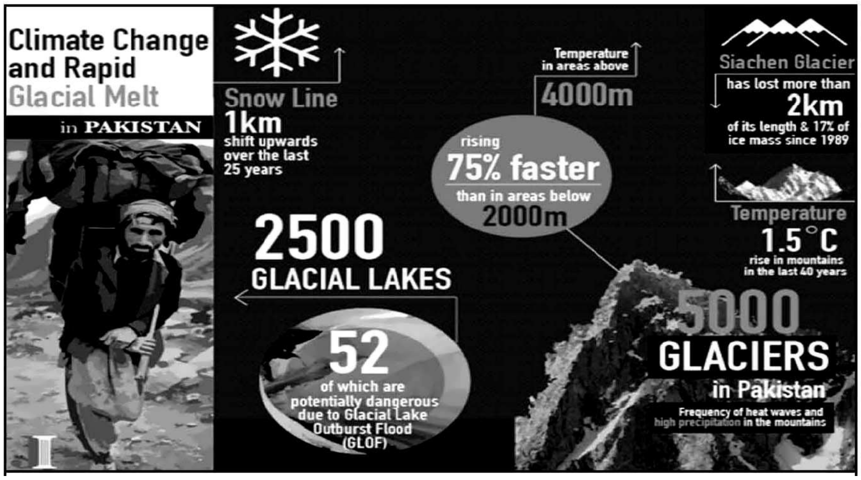

ذریعہ: ڈبلیو ایچ او، https://jinnah-institute.org/climate-change-and-rapid-glacial-melt-in-pakistan/

پاکستان میں آلودگی کی سطح اس قدر بڑھ گئی ہے کہ یہ ملک میں اموات کی ایک بنیادی وجہ بن گئی ہے۔ آلودگی کی وجہ سے ہر سال تقریباً 59,000 افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ فضائی آلودگی پھیپھڑوں کے کینسر، امراض قلب، دمہ، قبل از وقت اموات، مرگی اور سانس کی کئی بیماریوں کا سبب بن سکتی ہے۔

لاہور میں سموگ

اکتوبر کے آخر میں سموگ نے لاہور اور پنجاب کے چند دیگر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اگرچہ ناسا کے مطابق ایسا فصلوں کے جلنے کے باعث ہوا، تاہم اس میں ایک بڑا کردار لاہور میں ہونے والی سرگرمیوں کے باعث پھیلنے والی فضائی آلودگی کا بھی تھا۔

صوبائی حکومت نے اس گھنی سموگ، جو سانس کی کئی بیماریوں کا باعث بن سکتی ہے، پر قابو پانے کے لیے چند اقدامات کیے۔ لوگوں کو سڑکوں پر دھواں دینے والی گاڑیاں لانے سے روکنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور (سی ڈی جی ایل) نے بھی ان فیکٹریوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جو فضاء کو آلودہ کر رہی تھیں۔ ان تمام فیکٹریوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دو ماہ کے اندر دھویں کے اخراج پر قابو پانے والے آلات نصب کریں۔ سی ڈی جی ایل نے ایسی متعدد فیکٹریوں کو بند کر دیا جو توانائی کے حصول کے لیے کوئلے اور دیگر نقصان دہ مواد کو جلا رہی تھیں۔

البتہ، ان میں سے چند اقدامات قلیل المدتی تھے اور ہمیں ابھی یہ دیکھنا تھا کہ آنے والے سالوں میں یہ سموگ پر قابو پانے میں کس قدر موثر ثابت ہوں گے۔ علاوہ ازیں، بہت سے ماہرین کی یہ رائے ہے کہ جب تک ہمارے پاس کیمیائی اجزاء کی موجودہ اقسام اور آلودگی کی سطح سے متعلق اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے لیے وسائل اور ذرائع نہیں ہوں گے اس وقت تک ہم سموگ کے خاتمے کے لیے اقدامات نہیں کر سکتے۔

میڈیا کی ایک رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ سمندری آلودگی پر قابو پانے کے محکمے نے اعتراف کیا ہے کہ کراچی سے روزانہ تقریباً 350 ملین گیلن خام فضلا اور غیر عمل شدہ صنعتی فضلاء سمندر میں بہایا جاتا ہے۔ کراچی کے شہریوں کے جانب سے پیدا کردہ تقریباً 12,000 ٹن کچرا روزانہ سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، حد سے زیادہ ماہی گیری نے ساحل کے آس پاس کی سمندری زندگی پر تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ ماہی گیروں کو سمندر کے کنارے مچھلی پکڑنے میں مشکل پیش آئی اور انہیں اپنے جال پھینکنے کے لیے گہرے سمندر میں جانا پڑا۔ انسٹی

ٹیوٹ آف میرین سائنسز (آئی ایم ایس) کراچی کی ایک تحقیق میں سمندر میں بھاری دھاتوں کی بڑی مقدار میں موجودگی کا انکشاف کیا گیا۔ تحقیق میں اس بات کی نشاندہی کی گئی کہ دھاتی آلودگی میں کئی سالوں سے اضافہ ہو رہا تھا۔

سندھ حکومت کو ملک کے سب سے بڑے شہر کو صاف رکھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کراچی کے شہریوں نے شہر میں کچرے کے لاتعداد انباروں کو ٹھکانے لگانے میں ناکامی پر حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ لاہور، جہاں صفائی کا ٹھیکہ ایک ترک کمپنی کو دیا گیا تھا، کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سندھ حکومت نے چین کی ایک آف شور کمپنی سے رابطہ کیا۔ چینی کمپنی نے کراچی میں صفائی کا کام فروری میں شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔

مارچ میں، سپریم کورٹ نے کہا کہ یہ وفاقی دارالحکومت اور صوبوں کی جانب سے جمع کرائی گئیں ماحولیاتی رپورٹوں سے مطمئن نہیں۔ اعلیٰ عدلیہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اس حوالے سے ہونے والے پیش رفت پر دوبارہ رپورٹ جمع کرائیں۔

پینے کا صاف پانی اور حفظان صحت کے انتظامات

یو این ڈی پی پاکستان کی ہزار سالہ ترقیاتی اہداف رپورٹ 2013ء کے مطابق، پاکستان پانی کے بہتر ذرائع تک رسائی سے متعلق اپنے اشاریے کے حصول کی جانب گامزن تھا۔ تاہم، ستمبر میں سینیٹ کو بتایا گیا کہ پاکستان کے 80 فیصد رہائشی آلودہ یا غیر صحت بخش پانی پی رہے ہیں۔ سینیٹ میں خطاب کے دوران قانون سازوں کے جانب سے کیے گئے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وزیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی نے پاکستان کونسل برائے تحقیق آبی وسائل (پی سی آر ڈبلیو آر) کے نتائج کا ذکر کیا۔

تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ پینے کے پانی میں پائے جانے والے آلودہ مادوں میں بیکٹیریا، زہریلی دھاتیں، معلق اور حل شدہ مادے، اور اس کے علاوہ نائٹریٹ اور فلورائیڈ شامل تھے۔ پینے کے پانی میں بیکٹیریا کی آمیزش 69 فیصد تھی۔ ان آلودہ مادوں کی آمیزش متعدد بیماریوں جیسے کہ پیچش، ہیضہ، ٹائفائیڈ، ہیپاٹائٹس، بلند فشار خون، پیدائشی نقائص، ذیابیطس، اور اس کے ساتھ ساتھ جلد، گردے اور دل کی بیماریوں کا باعث بن سکتی ہے۔

ایک ایسے ملک میں، جہاں زیادہ تر لوگ بوتل کا پانی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، آمیزش کی یہ سطح ایک سنگین مسئلہ ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بوتلوں کا پانی بھی پینے کے محفوظ

پانی کا قابل بھروسا ذریعہ نہیں۔ پی سی آر ڈبلیو آر کی ایک اور تحقیق میں پینے کے پانی کے ایسے 100 برانڈز کی نشاندہی کی گئی جو پینے کے لیے محفوظ نہیں تھے۔

واٹرایڈ کی رپورٹ 'دنیا بھر میں لیٹرینوں کی صورت حال: ابلتے شہر' نے پاکستان کو دنیا کے ان 10 ممالک میں شامل کیا ہے جہاں کے رہائشی مناسب بیت الخلاء تک رسائی سے محروم ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ شہری رہائشی حفظان صحت کے مناسب انتظامات کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں۔ تاہم، 1990ء سے لے کر اب تک پاکستان میں حفظان صحت کے مناسب انتظامات سے محروم افراد کی تعداد نصف رہ گئی ہے۔

ایم ڈی جی اور اشارے	قومی قدر (2013) کا ہدف	صورتحال
ہدف نمبر 7: ماحولیاتی استحکام کو یقینی بنانا		
جنگلاتی رقبہ (فیصد)	5.2/6	ہدف سے پیچھے
جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے تحفظ شدہ رقبہ (فیصد)	11.6/12	ہدف کی جانب گامزن
فی ٹن تیل (81-1980 میں روپے) کے مساوی جی ڈی پی (توانائی کی استعداد)	26543/28000	ہدف کی جانب گامزن
	0.6/0.5-0.25	ہدف کی جانب گامزن
ہائی سپیڈ ڈیزل میں گندھک کی مقدار	89/93	ہدف کی جانب گامزن
پانی کے بہتر ذرائع تک رسائی رکھنے والی آبادی کا تناسب	72/90	ہدف سے پیچھے
صحت وصفائی تک رسائی رکھنے والی آبادی کا تناسب	na/95	ہدف سے پیچھے
باضابطہ بنائی گئیں کچی آبادیوں کا تناسب		
ذرائع: یو این ڈی پی پاکستان ایم ڈی جی ایس رپورٹ 2013		

جنگلی حیات

چونکہ پاکستانی عوام کو دیگر کئی مسائل کا سامنا ہے اس لیے وہ ملک میں رہنے والی دوسری مخلوقات کی حالت زار پر اکثر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ڈبلیو ڈبلیو ایف اور زولاجیکل سوسائٹی آف لندن کی ایک مشترکہ دو سالہ رپورٹ 'لونگ پلینٹ' میں انکشاف کیا گیا کہ انسان 1970ء سے لے کر اب تک 60 فیصد جانوروں کا صفایا کر چکے ہیں۔ پاکستان میں مسکن کی تباہی، غیر قانونی سرگرمیاں اور موسمی تبدیلی بہت سے جانوروں کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔

ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان کی ایک حالیہ رپورٹ میں پاکستان میں جنگلی حیات کی غیر قانونی تجارت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، ناقص انتظام وانصرام اور قانون کے کمزور نفاذ کے باعث ملک میں جنگلی جانوروں کی سمگلنگ بلا روک ٹوک جاری رہی۔ اس کے

علاوہ ملک میں شکاریوں اور ڈیلروں کے نیٹ ورک بھی قائم ہیں۔

ماہرین ماحولیات نے کئی مرتبہ تلور کے شکار کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ تلور نقل مکانی کرنے والے نایاب پرندے ہیں جنہیں بین الاقوامی یونین برائے قدرتی تحفظ نے خطرے کا شکار انواع کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ تاہم، کچھ عرب اور مشرق وسطیٰ کے رہائشیوں کو اب بھی لائسنس جاری کیے جا رہے تھے۔ دسمبر میں خیبر پختونخوا حکومت نے صوبے میں تلور کے شکار پر مکمل پابندی کا اعلان کیا۔

مارچ میں، وزیر اعظم کے منظور کردہ سرسبز پاکستان پروگرام کے تحت زولاجیکل سروے آف پاکستان کو پاکستان بھر میں خطرے کا شکار جنگلی حیات کی فہرست تیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ پروگرام ملک میں جنگلی حیات اور جنگلات کے محکموں کو بہتر بنانے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔

قدرتی ایندھن

اگرچہ بہت سے اسکینڈی نیویائی ممالک قدرتی ایندھن سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں، تاہم پاکستان نے اب بھی اپنی توانائی کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے قدرتی ایندھن پر انحصار کیا۔ چونکہ زیادہ تر پاکستانی شہری علاقوں میں رہتے ہیں، اس لیے وہ بڑی مقدار میں کاربن خارج کر رہے تھے۔

پاکستانی شہریوں، خاص طور پر دیہی علاقوں میں رہنے والوں کو ناکافی توانائی کے باعث 12 گھنٹے سے زائد طویل لوڈ شیڈنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ 2015ء میں توانائی کے شعبہ کو بجلی کی اوسطاً 4,000 میگاواٹ کی کمی کا سامنا رہا اور بجلی کے تعطل کے باعث معیشت کو 14 ارب روپے کا نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ بجلی کے گھریلو استعمال میں سالانہ 10 فیصد اضافہ ہو رہا تھا۔

زیادہ تر ماہرین توانائی کی یہ رائے ہے کہ شمسی اور ہوا سے پیدا ہونے والی توانائی پاکستان میں توانائی کی کمی اور موسمی تبدیلی کے مسائل پر قابو پانے میں مدد دے سکتی ہے۔ پاکستان سالانہ تقریباً 23 لاکھ میگاواٹ توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قائداعظم سولر پارک 2015ء میں قائم کیا گیا تھا اور اس نے مہینوں کے اندر 100 میگاواٹ شمسی توانائی قومی گرڈ میں شامل کرنا شروع کر دی۔ حکومت اس کی استعداد کو 1,000 میگاواٹ تک بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے جس کے بعد یہ دنیا کا سب سے بڑا سولر پارک بن جائے گا۔ نومبر میں اعلان کیا گیا کہ پاکستان اگلے ماہ اپنا پہلا ہوائی توانائی کا منصوبہ شروع کرے گا۔

10 countries with the most urban-dwellers without safe, private toilets

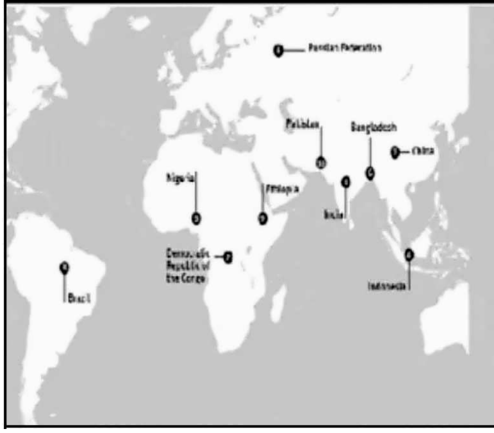

Rank	Country	Numbers
1	India	157,191,476
2	China	104,166,548
3	Nigeria	58,920,884
4	Indonesia	38,044,712
5	Russian Federation	24,231,920
6	Bangladesh	23,272,773
7	DR Congo	21,632,993
8	Brazil	20,945,314
9	Ethiopia	14,023,089
10	Pakistan	12,321,093

ذریعہ: http://dailytimes.com/pk/sindh/16-Nov-16/12m-urban-dwellers-in-pakistan-living-without-proper-sanitation-reveals-report

حکومت کا ایک اور مفید اقدام چند علاقوں میں ماس ٹرانزٹ سسٹم کا قیام اور توسیع تھا۔ اگر ملک میں زیادہ تر لوگوں نے ماس ٹرانزٹ سسٹم کا استعمال شروع کر دیا تو قدرتی ایندھن کا استعمال نمایاں طور پر کم ہو جائے گا۔

جنگلات کی کٹائی

ہزار سالہ ترقیاتی اہداف (ایم ڈی جیز) اور مستحکم ترقیاتی اہداف (ایس ڈی جیز) کا ایک اہم ہدف جنگلات کی کٹائی پر قابو پانا تھا۔ جب یو این ڈی پی نے 2011ء میں اپنی ایم ڈی جیز رپورٹ شائع کی تو اس وقت پاکستان جنگلاتی رقبے سے متعلق اپنے ہدف کو پورا کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا، لیکن اس کے بعد سے ہم نے اس جانب نمایاں پیش رفت کی ہے۔ اس حوالے سے پہلا موثر اقدام خیبر پختونخوا حکومت کی جانب سے دیکھنے میں آیا جب انہوں نے 'بلین ٹری سونامی' مہم شروع کی۔ اس مہم کے آغاز سے لے کر اب تک صوبے میں تقریباً 75 کروڑ پودے لگائے جا چکے تھے۔ ٹمبر مافیا کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے تحفظ شدہ جنگلات میں درختوں کی کٹائی پر مکمل پابندی بھی عائد کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ، درختوں کے نگرانی جی پی ایس ٹیکنالوجی کے ذریعے کی جائے گی۔

مارچ میں، ایسا ہی ایک پروگرام 'گریٹ گرین وال پروگرام' وفاقی حکومت نے بھی شروع کیا جس کا ہدف اگلے پانچ سالوں کے دوران ملک میں 10 کروڑ پودے لگانا تھا۔ یہ منصوبہ چین کے 'گریٹ گرین وال پروگرام' سے متاثر ہو کر شروع کیا گیا ہے۔ چیچہ وطنی میں درختوں کی کاشت

سے لے کر کراچی میں ساحلی جنگلات تک، یہ منصوبہ پاکستان کے کئی علاقوں کا احاطہ کرتا ہے۔

اس پروگرام کے تحت بین الاقوامی طور پر منظور شدہ مسکنوں بشمول خنجراب نیشنل پارک (جی بی)، کیرتھر نیشنل پارک (سندھ)، ہنگول نیشنل پارک (بلوچستان)، چترال گول نیشنل پارک (کے پی)، لال سُونہارا پارک اور سالٹ رینج کا علاقہ (پنجاب)، مچھیارا نیشنل پارک (اے جے کے) اور مرگلا ہلز نیشنل پارک (اسلام آباد) کی بحالی نو اور نگرانی کی جائے گا۔ پاکستان میں جنگلات کی صورتحال سے متعلق رپورٹ مرحلہ وار بنیادوں پر پیش کی جائے گی۔

ان منصوبوں کے لیے نصف سرمایہ وفاقی حکومت فراہم کرے گی جبکہ بقیہ نصف وہ صوبے مہیا کریں گے جہاں درخت کاشت کیے جائیں گے۔ یہ اقدامات موسمی تبدیلی کا مقابلہ کرنے اور تباہ کن سیلابوں جیسی قدرتی آفات پر قابو پانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

سفارشات

☆ ماحولیاتی ایجنسیوں کو جدید ترین آلات فراہم کیے جائیں تا کہ مختلف کیمیائی اجزاء کے بارے میں درست اعداد و شمار اکٹھے کیے جا سکیں۔

☆ پاکستان میں ماحول کے تحفظ اور تمام اقسام کے کیمیائی اجزاء کے خاتمے کے لیے فوری طور پر مزید قانون سازی کی ضرورت ہے۔

☆ پاکستان بھر میں عوامی آگہی مہمات شروع کی جائیں تا کہ لوگوں کو یہ جاننے میں مدد مل سکے کہ وہ کس طرح سے ماحول کے تحفظ میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

☆ پاکستان کے تمام رہائشیوں کے لیے پینے کے صاف پانی اور حفظان صحت کے انتظامات تک رسائی کو مزید بہتر بنانے کی فوری طور پر ضرورت ہے۔

☆ پاکستان کو چاہئے کہ وہ اپنی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدرتی ایندھن پر کم سے کم انحصار کرنے کی کوشش کرے اور ایسے پلانٹس کی تعمیر میں سرمایہ کاری کرے جو قابل تجدید توانائی استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں بہاول پور میں قائم کیے گئے سولر پلانٹ جیسے ہوا اور شمسی توانائی کے مزید پلانٹس کی ضرورت ہے۔

☆ حکومت کو چاہئے کہ وہ اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کرتے ہوئے موسمی تبدیلی کو بھی ان کا حصہ بنائے اور بجٹ کی تخصیص اسی کے مطابق کرے۔

☆ وسیع پیمانے پر آگہی مہمیں شروع کی جائیں تا کہ لوگوں کو یہ سمجھنے میں مدد مل سکے کہ موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی تنزلی پر قابو پانے میں وہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

معاشی اور
سماجی حقوق

مہاجرین

کسی بھی شخص کو عقیدے کی بناء پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور وہاں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور
[آرٹیکل نمبر 14 (الف)]

کوئی بھی فریق ریاست کسی شخص کو کسی ایسی ریاست کے حوالے نہیں کرے گی یا اسے واپس نہیں لوٹائے گی جہاں اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہوں کہ وہاں اسے ایذا رسانی کا نشانہ بنایا جائے گا۔

ایذا رسانی اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی
یا تضحیک آمیز سلوک کے خلاف میثاق
[آرٹیکل نمبر 3 (الف)]

2016 جبری بے دخل افراد کی ایک بہت بڑی تعداد کی اپنے گھروں کو واپسی کا سال تھا۔ ان میں اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد اور مہاجرین دونوں طرح کے بے دخل افراد شامل تھے۔ جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو 2016 میں اُنہیں درپیش کچھ حالات تو وہی تھے جن کا سامنا وہ پہلے سے کرتے چلے آرہے تھے جبکہ بعض نئی پیش رفتیں بھی سامنے آئیں۔

جہاں تک گزشتہ حالات کا تعلق ہے تو زیر نظر برس بھی افغان مہاجرین کے پاس قابل عمل چارہ یہی تھا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں، رواں برس بھی رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی رضا کارانہ وطن واپسی کی مقررہ مدت میں توسیع کی گئی۔ پاکستان نے مہاجرین کنونشن 1951 یا اُس کے پروٹوکول 1967 پر دستخط نہ کیے، اِس برس بھی مہاجرین کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت مہاجرین کے قانون کے اصولوں یا مہاجرین کی جبری بے دخلی کے ممانعت کرنے والے قانون کی پاسداری نہیں کی گئی بلکہ اُن کی قسمت کا فیصلہ یو این مہاجرین ایجنسی، پاکستان اور افغانستان کے مابین طے پانے والے سہ طرفہ بندوبست کے ذریعے کیا گیا۔

سب سے نمایاں رجحان جو دیکھنے کو ملا وہ یہ تھا کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بہت زیادہ پریشان دکھائی دی جن کا عشروں سے یہ خیال رہا ہے کہ کشیدگی زدہ ملک واپس جانے سے بہتر ہے کہ وہ پاکستان میں رہیں چاہے انہیں ایسی صورت حال میں رہنا پڑ رہا تھا جس میں

گزشتہ عشرے کے دوران کئی باران کی وطن واپسی کی حتمی تاریخ طے کی گئی۔ 2016ء میں اس سوچ میں تبدیلی دیکھنے کو ملی کیونکہ گزشتہ دس برسوں کے دوران کسی بھی سال افغان مہاجرین کی اتنی بڑی تعداد اپنے وطن واپس نہیں گئی جتنا کہ 2016 میں گئی۔

رواں برس، رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی رضا کارانہ وطن واپسی کی حتمی مدت میں دوبار توسیع کی گئی۔ ایسی متعدد اطلاعات موصول ہوئیں کہ مہاجرین کو پولیس کی طرف سے ہراساں کیا گیا اور اُنہیں ناسازگار ماحول کا سامنا تھا۔ ایسا اُس وقت ہوا جب کہا گیا کہ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں افغان شہری ملوث ہیں اور بارڈر کے انتظام وانصرام اور دہشت گردی کے خاتمے جیسے معاملات پر کابل اور اسلام آباد کے تعلقات کشیدہ ہوئے۔

اگرچہ اندرون ملک نقل مکین افراد (آئی ڈی پیز) کی بہت بڑی تعداد اپنے گھروں کو واپس لوٹی، تقریباً تمام کا تعلق وفاق کے زیر انتظام علاقہ جات (فاٹا) سے تھا، مگر اُن کی واپسی سے اُن کی مشکلات کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ گھروں اور ذرائع آمدن کی تباہی یا اُن کو پہنچنے والے نقصانات اور سکیورٹی چیک پوسٹوں نے علاقے میں داخلے، اندرون علاقہ سفر اور عام طور پر وہاں کی تمام زندگی کو شدید متاثر کیا۔ تعلیم، صحت اور دیگر انفراسٹرکچر کو نقل مکانی سے پہلے والی حالت پر بھی واپس نہیں لایا گیا تھا اگرچہ وہ حالت بھی غیر تسلی بخش ہی تھی۔

ایچ آر سی پی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پاکستان کو اندرون ملک نقل مکانی کی مشکلات سے نبٹنے کے لیے خاص قانون سازی کی ضرورت ہے۔ تاہم زیر نظر سال کے دوران قانون یا پالیسی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

متاثرہ آبادی، خاص طور پر خواتین اور پسماندہ طبقوں سے آئی ڈی پیز کی وطن واپسی سے قبل فیصلہ سازی کے عمل میں مشاورت نہیں کی گئی تھی۔ 1971ء سے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی وطن واپسی کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

مہاجرین

پاکستان کئی عشروں سے دنیا کے اُن ممالک میں سرفہرست ہے جہاں مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد پناہ گزین ہے۔ پاکستان میں مہاجرین کی تقریباً تمام آبادی افغانوں پر مشتمل ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر اپنے ملک میں جاری کشیدگی اور دیگر پیش آنے والے پرتشدد واقعات سے جان بچا کر آئے تھے۔ کچھ افغان مہاجرین 1979ء میں سوویت یونین حملے کے

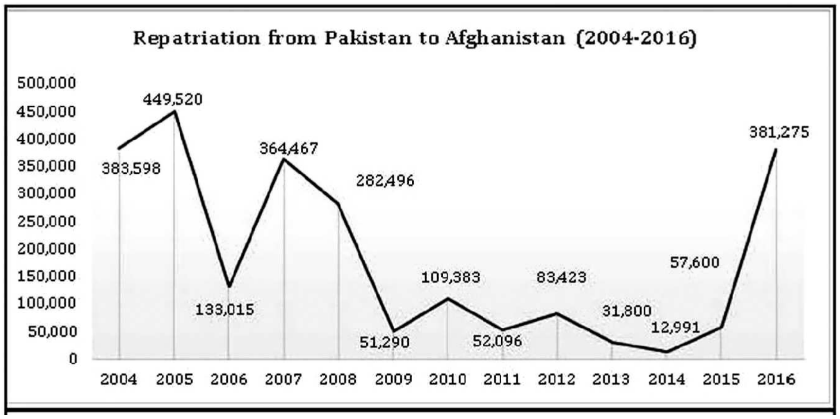

ذریعہ: یو این ایچ سی آر

بعد سرحد عبور کر کے پاکستان آ گئے تھے اور وہ اس وقت سے یہاں مقیم ہیں۔ کئی نے پاکستان میں مہاجر والدین کے ہاں جنم لیا۔

2002ء سے لے کر اب تک یو این ایچ سی آر کی امداد سے تقریباً 4.2 لاکھ افغان مہاجر پاکستان سے افغانستان واپس جا چکے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں میں، یو این ایچ سی آر کی امداد سے وطن واپس جانے والے افغانوں کی تعداد میں نمایاں کمی آئی ہے۔

رجسٹریشن کا ثبوت

2006-07 میں پاکستان میں افغان مہاجرین کی رجسٹریشن کی گئی جو کہ اس نوعیت کی واحد مشق تھی۔ اُس وقت نیشنل ڈیٹابیس رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) میں رجسٹر ہونے والے افغانوں کو رجسٹریشن کی تصدیق (پی او آر) کے تحریری کارڈز دیے گئے، یہ ایک ایسا کارڈ ہے جو پاکستان میں رجسٹرڈ افغان پناہ گزینوں کو عارضی قیام اور نقل و حرکت کی آزادی دیتا ہے۔ یُو این ایچ سی آر نے یہ کارڈ رکھنے والے افغانوں کی پاکستان میں قیام کے دوران مدد کی تھی اور اُن کی افغانستان رضاکارانہ وطن واپسی میں بھی معاونت کی تھی۔ اُنہیں جبری بے دخلی سے بھی تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ پانچ برس سے کم عمر بچوں کے نام کا اندراج اُن کے والدین کے کارڈز پر کیا گیا تھا۔ پانچ برس کے بچے اپنے پی او آر کارڈ رکھنے کے مستحق تھے۔ 2006-07 سے لے کر اب تک واحد نئی رجسٹریشن رجسٹرڈ افغانوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی تھی۔

وطن واپس جانے والے افغانوں کی تعداد، رجسٹر اور غیر رجسٹرڈ دونوں، میں 2016ء

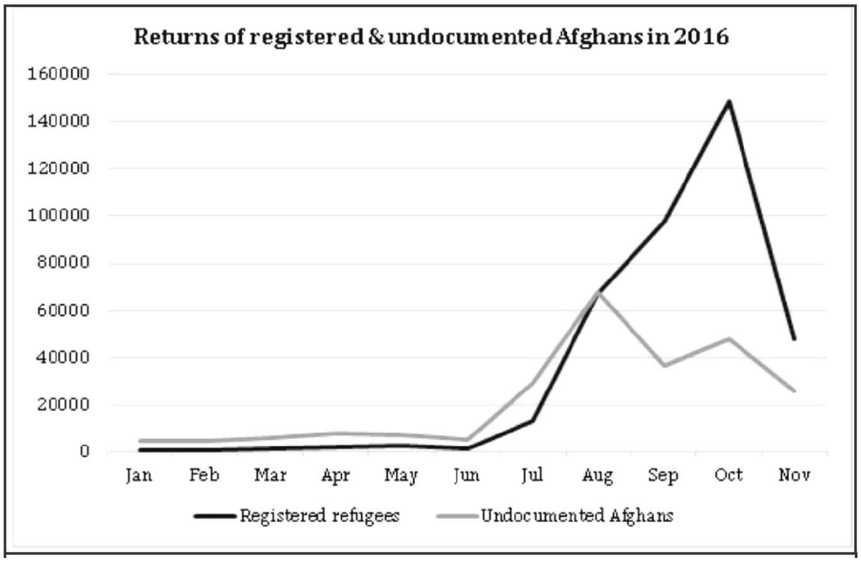

ذریعہ:(اوچا) United Nations Office for the coordination of humanitarian affairs

کے وسط سے بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ 2014 میں 12,991 اور 2015 میں 57,600 افغان مہاجرین واپس گئے تاہم 2016 سے اب تک 381,275 افغان مہاجرین نے یو این ایچ سی آر کی مدد سے افغانستان واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ 07-2006ء کے بعد یو این ایچ سی آر نے صرف رجسٹرڈ مہاجرین کی وطن واپسی عمل میں مدد کی ہے۔ اگر 2016ء میں عالمی ادارہ برائے ہجرت (آئی او ایچ) کی مدد سے واپس جانے والے غیر رجسٹرڈ افغانوں کی تعداد بھی گنی جائے تو پھر اپنے وطن واپس جانے والے افغانوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔

وطن واپس جانے والے افغانوں کی تعداد میں اضافہ

اپنے وطن واپس جانے والے افغانوں کی تعداد جولائی میں بہت زیادہ بڑھی اور نومبر کے اختتام تک چار ماہ کے عرصہ میں 361,000 رجسٹرڈ افغان اور 177,706 غیر رجسٹرڈ افغان اپنے وطن واپس گئے۔ جو واپسی معاونتی پروگرام کے تحت ہوتی تھی اُسے یکم دسمبر سے موسم سرما کے باعث مؤخر کیا گیا تھا اور توقع تھی کہ اُسے اپریل 2017 میں شروع کیا جائے گا۔

یو این ایچ سی آر کے ترجمان کے بقول گزشتہ برسوں کے رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے اندازہ لگایا کہ 2016ء میں تقریباً 50,000 رجسٹرڈ مہاجرین اپنے وطن واپس جائیں گے۔ مگر صرف اکتوبر میں، 148,000 رجسٹرڈ مہاجرین وطن واپس گئے اور یہ اگست

پاکستان سے رجسٹرڈ افغانوں کی اپنے وطن واپسی

مہینہ	2014	2015	2016
جنوری	165	3,879	325
فروری	447	3,939	263
مارچ	550	5,227	901
اپریل	1,326	9,560	1,948
مئی	2,531	12,658	2,607
جون	2,336	9,431	1,250
جولائی	273	1,518	12,962
اگست	1,629	5,402	67,058
ستمبر	1,314	2,434	97,808
اکتوبر	1,193	2,405	148,692
نومبر	786	1,147	47,458
دسمبر	441	0	0*
کل	**12,991**	**57,600**	**381,275**

(ذریعہ معلومات: یواین ایچ سی آر)

☆یواین ایچ سی آر کے معاونتی پروگرام کے تحت جو وطن واپسیاں ہونی تھیں اُنہیں موسم سرما کے باعث مؤخر کردیا گیا

2005ء سے اب تک کسی ایک ماہ میں واپس جانے والے مہاجرین کی سب سے بڑی تعداد تھی۔ اس دوران ایسے دن بھی آئے تھے جب افغانستان واپس جانے والے مہاجرین کی تعداد فی دن اوسطاً 5,500 افراد تھی۔ مہاجرین سے متعلقہ اقوام متحدہ کی ایجنسی نے وطن واپس جانے والے افغانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مسئلے سے نبٹنے کے لیے پشاور میں قائم اپنے رضا کارانہ وطن واپسی مرکز (وی آر سی) میں کام کے اوقات کار بڑھا دیے۔

ستمبر کے آخری دنوں میں، یواین ایچ سی آر نے خیبر پختونخوا میں اپنا دوسرا رضا کارانہ وطن واپسی کا دوسرا مرکز کھولا۔ ضلع نوشہرہ کے علاقے ازاخیل میں قائم ہونے والے اس نئے مرکز کے باعث یواین ایچ سی آر نے وطن واپس جانے والے رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی بہت بڑی تعداد کو طورخم بارڈر کے راستے افغانستان بھیجا۔

پاکستان سے افغانستان جانے والے رجسٹرڈ مہاجرین میں سے سب سے زیادہ خیبر پختونخوا سے گئے۔ 2016ء میں پختونخوا سے 308,171 افغان مہاجر اپنے وطن واپس گئے۔ دوسری بڑی تعداد پنجاب سے گئی۔ ان لوگوں کی تعداد 36,300 جبکہ بلوچستان، اسلام آباد اور سندھ سے بالترتیب 5473,28,136 اور 2690 رجسٹرڈ افغان مہاجرین واپس گئے۔

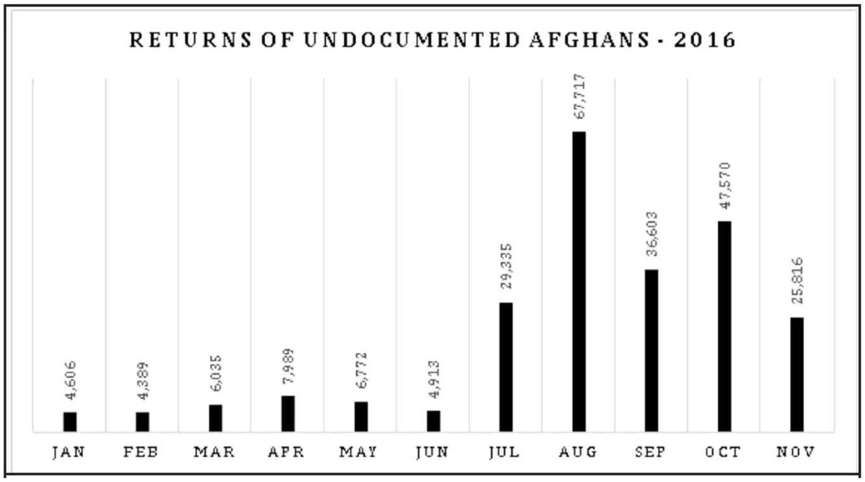

ذریعہ: آئی او ایم: supported return were suspended for the winter season from December 01

اپنے وطن واپس جانے والے رجسٹرڈ مہاجرین میں سے 91 فیصد جبکہ غیر رجسٹرڈ مہاجرین میں سے 87 فیصد طورخم بارڈر جبکہ 9 فیصد رجسٹرڈ اور 13 فیصد غیر رجسٹرڈ مہاجرین صوبہ بلوچستان میں واقع چمن بارڈر کے ذریعے افغانستان داخل ہوئے۔

31 اکتوبر 2016ء تک، پاکستان میں 1,347,645 رجسٹر افغان مہاجرین مقیم تھے۔ یو این ایچ سی آر کے اعداد وشمار کے مطابق، 30 ستمبر 2016ء کو، دیگر مما لک سے 582 مہاجرین پاکستان میں رہائش پذیر تھے۔

سال کے اوائل میں وطن واپس جانے والے غیر رجسٹرڈ افغانوں کی تعداد ان رجسٹرڈ افغان مہاجرین سے زیادہ تھی جو وطن واپس لوٹے۔ جبکہ جولائی کے بعد یہ تعداد تقریباً برابر رہی ہے۔ آئی او ایم کے اعداد وشمار کے مطابق، 2016ء کے پہلے نصف میں ہر روز 150 سے 266 تک غیر رجسٹر افغان مہاجرین وطن واپس گئے۔ اگست میں یہ تعداد 946 افراد فی دن ہوگئی جبکہ ستمبر کے دوران ہر روز تقریباً 2,184 غیر رجسٹرڈ افغان اپنے وطن واپس جاتے تھے۔

وطن واپسی پر مجبور کرنے والے عوامل

2016ء میں، پاکستان میں مقیم افغانوں کو کابل اور اسلام آباد کے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں ملکوں کے تعلقات قومی سلامتی کے معاملے پر خراب ہوئے تھے۔ کئی دیگر ملتی جلتی پیش رفتیں جن میں سے کئی 2016ء کے وسط میں پیش

آ ئیں، بھی افغانوں کی رضا کارانہ وطن واپسی میں اضافے کا سبب بنیں۔

جون کے اوائل میں افغانستان جانے کے لیے دستاویزات کی شرائط لاگو کی گئیں اور پاک۔افغان سرحد پر کنٹرول میں بھی سختی لائی گئی یہی وہ وقت ہے جب افغانستان واپس جانے والے مہاجرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔اس سے قبل افغانوں کو پاکستان آنے کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں تھی۔یکم جون کو یہ پالیسی تبدیل کی گئی۔

پاکستان میں مہاجرین کے خلاف کارروائی کے خوف اور یہاں ان کے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی صورتحال سے بھی افغان مہاجرین کی بہت بڑی تعداد اپنے ملک واپس جانے پر مجبور ہوئی۔ پولیس کے ہاتھوں افغانوں کی ایذا دہی کی شکایات بھی منظر عام پر آئیں۔ یو این ایچ سی آر کے مطابق، امن عامہ کے حالات نے بھی جولائی 2016ء کے بعد افغانوں کی وطن واپسی میں شدت لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یو این ایچ سی آر نے کہا کہ غیر رجسٹرڈ غیر ملکیوں بشمول غیر رجسٹرڈ افغانوں کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارروائیوں نے بھی پاکستان میں افغانوں کی فیصلہ سازی کو متاثر کیا۔

افغان شہریوں کے خلاف پاکستانی معاشرے کے منفی رویوں کی اطلاعات بھی سامنے آئیں۔اس نفرت انگیز رویے کی وجہ یہ تاثر تھا کہ بعض افغانی پاکستان میں جرائم اور دہشت گردی میں ملوث ہیں۔رضا کارانہ وطن واپسی اور دوبارہ اپنے ملک کا حصہ بننے کے لیے یو این ایچ سی آر نے جو امداد دی، اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کیا۔مالیاتی امداد

پشاور کے باہر یو این ایچ سی آر کے وطن واپسی مرکز کے قریب افغان مہاجرین کی لمبی قطاریں

کو جون میں 200 ڈالر سے 400 ڈالر فی فرد کیا گیا۔

افغان مہاجرین کی وطن واپسی کی راہ میں جو مشکلات درپیش تھیں ان میں افغانستان میں امن اور استحکام کا فقدان، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور وہاں زمین/املاک یا معاشی مواقع کی کمی شامل تھیں۔

افغان مہاجرین نے پاکستان میں نسبتاً بہتر معاشی مواقع کی وجہ سے بھی یہاں مقیم رہنے کو ترجیح دی اور پاکستان میں قیام کو انہوں نے اس وجہ سے بھی ترجیح دی کہ وہ یہاں اپنے کاروبار چلا رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ افغانستان کے مقابلے میں یہاں انہیں بہتر سماجی خدمات اور تعلیم وصحت کی اچھی سہولیات تک رسائی ہے۔

افغان وزارت مہاجرین وطن واپسی نے بھی جولائی میں پاکستان میں ایک مہم شروع کی جس کا مقصد افغانوں کو وطن واپسی پر قائل کرنا تھا۔ اس مہم کی وجہ سے بھی بہت سے لوگوں نے اپنے وطن واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ افغانستان حکومت کی افغانوں کو اپنے ملک کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے وطن واپس آنے کے لیے قائل کرنے کی یہ پہلی نمایاں کوشش تھی۔

آہستہ آہستہ ملنے والی توسیع

رجسٹرڈ افغان مہاجرین کے پاس رجسٹریشن کے ثبوت کے کارڈز (پی او آر) ہیں جس کی وجہ سے انہیں پاکستان میں رہنے کی اجازت ہے۔ پاکستان نے گزشتہ برسوں کے دوران رجسٹرڈ افغانوں کی وطن واپسی کے لیے متعدد بار حتمی تاریخ مقرر کی۔ ان تاریخوں میں کئی بار توسیع کی گئی، زیادہ تر حتمی تاریخ ختم ہونے کے قریب ہوتی تھی جب اس میں توسیع کی جاتی تھی 2016ء میں رجسٹرڈ مہاجرین کی وطن واپسی کی حتمی تاریخ میں دوبار توسیع کی گئی۔ جون میں وزیراعظم نے پی او آر میں 31 دسمبر 2016ء تک توسیع کردی۔ ستمبر میں، وفاقی کابینہ نے رجسٹرڈ افغانوں کے قیام میں مارچ 2017ء تک توسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مہاجرین نے 31 دسمبر تک اپنے کاروبار لپیٹنے اور پاکستان چھوڑنے میں درپیش مشکلات کی وجہ سے کہا تھا کہ انہیں ملک چھوڑنے کے لیے مزید وقت دیا جائے۔ پاکستان میں یو این ایچ سی آر کے ترجمان نے وفاقی کابینہ کے فیصلے کو سراہا اور کہا کہ اس توسیع سے پریشان حال افغان مہاجرین کی کچھ داد رسی ہوئی ہے جس کی انہیں بہت ضرورت تھی۔

ستمبر میں کابینہ کے جس اجلاس کے دوران مہاجرین کے قیام میں توسیع کا اعلان کیا

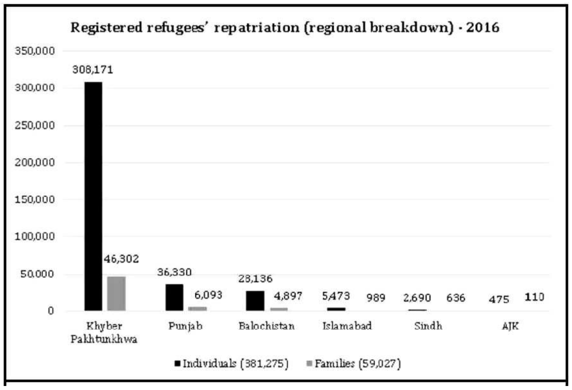

ذریعہ: یو این ایچ سی آر

گیا، اسی اجلاس میں وزیراعظم نے مہاجرین کی ان شکایات کا نوٹس بھی لیا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں انہیں ہراساں کر رہی ہیں۔ وزیراعظم نے کہا کہ ''پاکستان میں افغان مہاجرین کو تکالیف سے بچانے کے لیے ہم موثر اور ٹھوس اقدامات کریں گے''۔ وزیراعظم کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ''ہم پاکستان میں قیام پذیر افغان مہاجرین کی ایذادہی کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ وہ ہمارے مہمان ہیں اور ان کی واپسی کی منصوبہ بندی اس انداز میں کی جائے گی جس سے سرحد کے دونوں طرف رہنے والے لوگوں کے ذہن میں کوئی منفی تاثر پیدا نہ ہو''۔

اطلاعات کے مطابق، وزیراعظم نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت کو ہدایت کی کہ افغانوں کے تحفظات دور کرنے کے لیے مرکزی سیاسی جماعتوں اور افغان مہاجرین کے نمائندوں کے ساتھ مشاورت کی جائے۔

وزیراعظم کے دفتر نے کابینہ اجلاس کے ایجنڈے کی تفصیلات جاری کیں جن کے مطابق افغان مہاجرین کے قیام میں 31 دسمبر 2017ء تک توسیع کی گئی تھی، مگر کابینہ نے سکیورٹی ایجنسیوں، وفاقی وزارت داخلہ، نیز خیبرپختونخوا اور بلوچستان کی حکومتوں کے تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے 31 مارچ، 2017ء تک توسیع کی منظوری دی۔

ایذادہی

مہاجرین کو درپیش مشکلات کی سنگینی کا اندازہ صرف اعداد وشمار سے نہیں ہوسکتا۔ انہیں پولیس کی طرف سے تنگ کیے جانے کی اطلاعات سامنے آئیں۔ اس کے علاوہ افغان مہاجرین کو ڈرانے دھمکانے اور بھتہ خوری کی شکایات بھی منظر عام پر آئیں۔ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے بعض بیانات نے افغان مہاجرین کے حقوق بشمول نقل وحرکت کی آزادی کے حق پر پابندیوں

کے حوالے سے خدشات کو جنم دیا۔ خدشہ تھا کہ اس قسم کے بیانات سے نہ صرف مہاجرین میں خوف کی فضا پیدا ہوگی بلکہ ان سے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کی ناروا کارروائیوں کو بھی شہہ ملے گی۔

ستمبر میں، یو این ایچ سی آر کے ترجمان نے کہا کہ اقوام متحدہ کی ایجنسی کو احساس ہے کہ واقعات افغان مہاجرین کے خلاف پولیس کے کئی غیر قانونی اقدامات اُن افراد کی کارروائیوں کا نتیجہ تھے جنہوں نے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ انہوں نے خیبر پختونخوا، پولیس کے سربراہ کی طرف سے ہیلپ لائن قائم کرنے کے اقدام کو سراہا۔ مہاجرین اس ہیلپ لائن کے نمبرز پر کال کر کے ایذا دہی کے واقعات کی اطلاع دے سکتے تھے۔ افغان مہاجرین کے ساتھ قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کے غیر قانونی اور امتیازی سلوک کے خاتمے کے لیے مزید ٹھوس اقدامات کرنے پر زور دیا گیا۔

جب حکومت نے 29 جون، 2016ء کو جی او آر کارڈز رکھنے والے افغان مہاجرین کے قیام کو 2016ء کے اختتام تک مزید چھ ماہ کی توسیع دی تو ہیومن رائٹس واچ نے کہا کہ اس فیصلے نے پولیس اہلکاروں اور مقامی انتظامیہ کے اہلکاروں کو واضح پیغام دیا ہے کہ "انہیں افغان مہاجرین کو پاکستان چھوڑنے کے لیے ہراساں یا مجبور نہیں کرنا چاہیے"۔ البتہ، یکم جولائی کو ہیومن رائٹس واچ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ افغان مہاجرین کو کم از کم 31 دسمبر 2017ء تک پاکستان میں رہنے کی اجازت دے کر ان کے حقوق کی پامالی کا سلسلہ روکا جائے۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیم نے کہا کہ 2017ء کے اختتام تک توسیع سے افغانستان کی صورت حال کو مستحکم ہونے کے لیے مزید وقت مل جائے گا اور اس طرح مہاجرین کے لیے محفوظ اور پُر وقار طریقے سے اپنے وطن واپس جانا زیادہ آسان ہوگا۔

اکتوبر میں، ایک پاکستانی شخص نے ذرائع ابلاغ کے توسط سے حکومت سے اپیل کی کہ اس کی افغان بیوی کے شناختی کارڈ کو بلاک کرنے کا فیصلہ واپس لیا جائے کیونکہ اس فیصلے سے اس کی بیوی اور ان کے بچوں کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے بقول، وہ گزشتہ تیس برس سے بطور میاں بیوی ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔

نومبر میں، اپنی سبز آنکھوں کے باعث عالمی شہرت پانے والی افغان لڑکی شربت گلہ کو پاکستان نے ملک بدر کیا۔ نیشنل جیوگرافک نے افغان مہاجرین کی حالت زار کو اجاگر کرنے

کے لیے جون 1985ء کے اپنے شمارے کے سرورق پر شربت گلہ کی تصویر لگائی تھی۔شربت گلہ کو دھوکہ دہی کے ذریعے پاکستانی قومی شناختی کارڈ حاصل کرنے کے الزام میں پاکستان بدر کیا گیا۔

افغان مردوں کے ساتھ شادی کرنے والی پاکستانی عورتوں نے بھی پشاور پریس کلب کے باہر سامنے احتجاجی مظاہرے کیے۔ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے شوہروں کو پاکستان میں ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔

ستمبر میں، پشاور میں ایک احتجاج کے دوران، پاکستانی خواتین نے بتایا کہ ان کے افغان شوہروں کی افغانستان واپسی سے ان کے گھر بکھر گئے ہیں۔بعض کا کہنا تھا کہ وطن واپس جانے والے بعض افغان اپنے بچے بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔

نومبر میں، احتجاج کرنے والی پاکستانی خواتین کے ایک گروہ نے حکومت سے اپیل کی کہ ان کے شوہروں کو پاکستانی شہریت دی جائے تاکہ وہ پاکستان واپس آسکیں۔ان کا کہنا تھا کہ وہ اوران کے بچے افغانستان میں جاری جنگ کی وجہ سے وہاں نہیں جانا چاہتے۔متاثرہ لوگوں نے اپنے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے 2016ء کے آخری مہینوں میں عدالتوں سے بھی رجوع کیا۔ایک پاکستانی خاتون اور اس کے افغان شوہر نے پاکستان شہریت ایکٹ 1951 کے خلاف عدالت عالیہ، پشاور میں پٹیشن دائر کی جس پر عدالت نے اکتوبر میں وفاقی حکومت سے جواب طلب کیا۔جوڑے کا کہنا تھا کہ یہ قانون درخواست گذار خاتون کے ساتھ امتیازی سلوک کا مرتکب ہوا ہے اور عدالت سے استدعا کی گئی کہ وفاقی حکومت کو خاتون درخواست گزار کو کمپیوٹرائزڈ نیشنل کارڈ (سی این آئی سی) جاری کرنے اور اس کے شوہر کو پاکستانی شہریت دینے کی ہدایت کی جائے۔اطلاعات کے مطابق، درخواست گزار نے 2009ء میں شادی کی تھی اور جب اس نے سی این آئی سی کے لیے حکام سے رجوع کیا تو اسے اپنے خاوند کا سی این آئی سی پیش کرنے کے لیے کہا گیا جو کہ وہ پیش نہ کرسکی۔سال کے آخر تک اس معاملے کا بظاہر فیصلہ نہیں ہوسکا تھا۔

زیادہ تکالیف اور مشکلات کا سامنا

مہاجرین کی خواتین اور بچوں کو اپنے گروپ کے دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ مشکلات کا سامنا تھا۔خواتین صرف وطن واپسی کے مختلف مراحل سے گزرنے اور اپنے غیر یقینی مستقبل کی وجہ سے ہی پریشان نہیں تھیں بلکہ ان کے لیے اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ فیصلہ سازی کے

عمل میں ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا تھا اور نہ ہی انہیں کوئی کردار ادا کرنے دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے اپنے خاندان کے اندر بھی ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ افغانستان واپس جانے والے دس فیصد خاندانوں کی سربراہ خواتین تھیں،

نارویجن کونسل برائے مہاجرین نے بلوچستان کے پرائمری سکولوں میں افغان بچوں کی انتہائی کم تعداد پر تشویش کا اظہار کیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ پرائمری میں داخلہ لینے والے افغان بچوں میں سے تقریباً نصف سیکنڈری اسکول کی سطح پر جانے سے پہلے ہی اسکول سے خارج ہو گئے تھے۔

سال کے آخر میں، ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق، جامعہ پشاور نے ان افغان طالبعلموں کو اسناد دینے سے انکار کر دیا جنہوں نے جامعہ پشاور سے ملحق اداروں سے گریجوایشن کی تھی مگر وہ اپنے پی او آر یا افغان پاسپورٹ پیش کرنے میں ناکام ہوئے تھے۔ جامعہ پشاور میں افغان طالب علموں کے لیے دو نشستیں مختص تھیں اور داخلے کی درخواست دینے والوں کو دستاویزات کے ذریعے یہ ثابت کرنا پڑا تھا کہ وہ پاکستان میں قانون کی اجازت سے رہائش پذیر ہیں۔

شناخت کا بحران

ایسے کئی پاکستانی شہری بھی وطن واپسی کی لہر کا نشانہ بنے جن کی بیویاں اور بچے افغان تھے۔ پاکستانی شہریوں کے ان گروہوں نے احتجاجی مظاہرے کیے اور عدالتوں سے رجوع کیا تاکہ ان کے خاندان بکھرنے سے بچ جائیں۔

اگست میں، وزیر داخلہ نے قومی اسمبلی کو بتایا کہ پاکستان میں رہائش پذیر افغان مہاجرین کے بچوں کو پاکسانی شہریت نہیں دی جاسکتی۔ ان کا کہنا تھا کہ افغان مہاجرین کے بچے افغان ہیں اور وہ پاکستانی شہریت کے مستحق نہیں ہیں چاہے ان کی مائیں پاکستانی ہی کیوں نہ ہوں۔

جب یہ معلوم ہوا کہ مئی میں بظاہر ایک امریکی ڈرون حملے میں مارے جانے والے افغان طالبان سربراہ کے پاس پاکستانی کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ (سی این آئی سی) تھا، وزیر داخلہ نے ان لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا حکم جاری کیا جنہوں نے دھوکہ دہی سے پاکستانی شناختی کارڈ حاصل کر رکھے تھے، اور اس کے بعد سی این آئی سی کی توثیق کی ملک گیر مہم شروع ہوئی۔

ستمبر میں، پاکستانی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا کہ اپنی عالمی ذمہ داریوں کی رو سے، پاکستان کو ان افغان مہاجرین کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے انٹرپول سے رابطہ کرنا پڑا جنہوں نے جعلی سی این آئی سی استعمال کر کے پاکستانی پاسپورٹ حاصل کیے تھے۔

اندرون ملک نقل مکانی

2016ء میں طوفانی بارشوں اور سیلاب کے باعث لوگ بہت کم تعداد میں اور مختصر وقت کے لیے نقل مکانی کرتے رہے مگر بڑے پیمانے پر لوگوں کی نقل مکانی کی وجہ کشیدگی ہی تھی۔ ملک میں کشیدگی کے باعث سب سے بڑی نقل مکانی وفاق کے زیر انتظام علاقوں (فاٹا) میں ہوئی تھی۔ 2008ء کے بعد، فاٹا کے تقریباً 53 لاکھ (5.3 ملین) افراد نے نقل مکانی کی ہے، ان میں سے بعض کو کئی بار نقل مکانی کرنا پڑی ہے۔ ان میں سے 48 لاکھ افراد، 2016ء کے اختتام تک اپنے گھر واپس جا چکے تھے۔

حکومت نے کہا تھا کہ 2016ء نقل مکانی کرنے والوں کی وطن واپسی کا سال ہے اور زیر نظر سال کے دوران کم از کم 700,000 افراد اپنے آبائی علاقوں میں واپس گئے۔ انسانیت دوست امور کی رابطہ سازی کے اقوام متحدہ کے دفتر، حکومت پاکستان، اقوام متحدہ اور دیگر عالمی تنظیموں کے اعداد و شمار کے مطابق 2016ء میں نقل مکانی کرنے والے کل 114,511 خاندان اپنے وطن واپس گئے جبکہ 76,507 خاندان ابھی بھی نقل مکانی جیسے حالات میں رہ رہے تھے۔

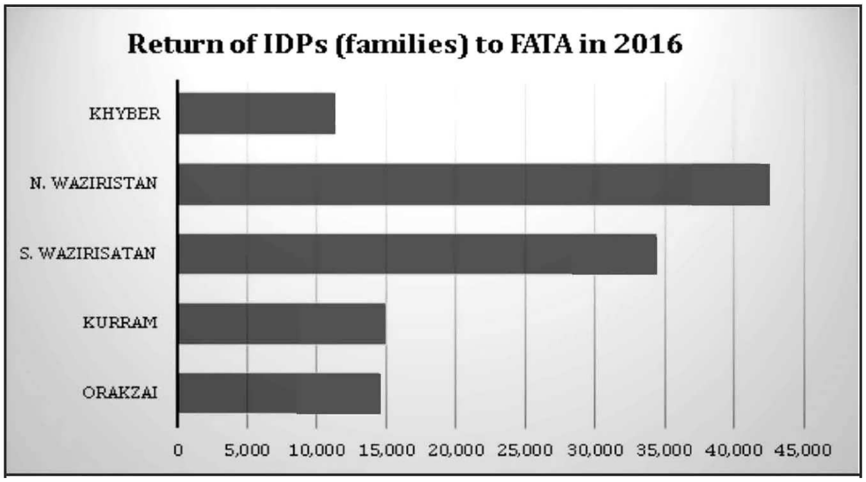

ذریعہ: یو این ایچ سی آر

یہ بات طے تھی کہ اپنے علاقے میں واپس جانے والے آئی ڈی پیز کو انسانیت دوست امداد کی ضرورت رہے گی، مگر اب امدادی سرگرمیوں کا بنیادی مرکز ان کے آبائی علاقوں کو بنایا جانا تھا۔ صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے فیلڈ میں کام کرنے والے ایچ آر سی پی کے کارکنوں واپس جانے والی کمیونٹیوں کی طرف سے ایسی کئی شکایات ملیں کہ زیادہ تر علاقوں میں ایسی امداد کا فقدان تھا یا وہ غیر موثر تھی جو آئی ڈی پیز کی پائیدار واپسی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری تھیں۔

یو این ایچ سی آر کے مطابق 2016ء کے دوران اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے کل 117,280 خاندان فاٹا کے کئی اضلاع میں واقع اپنے آبائی علاقوں میں واپس گئے۔ جدول میں درج آئی ڈی پیز کے اعداد و شمار میں وہ غیر رجسٹرڈ آئی ڈی پیز شامل نہیں ہیں جو حکومت کی مدد سے اپنے علاقوں میں واپس گئے تھے۔

آئی ڈی پیز کی بہت بڑی تعداد اپنے وطن واپس گئی مگر اس کے باوجود لاکھوں لوگ ابھی بھی اندرون ملک نقل مکانی کی صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں مگر اس حقیقت کے باوجود بھی اس مسئلے کو قومی سطح پر توجہ نہیں مل سکی۔ میڈیا کوریج حکومت کے جاری کردہ اعداد و شمار اور واپس جانے والے آئی ڈی پیز کے آبائی علاقوں کے ذکر تک محدود رہی۔ پارلیمانی مباحثے اور حکومتی پالیسی نہ تو آئی ڈی پیز کی ضروریات کا بندوبست کر سکی اور نہ ہی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی خاص حکمت عملی وضع کر سکی۔ اس حقیقت پر بہت کم توجہ دی گئی کہ آئی ڈی پیز ان گھروں، انفراسٹرکچر، روزگار اور مقامی معیشت کی طرف لوٹ رہے ہیں جو تباہ ہو چکی ہے۔

ذریعہ: یو این ایچ سی آر

یو این ایچ سی آر کے اعداد و شمار کے مطابق، واپس جانے والے تقریباً 15 فیصد گھرانوں کی سربراہ خواتین تھیں۔ جن گھرانوں کی سربراہ خواتین تھیں، ان میں سے زیادہ تر کا تعلق جنوبی وزیرستان کے جنوبی اضلاع (22 فیصد)، شمالی وزیرستان (23 فیصد) اور کرم (17 فیصد) کرم سے تھا۔

اہم ضروریات

حکومت نے وطن واپس جانے والے رجسٹرڈ آئی ڈی پی خاندانوں کو فوری ضروریات پوری کرنے کے لیے 25,000 روپے، نقل و حمل کی ضروریات کی مد میں 10,000 روپے اور نقصانات کے تخمینے کی بنیاد پر، گھر کی تعمیر کے لیے 400,000 روپے دینا تھے۔

یُو این او چا (UNOCHA) نے آئی ڈی پیز، خیبر پختونخوا اور فاٹا میں واپس اپنے علاقوں کو جانے والے 2674 گھرانوں کی مجموعی حالت کا جائزہ لے کر ان کے روزگار اور بنیادی سماجی سہولیات کے حوالے سے انتہائی اہم ضروریات کو اجاگر کیا تھا۔ سروے کیے گئے گھرانوں میں سے 18.6 فیصد کا کوئی ایک فرد معذور تھا۔ 74 فیصد گھرانوں نے بتایا کہ اُن کے آبائی علاقوں میں اُن کا گھر مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہو گیا ہے۔ پانچ برس سے کم عمر بچوں میں سے 19 فیصد غذا کی شدید قلت کا شکار تھے۔ تحفظ کے بنیادی مسائل کے حوالے سے 81 فیصد نے روزگار کے مواقع اور بنیادی سہولیات کے فقدان کی نشاندہی کی جبکہ 40 فیصد نے معذور افراد کے لیے سہولیات کی کمی کی شکایت کی۔

69 لڑکیاں اور 29 لڑکے اسکول سے باہر تھے۔ واپس لوٹنے والے 58 فیصد افراد کو غیر صحت بخش پانی دستیاب تھا؛ 58 فیصد کو صحت کی بنیادی سہولت میسر نہیں تھی اور 23 فیصد غذائی عدم تحفظ کا شکار تھے۔

سروے کے مشاہدات نے بدستور بے دخلی کی حالت میں قیام پذیر اور واپس لوٹ کر جانے والوں کو درپیش مشکلات کی نشاندہی کی ہے اور اُن مشکلات کو بھی اجاگر کیا ہے جو متاثرہ کمیونٹیوں کو بحالی نو اور اپنی وطن واپسی کو پائیدار بنانے کے حوالے سے پیش آ سکتی ہیں۔

جس مسئلے کا تواتر کے ساتھ سامنا رہا وہ یہ تھا کہ خواتین لڑکیوں اور غیر محفوظ گروہوں سے اُن کی زندگیوں کو متاثر کرنے والے فیصلوں کے متعلق مشاورت نہیں کی گئی تھی۔

یُو این او چا فیلڈ وفد نے اپریل 2016 میں کرم ایجنسی کا دورہ کیا تاکہ اپنے وطن واپس لوٹنے والے آئی ڈی پیز کو درپیش فوری ضروریات کا جائزہ لیا جا سکے۔ مشن کی جاری کردہ رپورٹ میں متعدد معاملات کو توجہ طلب قرار دیا۔ وفد نے وہاں دیکھا کہ آئی ڈی پیز کی پریشانی کا بنیادی سبب صحت، تعلیم، گھر، پانی اور ذرائع روزگار جیسے معاملات تھے اور وہ اپنے آبائی علاقوں میں اِن سہولیات کی عدم دستیابی پر بہت زیادہ فکرمند تھے۔ مشن نے جن اسکولوں کا دورہ کیا وہاں

کے چھتوں کی مرمت ہونے والی تھی اور اِس کے علاوہ پانی اور صفائی کے معاملات بھی توجہ طلب تھے۔ وفد نے جن گھروں کا دورہ کیا، اُن سب کے چھت، دیواریں اور فرش ٹوٹے ہوئے تھے۔ واپسی کے کچھ دن بعد، لوگوں کو اُنہیں یہ سوچ کر پریشانی ہوئی کہ ہوسکتا ہے کہ اُنہیں خیموں اور شیلٹر کا ساز وسامان ابتدائی تخمینہ سازی کے بعد ملے جس پر کچھ دن لگ سکتے ہیں۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ اپنے علاقے میں واپس آنے والے تمام آئی ڈی پیز کو اُس وقت شیلٹر دے دیا جانا چاہیے جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوں۔ دورہ کرنے والے وفد نے نیو درانی کیمپ میں خواتین ڈاکٹرز کی کمی کا بھی مشاہدہ کیا۔ خواتین مریضوں کے علاج اور اُنہیں ادویات کی فراہمی کا کام لیڈی ہیلتھ ورکرز کرتی تھیں اور سنگین بیماری کی صورت میں مریض کو مرد ڈاکٹروں کے پاس جانے کو کہا جاتا تھا۔

جہاں تک روزگار کے مواقع کا تعلق ہے، وفد کے مشاہدات کے مطابق سڈہ (بالائی کرم) میں کاروباری سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں اور پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر پیشہ وارانہ تربیت میں لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔ نئی فصلیں اگانے کے لیے بیجوں کی ضرورت تھی۔ کچھ فصلوں کے بیج اور مال مویشیوں کا چارہ فراہم کیا گیا تھا۔

طویل انتظار

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دیگر ہزاروں خاندان 2016 کے اختتام پر بھی اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ کئی آئی ڈی پیز نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ حکام اُن کی واپسی کے متعلق ہونے والی پیش رفت یا واپسی کے مقررہ وقت کے بارے میں آگاہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

وادی تیراہ سے نقل مکانی کرنے والے سینکڑوں خاندان دسمبر میں اُن کی وطن واپسی کے حکومتی منصوبے کی نوید کا انتظار کرتے رہے۔ کُکی خیل قبیلے 1800 سے زائد خاندانوں نے شکایت کی کہ اُن کی نقل مکانی کا اندراج نہیں کیا گیا۔ اُنہوں نے 2012 میں نقل مکانی کی تھی۔

پولیٹیکل ایڈمنسٹریشن کے اہلکاروں کا کہنا تھا کہ ککی خیل کے علاقے کو مقامی لوگوں کے حوالے کرنے کا نوٹیفکیشن ابھی تک جاری نہیں ہوا، حالانکہ اُس علاقے میں ہونے والے زمینی فوجی آپریشن خیبر - 2 کے خاتمے کا اعلان 2016 کے شروع میں ہی ہو گیا تھا۔

بار قمبر خیل قبیلے کے تقریباً 1,200 خاندان بھی اپنے گھروں کو جانے کا طویل عرصہ سے انتظار کر رہے تھے کیونکہ اُنہیں کئی بار یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ قبائلی علاقے کرم کے ساتھ

بچے نقل مکانی کے بعد اپنے گاؤں واپس آ کر اپنے تباہ شدہ گھر کے باہر کھیل رہے ہیں

مشتر کہ سرحد والے علاقے کو شدت پسندوں سے پاک کروالیا گیا ہے۔ متاثرہ خاندانوں نے کہا کہ کسی نے بھی اُن کی وطن واپسی میں تاخیر کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی۔

متاثرہ خاندانوں نے بتایا کہ فیڈرل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (ایف ڈی ایم اے) نے 2016 کے اوائل سے بارقمبر خیل قبیلے کے لوگوں کو جت درہ، اوچ نو، تاجو اور یا گومیلہ کے مقامات پر ماہانہ راشن کی فراہمی بند کر رکھی ہے۔ بعدازاں، ایف ڈی ایم اے کرم ایجنسی میں، سڈہ کے نزدیک نیو درانی کیمپ بند کر دیا جہاں زیادہ تر بارقمبر خیل کے لوگ مقیم تھے۔ یہ اقدام حکام نے زیادہ تر خاندانوں سے رضا کارانہ واپسی فارم (وی آر ایف) پُر کروانے کے بعد کیا تھا۔ خاندانوں کا کہنا تھا کہ اُنہیں وی آر ایف جاری کرنے کے بعد، اُنہیں ملنے والی ہر قسم کی حکومتی امداد بند کر دی گئی۔ متاثرہ خاندانوں نے اِس پریشانی کا اظہار بھی کیا کہ اُن کی نقل مکانی کے بعد، بارشوں اور برف باری کے باعث اُن کے گھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ آئی ڈی پیز نے مسائل کو اجاگر کرنے کے کئی احتجاجی مظاہرے کیے۔

عطا آباد آفت کے متاثرین

جنوری 2010ء میں گلگت بلتستان میں نقل مکانی کرنے والے تقریباً 3,000 افراد گزشتہ چھ برسوں سے آئی ڈی پیز کے تقریباً نصف درجن خیموں میں مقیم ہیں۔ یہ لوگ اپنے گھروں سے اُس وقت بے دخل ہوئے تھے جب دریائے ہنزہ میں ایک بہت بڑی لینڈ

سلائڈنگ نے عطا آباد جھیل کو جنم دیا اور پانی کی سطح بڑھنے سے پانچ دیہات ڈوب گئے۔

ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے اگست میں ہنزہ کے علاقے علی آباد میں واقع آئی ڈی پی کیمپ میں عطا آباد جھیل کے متاثرین سے ملاقات کی۔ آئی ڈی پیز نے مشن کو اپنے مسائل سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ حکومت نے اُنہیں اُن کے زیرِ آب آنے والے گھروں اور زمینوں کا ابھی تک معاوضہ نہیں دیا۔

علی آباد کے کیمپ میں لوگوں کے حالات زندگی انتہائی دشوار تھے۔ وہاں آئی ڈی پیز کو صحت کی سہولیات دستیاب نہیں تھیں۔ آئی ڈی پیز کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اُن کی بے دخلی کا دورانیہ کب ختم ہوگا۔

پھنسے ہوئے پاکستانی

1971 سے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی حالت زار کا مداوا کرنے کی کوئی کوشش بھی نظر نہ آئی۔ بہاریوں کے نام سے جانے والے یہ لوگ اردو زبان بولنے والی کمیونٹی کا حصہ تھے اور سابقہ مشرقی پاکستان میں مقیم تھے۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اِن کے اِس مؤقف کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ اس بات پر بضدر ہے کہ وہ بنگلہ دیشی نہیں بلکہ پاکستانی ہیں اور اُنہیں پاکستان واپس بھیجا جائے۔ بنگلہ دیش کے نام سے بننے والے نئے ملک میں اُنہیں غدار سمجھا جانے لگا۔ پاکستان نے اُن میں سے کچھ کو قبول کرلیا تھا مگر اُن کی اکثریت کو لینے سے انکار کر دیا۔ 2016 میں، اُن کو اس تکلیف دہ صورت حال سے نکالنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی گئی۔

سفارشات

حکام کو چاہیے کہ وہ رجسٹرڈ مہاجرین کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ہاتھوں ایذا رسانی اور بدسلوکی کے خلاف فوری کارروائی کریں اور اِس بات کو یقینی بنائیں کہ اُن کے ساتھ قانون کی مطابقت میں پُر وقار سلوک ہو۔

☆ پاکستان کو یو این ایچ سی آر، افغانستان اور عالمی برادری کے ساتھ مل کر افغان مہاجرین کے مسئلے کا پائیدار حل تلاش کرنا چاہیے اور اس چیز کو یقینی بنائے کہ کسی بھی افغان مہاجر کو زبردستی اپنے وطن واپس نہ بھیجا جائے۔

☆ اندرون ملک نقل مکانی سے متعلقہ مشکلات کے ازالے کے لیے پاکستان کو عارضی انتظامات پر انحصار کرنے کی بجائے ایک خاص قانونی ڈھانچہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔اس معاملے پر قانون اور پالیسی تشکیل دیتے وقت، خاص توجہ کا مرکز یہ ہدف ہونا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، اندرون ملک نقل مکانی روکی جائے اور اگر حالات ایسے ہوں کہ نقل مکانی ناگزیر ہو جائے تو پھر اس کے نقصانات کو محدود کرنے کے انتظامات دستیاب ہوں۔اندرون نقل ملک مکانی پر اقوام متحدہ کے رہنما اصولوں کو ملکی قانون و پالیسی کا حصہ بنایا جائے۔

☆ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دی جانے والی امداد کی منصوبہ بندی متاثرہ کمیونٹیوں کی مشاورت سے اور جامع و منظّم انداز میں ہونی چاہیے تاکہ انفراسٹرکچر کی تعمیر نو اور بے دخل لوگوں کی پائیدار وطن واپسی کو یقینی بنایا جا سکے۔آئی ڈی پیز کو متاثر کرنے والے تمام فیصلے، بشمول اُن کی اپنے گھروں کو واپسی کا فیصلہ، اُن کی مشاورت سے کیے جائیں۔آئی ڈی پیز کے اندر نسبتاً زیادہ غیر محفوظ طبقوں کی آراء پر خاص توجہ دی جائے اور اُن کے تحفظات دور کیے جائیں،

☆ 1971 سے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی بے وطنی کی کیفیت کا مداوا کیا جائے۔ پھنسے ہوئے تمام افراد کی منشاء معلوم کی جائے اور جو پاکستان کے شہری بننا چاہیں اُنہیں بغیر کسی تاخیر کے پاکستان واپس لایا جائے۔

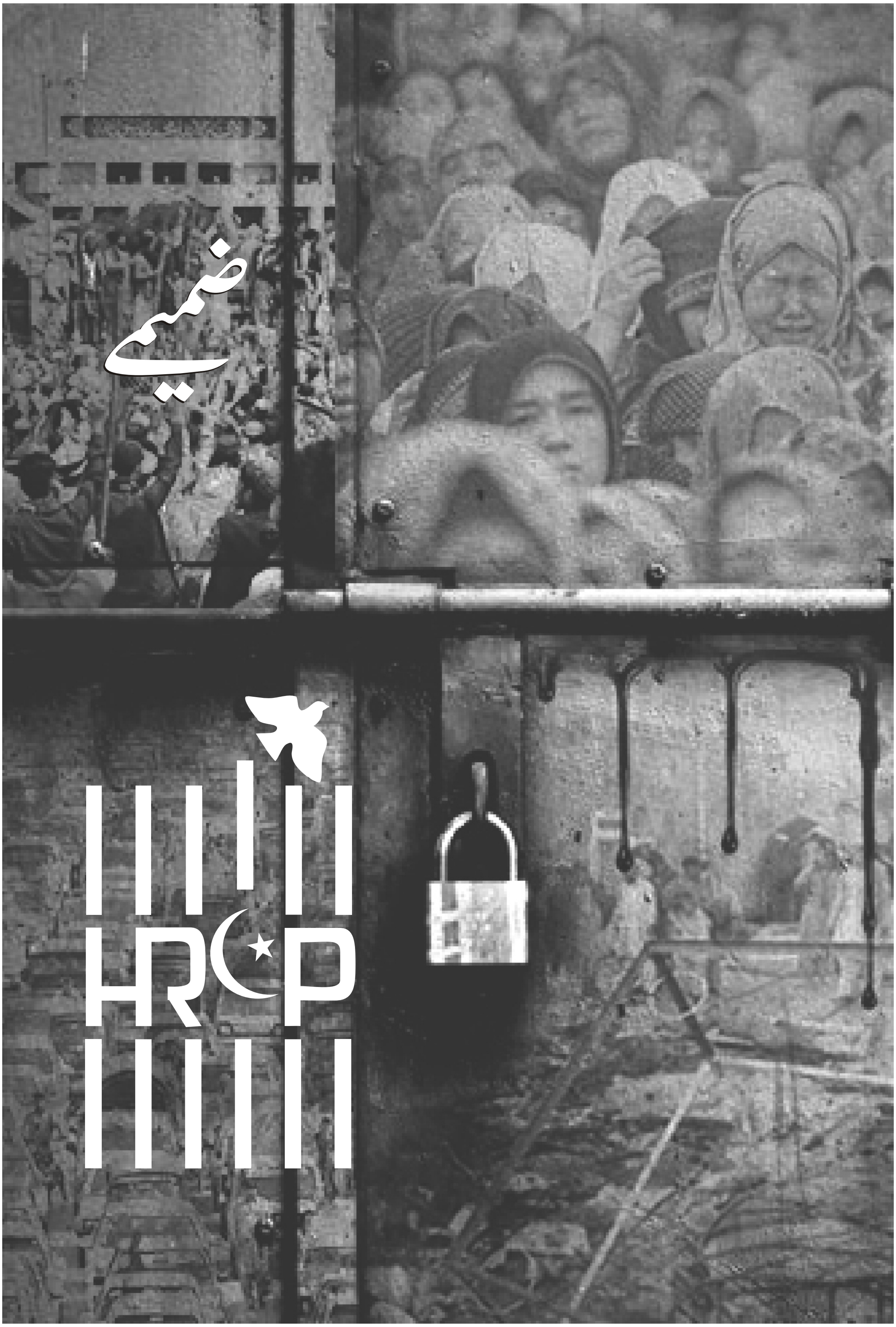
ضمیمے
HRCP

ضمیمہ - 1

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں

ایچ آر سی پی نے 2016ء میں انسانی حقوق کی صورتحال پر نظر رکھنے اور اسے قلمبند کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ذرائع ابلاغ میں بیانات جاری کر کے اپنی رپورٹس کے اجراء اور حکام کے ساتھ رابطہ سازی کے ذریعے اپنی آراء اور تحفظات کو اجاگر کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

2016ء کے دوران ایچ آر سی پی کی بنیادی سرگرمیاں درج ذیل تھیں: i۔ مردم شماری کے معاملے پر ورکشاپ، ii۔ خواتین کے جائیداد کے حق پر ورکشاپ، iii۔ چاروں صوبوں میں چار ورکشاپس جن کا مقصد خواتین کو مقامی حکومت کے معاملات میں حصہ لینے کی ترغیب دینا تھا، iv۔ فرقہ واریت پر قابو پانے کی حکمت عملی کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لیے ایچ آر سی پی کا غیر محفوظ طبقات پر ماہرین کے گروپ کا اجلاس، v۔ مذہب سے متعلقہ جرائم پر ایچ آر سی پی کا پیشہ ور ماہرین کے ساتھ اجلاس، vi۔ بچوں سے مشقت پر ورکشاپ، vii۔ کان کنی سے متعلق کام کے حالات، جبری مشقت، معاوضہ جات اور صحت کو درپیش خطرات پر قومی سطح کی مشاورت، viii۔ اندرون ملک نقل مکانی پر قانونی ڈھانچہ وضع کرنے کی ضرورت پر مشاورت، ix۔ فاٹا اصلاحات پر مشاورت، x۔ جی ایس پی + پر اور انسانی حقوق کے فروغ پر کاروباری حلقوں کے ساتھ اجلاس، xi۔ گلگت بلتستان کے لیے فیکٹ فائنڈنگ مشن، xii۔ بلوچستان میں حقوق کی صورتحال کے جائزے کے لیے فیکٹ فائنڈنگ مشن، xiii اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے لوگوں کے مسائل پر مشاورت، xiv۔ اقلیتوں کے نمائندوں کے ساتھ ورکشاپ تا کہ ان کے مذہبی مقامات کے تحفظ کے انتظامات پر سوچ و بچار کی جائے۔ حال ہی میں منظور ہونے والے سائبر قانون کی وجہ سے یا اس کے نتیجے میں جن مشکلات، پابندیوں اور آئینی حقوق کی خلاف ورزیوں نے جنم لیا، وہ بھی ایچ آر سی پی کی توجہ کا مرکز بنیں۔

ایچ آر سی پی کے چیپٹرز نے انسانی حقوق کے اہم دنوں پر ملک کے مختلف علاقوں میں مہموں اور ریلیوں کا اہتمام کیا۔ پاکستان بھر میں قائم ایچ آر سی پی کے چیپٹر دفاتر نے ایذا رسانی کے خلاف میثاق (کیٹ) کے نفاذ کے لیے ایک مہم چلائی۔ اس حوالے سے پرامن احتجاج

مظاہروں اور مشاورتی تقریبات کا بھی اہتمام کیا گیا۔ بنام صدر پاکستان ایک پوسٹ کارڈ تقسیم کیا گیا جس پر کیٹ سے متعلقہ سات مطالبات درج تھے۔

ایچ آر سی پی کے دفاتر نے سیمینارز اور احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا جن میں جبری گمشدگیوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایچ آر سی پی کے دفاتر نے ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کئے اور صدر پاکستان کے نام لکھے گئے پوسٹ کارڈ تقسیم کئے جن میں سزائے موت کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور سزائے موت کے مکمل خاتمے تک پھانسیوں پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی نے انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے لاہور میں 'اظہار رائے کی آزادی کے حق کے بغیر تمام حقوق بے معنی ہیں'' کے عنوان سے ایک کانفرنس منعقد کی جس کے بعد ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ ایچ آر سی پی کے چیپٹر اور ٹاسک فورس دفاتر نے انسانی حقوق کے معاملات اجاگر کرنے کے لیے ریلیاں نکالیں، شمعیں روشن کیں اور اجلاس منعقد کئے۔ کمیشن نے اقلیتی برادریوں کے لوگوں کو درپیش عام قانونی مسائل پر بھی بروشر تیار کئے اور ان کی تشہیر کی۔ مذہبی اقلیتوں کے اُن پچاس افراد کو قانونی امداد مہیا کی گئی جنھیں ان کے عقیدے کے باعث مشکلات درپیش تھیں۔ کمیشن نے ریڈیو اور ویب ٹی وی کے ذریعے انسانی حقوق سے متعلقہ پیغامات اور پروگرام نشر کئے۔

2016ء کے دوران ایچ آر سی پی کی اہم سرگرمیوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ورکشاپس/سیمینارز/اجلاس

4، جنوری حیدرآباد: ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے مذہبی انتہاپسندی پر لیکچر دیا۔

12 جنوری، ملتان: مخدوم رشید، ضلع ملتان میں بھٹہ مزدوروں اور بھٹہ مالکان کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں بھٹہ مزدوروں کے حقوق کے بارے میں آگاہی دی گئی۔

20 جنوری، کراچی: گورنمنٹ پرائمری وسیکنڈری سکول ہاکس بے میں انسانی حقوق کے عالمی منشور (یوڈی ایچ آر) پر ایک اجلاس

22-21 جنوری، لاہور: پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا)، پاکستان براڈ کاسٹرز ایسوسی ایشن (پی بی اے)، پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل (سی پی این ای)، آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (اے پی این ایس) پریس کونسل و پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (پی ایف یو جے) سمیت ذرائع ابلاغ کے بڑے اداروں کے ساتھ ایک

7 مارچ، 2016ء کو اسلام آباد میں 'عوامی زندگی میں خواتین: رکاوٹوں کا خاتمہ' کے عنوان سے کانفرنس

مشاورت۔ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے عقیدے کی بنیاد پر نفرت انگیز تقاریر پر قابو پانے کے لیے مروجہ اصول وضوابط کا جائزہ لینا مشاورت کا مقصد تھا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے نفرت انگیز تقریر پر قابو پانے کے لیے ایک مثالی ضابطہ اخلاق وضع کرنے کے لیے بھی سوچ بچار کی گئی۔

25 جنوری، حیدرآباد: خواجہ سراؤں اور فنکاروں کے ساتھ ایک اجلاس۔

فروری۔ستمبر، کراچی: خواتین اور خودمختاری کے موضوع پر سیمینار کے سلسلے سے 9 سیمینارز کا اہتمام۔

18 فروری، کراچی: یوسف آباد فیز 1، سیکٹر A-7، سرجانی ٹاؤن میں نایاب میموریل

اسکول میں یوڈی ایچ آر پر نشست

22 فروری، کراچی: ایچ، بی سیکٹر 4۔اے، سرجانی ٹاؤن میں ہائی سکینڈری سکول میں یوڈی ایچ آر پر ایک نشست

26 فروری، کراچی: طالب علموں کو انسانی حقوق کی تعلیم دینے کے لیے سہولت کاروں کی تربیت۔

26 فروری، اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے اراکین کا اجلاس اور کچی آبادیوں پر تبادلہ خیال۔

یکم مارچ، کراچی: ایس آر۔26، آر 55، سیکٹر سی، سرجانی ٹاؤن میں زبیر پبلک اسکول میں یوڈی ایچ آر پر ایک نشست

7 مارچ، اسلام آباد: خواتین کا عالمی دن منانے کے لیے ذرائع ابلاغ پر تین روزہ مہم

7 مارچ، اسلام آباد: 'عوامی زندگی میں خواتین: رکاوٹوں کا خاتمہ' کے موضوع پر کانفرنس

5 مارچ، ملتان: خواتین کے عالمی دن پر سیمینار

8 مارچ، گلگت: انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق پر ایچ آر سی پی کی رپورٹس کی نمائش

11 مارچ: خواتین کے عالمی دن پر ورکشاپ

یکم اپریل، اسلام آباد: سالانہ رپورٹ '2015ء میں انسانی حقوق کی صورتحال کی رونمائی'

اپریل، اسلام آباد: جنوبی پنجاب کے ضلعی مانیٹرز کی استعداد سازی کی ورکشاپ

17 اپریل، کراچی: ایچ آر سی پی کے بلوچستان اور اندرون سندھ کے مانیٹرز کی تربیت۔ انہیں اپنے اضلاع میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور جرائم کی محفوظ طریقے سے مانیٹرنگ کی تدابیر بتائی گئیں۔

10-9 اپریل، مورو؛ انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت اقدار کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

11 اپریل، اسلام آباد: انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی محفوظ طریقے سے مانیٹرنگ کرنے اور انہیں قلمبند کرنے کے حوالے سے ایچ آر سی پی کے ضلعی مانیٹرز کی تربیت

12-11 اپریل، ہالہ: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

15-14، گھوٹکی: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر دو روزہ ورتربیتی ورکشاپ

خیبر پختونخوا اور فاٹا کے لوگوں کے سماجی۔معاشی اور سیاسی مسائل:
''اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد (آئی ڈی پیز) منصفانہ و جمہوری حل کی تلاش'' پر مشاورت

18-17، کشمور: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

17 اپریل، کوئٹہ: سی پیک اور بلوچستان کے عوام پر ایک اجلاس

27 اپریل، حیدرآباد: اغوا کی گئی لڑکی کی بازیابی کے لیے ریلی

30-29 اپریل، وڈھ: سردار منیر مینگل ہائی سکول، وڈھ میں تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ ورکشاپ

29 اپریل، اسلام آباد: گھریلو تشدد پر تبادلہ خیال

30 اپریل، حیدرآباد: کپاس کی چنائی کرنے والی دیہی خواتین کے حقوق پر مکالمہ

2-1 مئی، سوراب: سوشل ویلفیئر ہال سوراب میں تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

3 مئی، ملتان: مزدوروں کے حقوق پر مکالمہ

4 مئی، حیدرآباد: اراضی کے حقوق اوراراضی پر قبضہ کے موضوع پر مقالہ

7 مئی، ملتان: انسانی حقوق کے محافظ راشد رحمان کے قتل کی دوسری برسی پر سیمینار

8-7 مئی، بانڈہ داؤدشاہ، کرک: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

11-10، ٹوپی، صوابی: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

4-13 مئی، غلانئی، مہمند ایجنسی: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

14 مئی، حیدرآباد: بزرگ شہریوں کے ویلفیئر بل 2016ء پر اجلاس

17-16 مئی، مٹہ، سوات: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

20-19 مئی، حویلیاں، ایبٹ آباد: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

20-19 مئی، لاہور: اقلیتی برادریوں کے نمائندوں کے ساتھ دو روزہ تربیتی ورکشاپ۔ ورکشاپ کا مقصد ان کے اہم مذہبی مقامات کے تحفظ کے لیے حکمت عملی وضع کرنا تھا۔

20 مئی، کوئٹہ: سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے؟' کے عنوان پر تقریری مقابلہ

21 مئی، کوئٹہ: یونیورسٹی آف بلوچستان میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے؟' کے عنوان پر تقریری مقابلہ

30 مئی، گلگت: جی بی میں برسرروزگار خواتین کے لیے کام کی فضا سازگار بنانے کے لیے آگاہی دی گئی۔

’ایذا رسانی یا دیگر ظالمانہ، غیر انسانی یا تضحیک آمیز سلوک یا سزا کے خلاف اقوام متحدہ کی کمیٹی کے ساتھ
سول سوسائٹی کی تنظیموں کی شراکت کیسے قائم کی جائے‘ کے عنوان پر تبادلہ خیال

30 مئی، حیدر آباد: شعبہ تعمیرات میں غیر رسمی مزدوروں کی حالت پر گفتگو

2 جون، ملتان: پینے کے پانی پر تبادلہ خیال

2 جون، کراچی: کام کے مقام پر مزدوروں کی صحت اور تحفظ پر ورکشاپ

2 جون، پشاور: خیبر پختونخوا میں مقامی حکومت کا نظام: ایک جائزہ

3 جون، گلگت: قراقرم بین الاقوامی یونیورسٹی، گلگت میں ’کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے؟‘ کے عنوان پر تقریری مقابلہ

4 جون، کوئٹہ: سیاست میں بلوچستان کے نوجوانوں کا کردار پر سیمینار

6-5 جون، گلگت: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

5 جون، حیدر آباد: ماحول کے عالمی دن پر سیمینار

12 جون، ہنزہ: ’’انسانی حقوق، جمہوریت اور امن‘‘ پر بالائی ہنزہ کے نوجوانوں کے لیے ایک آگہی اجلاس

16 جون، اسلام آباد: پاکستان میں گھریلو چائلڈ لیبر پر مشاورت

22 جون، حیدر آباد: کسان رہنما مائی بختاور کی یاد میں تقریب

24 جون، اسلام آباد: ایذارسانی کے خلاف میثاق پر ریاستی عملدرآمد کا جائزہ

27 جون، کوئٹہ: ایذارسانی کے متاثرین کے عالمی دن پر مشاورت

28 جون، کراچی: اپنے عقیدے کے باعث غیر محفوظ کمیونٹیوں پر پیشہ ور ماہرین کا اجلاس

18 جولائی، لاہور: مقامی حکومتوں کے قانون وترامیم کے اثرات کا جائزہ، پر تربیتی ورکشاپ

19 جولائی، لاہور: خواتین کو مقامی حکومتوں کے معاملات میں حصہ لینے کی ترغیب، پر ورکشاپ

21-22 جولائی، کراچی: سندھ میں مقامی حکومتوں کے قانون وترامیم کے اثرات کا جائزہ، اور مقامی حکومتوں کے معاملات میں خواتین کی شمولیت بڑھانے کے طریقہ کار، پر ورکشاپ

23 جولائی، اسلام آباد: مردم شماری پر قومی مشاورت

25 جولائی، اسلام آباد: سائبر کرائم بل پر مشاورت

26 جولائی، پشاور: خیبر پختونخوا میں مقامی حکومت کے قوانین: ایک جائزہ

27 جولائی، پشاور: مقامی حکومتوں کے معاملات میں خواتین کی شمولیت کی حوصلہ افزائی کے لیے ورکشاپ

28 جولائی کراچی: سماجی کارکن عبدالستار ایدھی کو خراج تحسین

29 جولائی، کراچی: آرٹ کونسل کراچی میں معروف سیاستدان اور مزدور رہنما معراج محمد خان کی یاد میں تعزیتی اجلاس

29 جولائی، کوئٹہ: مقامی حکومتوں کے معاملات میں خواتین کی شمولیت کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک ورکشاپ

30 جولائی، کوئٹہ: بلوچستان میں مقامی حکومت کے قانون کا جائزہ اور ترامیم کے اثرات پر ورکشاپ

5 اگست، کراچی: انسانی حقوق کے اہم معاملات کے قانونی پہلوؤں کی آگاہی

12 اگست، تربت: برداشت وامن پر سیمینار

14 اگست، اسلام آباد: بچوں سے مشقت پر تبادلہ خیال

21-22 اگست، ٹھٹھہ: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ

25-24 اگست، سجاول: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا

باچا خان یونیورسٹی چارسدہ میں 'انسانیت دوست اقدار کا فروغ' پر ایک ورکشاپ

فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

26-27 اگست، خیرپور ناتھن شاہ: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

30 اگست، کوئٹہ: جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے ساتھ یک جہتی کے عالمی دن پر مشاورتی تقریب

30 اگست، گلگت: جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے ساتھ یک جہتی کے عالمی دن پر مشاورتی تقریب

10 اکتوبر، پشاور: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر مشاورت

11 اکتوبر، مکران: انتہاپسندی اور انسانی حقوق پر ورکشاپ

18 اکتوبر، چارسدہ: باچا خان یونیورسٹی میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

19-20 اکتوبر، چارسدہ: باچا خان یونیورسٹی میں 'انسانیت دوست اقدار کے فروغ' پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

12 اکتوبر، اسلام آباد: 'اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد (آئی ڈی پیز) مسئلے کا منصفانہ وجمہوری حل' پر مشاورت

24 اکتوبر، پشاور: باچا خان ایجوکیشن ٹرسٹ سکول، نوتھیا پشاور میں ایک ورکشاپ کا انعقاد۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالب علموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرنا تھا۔

25 اکتوبر، پشاور: باچا خان ایجوکیشن ٹرسٹ سکول متھرا پشاور میں ایک ورکشاپ کا انعقاد۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرنا تھا۔

26 اکتوبر، مانسہرہ: اختر میموریل پبلک ہائی سکول، مانسہرہ میں ایک ورکشاپ کا انعقاد۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرانا تھا۔

27 اکتوبر، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ: سرسید پبلک سکول اکوڑہ خٹک، نوشہرہ میں ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرانا تھا۔

27 اکتوبر، ابا کنٹر، بالائی دیر: ہیرا پبلک سکول ابا کنٹر، بالائی دیر میں ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرانا تھا۔

27 اکتوبر، ایبٹ آباد: برائٹ ہال ایجوکیشن سسٹم ایبٹ آباد میں ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں سے روشناس کرانا تھا۔

27 اکتوبر، ٹوبہ ٹیک سنگھ: یسوع مسیح و مریم اسکول میں طالبعلموں کو جمہوریت اور انسانی حقوق سے متعلق آگاہی دی گئی۔

28 اکتوبر، پشاور: اکادمی برائے جدید علوم، پلوسی، پشاور میں ایک ورکشاپ کا انعقاد۔ اس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں کے طالب علموں کو انسانی حقوق اور جمہوریت کے اصولوں سے روشناس کروانا تھا۔

28 اکتوبر، مانسہرہ: ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیئے' کے موضوع پر تقریری مقابلہ۔

شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور میں تقریری مقابلہ

29 اکتوبر، چارسدہ:لیڈیز انگلش میڈیکل سکول سرڈھیری، مانسہرہ میں ایک ورکشاپ۔جس کا مقصد ساتویں اور آٹھویں کے طالبعلموں کو انسانی حقوق اور جمہوریت کے اصولوں سے روشناس کروانا تھا۔

9-8 اکتوبر، پنجگور: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

10 اکتوبر، پشاور: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر اجلاس

10 اکتوبر، کوئٹہ: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر مشاورت

12-11 اکتوبر، تربت: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

15-14 اکتوبر، خضدار: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

19-18 اکتوبر، تفتان: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

21 اکتوبر، ملتان: بچوں کی مشقت کے قوانین پر مکالمہ

22-21 اکتوبر، ماشخیل: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم، پر دو

روزہ تربیتی ورکشاپ

24 اکتوبر، پشاور: باچاخان سکول نوتھیا میں زیر تعلیم بچوں کو انسانی حقوق اور جمہوریت کے اصولوں سے روشناس کروانے کے لیے پروگرام کا انعقاد

7 اکتوبر، کراچی: مقامی حکومت فرقہ واریت سے کس طرح نپٹ سکتی ہے، پر مکالمہ

10 اکتوبر، گلگت: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر مشاورت

13 اکتوبر گلگت: قائداعظم سکول و کالج گھاہ کوچ، غذر میں ایک مختصر کوئز مقابلہ

15-14 اکتوبر، حیدر آباد: کسانوں اور مزدوروں کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے جبری مشقت کے قوانین اور حقوق پر ورکشاپ

16-17 اکتوبر، حیدر آباد: مقامی حکومت میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی پر ورکشاپ

17 اکتوبر، گلگت: علیسین ہائیر سکینڈری سکول دنیور، گلگت میں ایک مختصر کوئز مقابلہ

29 اکتوبر، 2 دسمبر، کراچی: فلم کی اسکریننگ

31 اکتوبر، حیدر آباد: سیاسی عمل میں خواتین کی شمولیت، پر ورکشاپ

2 نومبر، خیر پور: شاہ عبداللطیف یونیورسٹی میں کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے، کے موضوع پر تقریری مقابلہ

4 نومبر، قلات: گورنمنٹ بوائز ہائی سکول مغلزل، قلات میں ایک مختصر کوئز مقابلہ۔ اس کا مقصد سکول میں زیر تعلیم بچوں کو انسانی حقوق سے آگاہ کرنا تھا۔

5 نومبر، بولان: گورنمنٹ بوائز ماڈل سکول بولان میں کوئز کا مقابلہ

8 نومبر، کلی شرف آباد: گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں کوئز کا مقابلہ

8 نومبر، بہاولپور: اسلامیہ یونیورسٹی میں ''کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہئے'' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

10 نومبر، راولپنڈی: ایرڈ زرعی یونیورسٹی میں ''کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے'' پر تقریری مقابلہ

10 نومبر، نصیر آباد: گورنمنٹ بوائز ہائی سکول شوری داتا نصیر آباد میں کوئز کا مقابلہ

11 نومبر، اسلام آباد: قائداعظم یونیورسٹی میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیئے' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

انسانی حقوق پر مشتمل سوال وجواب کے مقابلے کے شرکاء

12-11 نومبر، حیدرآباد: مقامی حکومتوں میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی پر ورکشاپ

12 نومبر، حیدرآباد: ''دیہی سندھ میں جرائم اور حکومتی عملداری' پر گفتگو

13 نومبر، حیدرآباد: مصنفین ودانشور فورم کے تعاون سے ''ورثہ بچاؤ، تاریخ بچاؤ' کے بینر تلے جام شورو کے نزدیک ایک ثقافتی مقام کا دورہ کیا گیا

14 نومبر، باغبانہ: گورنمنٹ ہائی سکول میں کوئز کا مقابلہ

15 نومبر، کلی سیف امر: گورنمنٹ بوائز ہائی سکول میں کوئز کا مقابلہ

16 نومبر، کچی باغ: گورنمنٹ ماڈل سکول میں کوئز کا مقابلہ

17 نومبر، کوئٹہ: بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ وٹیکنالوجی و مینجمنٹ سائنسز میں ''کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

18 نومبر، چارسدہ: باچا خان یونیورسٹی میں ''کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے'' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

18 نومبر، کلی یعقوب: گورنمنٹ گرلز ماڈل سکول میں کوئز کا مقابلہ

19 نومبر، جام پور: الہدا پبلک سکول میں جمہوریت وانسانی حقوق کی آگہی پر کوئز کا مقابلہ

19 نومبر، منڈی بہاؤالدین: اقراء پبلک ہائی سکول میں جمہوریت وانسانی حقوق کی آگہی پر کوئز مقابلہ

20-19 نومبر چارسدہ: تکثیری اقتدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر ورکشاپ

24-23 نومبر قلعہ سیف اللہ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر ورکشاپ

25 نومبر، بشور: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دو روزہ تربیتی ورکشاپ

28 نومبر، چمن: کلی روزی خان، عزیز آباد، چمن میں گورنمنٹ بوائز سکول میں کوئز کا مقابلہ

29-28 نومبر، نوشکی: تکثیری اقدار کے فروغ کے لیے انسانی حقوق کی تعلیم پر دور روزہ ورکشاپ

29-28 نومبر، ملتان: ٹاسک فورس نے لاہور دفتر میں استعداد سازی کی سالانہ ورکشاپ میں شرکت کی۔

29 نومبر، ٹنڈو جام: سندھ زرعی یونیورسٹی میں ''کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے'' کے موضوع پر تقریری مقابلہ

2 دسمبر، کراچی: سیاست میں خواتین کی شمولیت کے حوالے سے گفت وشنید

5 دسمبر، کوئٹہ: 'سی پیک اور بلوچستان کے عوام' کے حوالے سے گفت وشنید

9-5 دسمبر، اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے جنوبی پنجاب، فاٹا، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے ڈسٹرکٹ مانیٹرز کی تربیتی ورکشاپ

6 دسمبر، اسلام آباد: سول سوسائٹی کی تنظیموں کا ایذا رسانی، اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی یا

بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورتحال پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

ایذارسانی کے متاثرین کی حمایت میں ریلی

تضحیک آمیز سلوک یا سزا (کیٹ) کے خلاف اقوام متحدہ کی کمیٹی کے ساتھ مل کر کس طرح کام کیا جاسکتا ہے، کے حوالے سے سیمینار کا اہتمام

8 دسمبر، کراچی: ایک ذہنی مریض کی سزائے موت برقرار رکھنے کے عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر بحث کی گئی۔

9-8 دسمبر، عارف والا: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

10 دسمبر، لاہور: انسانی حقوق کے عالمی دن پر مباحثہ

13-12 دسمبر، لاہور: صوبہ پنجاب میں مقامی حکومت کے انتخابات میں مخصوص نشستوں پر منتخب مذہبی اقلیتی اراکین کی تربیتی ورکشاپ

14-13 دسمبر، چیچہ وطنی: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کے فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ جس میں صحافیوں، مزدور رہنماؤں، وکلاء اور طالب علموں نے شرکت کی۔

16-15 دسمبر، پاکپتن: انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے انسانیت دوست اقدار کے فروغ پر دوروزہ تربیتی ورکشاپ جس میں صحافیوں، مزدور رہنماؤں، وکلاء اور طالب علموں نے شرکت کی۔

16 دسمبر، حیدرآباد: منتخب خواتین کونسلرز کی ورکشاپ

16 دسمبر، مظفر گڑھ: 'خواتین کے خلاف تشدد' پر مکالمہ

15 دسمبر، جھنگ: چناب کالج میں جمہوریت وانسانی حقوق کے متعلق سوالات وجوابات کا مقابلہ۔ 50 طالبعلموں نے پروگرام میں شرکت کی۔

19 دسمبر، کراچی: محمد علی جناح یونیورسٹی میں 'کیا انسانی حقوق کی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے' پر تقریری مقابلہ

20-19 دسمبر، کراچی: ایچ آر سی پی۔ آئی سی جے کے پراجیکٹ کے تحت ایک تربیتی ورکشاپ جس میں سندھ اور بلوچستان سے لوگ شریک ہوئے۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن

15 جنوری، حیدرآباد: بدین کی کوہلی برادری کی جبری بے دخلی پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

10 مارچ، لاڑکانہ: 13 سالہ لڑکی کا لاڑکانہ کے مراد پندرانی اور شال کھوسو کے ہاتھوں جنسی زیادتی پر فیکٹ فائنڈنگ مشن۔

15 اپریل، ملتان: ایک لڑکی کے قتل پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

19 اپریل، ملتان: پولیس اہلکاروں کے ہاتھوں ایک لڑکی کی عصمت دری پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

30 اپریل، اوکاڑہ: مزارعوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعہ پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

یکم اپریل، کراچی: سٹی اسٹیشن اور کینٹ اسٹیشن پر قلیوں کے حالات پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

3 مئی، حیدرآباد: ایڈووکیٹ کبیر انصاری کے معاملے پر فیکٹ فائنڈنگ مشن جنہیں بعض نامعلوم افراد نے مارا پیٹا اور بعدازاں ٹال پلازہ، جام شورو کے نزدیک ایک گاڑی سے شدید زخمی حالت میں پھینک دیا تھا۔

21 مئی، منڈی بہاؤالدین: گاؤں 44 میں مبینہ توہین مذہب کے واقعے کے بارے میں حقائق معلوم کرنے کے لیے فیکٹ فائنڈنگ مشن

مئی۔ جون، کراچی: جنسی تشدد کے الزام کی چھان بین کے لیے فیکٹ فائنڈنگ مشن

مئی، کراچی: کورنگی کے صنعتی علاقے میں ایک زیرزمین تالاب کی صفائی کے دوران بعض مزدور زہریلی گیس کے باعث موت کا شکار ہوئے۔ واقعے کی چھان بین کے لیے فیکٹ

فائنڈنگ مشن قائم کیا گیا۔

جولائی، کراچی: کولڈ سٹوریج مزدوروں کی ہلاکت پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

29 جولائی، ملتان: ماڈل قندیل بلوچ کی 'عزت' کے نام پر قتل کے واقعے پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

19-6 اگست، گلگت: انسانی حقوق کی کارکن عاصمہ جہانگیر کی قیادت میں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے گلگت کا دورہ کیا۔ مشن نے گلگت اور ہنزہ میں مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملاقات کی۔

3 ستمبر، لاہور: سرگودھا میں ایک این جی او کے دفتر کو زبردستی بند کروائے جانے کے واقعے پر فیکٹ فائنڈنگ مشن

5-3 نومبر، ملتان: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے مختاراں مائی ویمن آرگنائزیشن کی سربراہ مختاراں مائی کے ہمراہ ایذا رسانی کے متاثرہ فرد سے ملاقات کی۔

7 نومبر، اسلام آباد: صفدر چوہدری کی قیادت میں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے روات پولیس اسٹیشن اور گردہ مرکز مورگاہ راولپنڈی کا دورہ کیا۔ دورے کا مقصد پاکستان اور دیگر ممالک میں گردوں کی فروخت کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا۔

17 نومبر، لیہ: ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے پولیس تشدد کے ایک واقعے کے متعلق تفصیلات جاننے کے لیے لیہ کا دورہ کیا۔

30 دسمبر، کوئٹہ: ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورتحال معلوم کرنے کے لیے کوئٹہ کا دورہ کیا۔

مظاہرے/ ریلیاں/ دورے

26 جنوری، کراچی: غیر قانونی حراستوں کے خلاف ریلی

29 جنوری، حیدرآباد: جبری مشقت کے مزدوروں کے تحفظ کے لیے ریلی

6 فروری، کراچی: پی آئی اے کے ملازمین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے ریلی

6 فروری، حیدرآباد: پی آئی اے کے ایک ملازم کی ہلاکت کے خلاف ریلی

16 فروری، حیدرآباد: زراعت اور بھٹہ کی صنعت کے جبری مزدوروں کے حقوق کے لیے ریلی

16فروری، اسلام آباد: 2013ء میں کوئٹہ میں بم دھماکے میں مارے جانے والے ہزارہ برادری کے 150 افراد کی یاد میں شمعیں روشن کی گئیں۔

7مارچ، حیدرآباد: خواتین کے حقوق کے لیے ریلی

17اپریل، حیدرآباد: کسانوں کے عالمی دن پر ریلی

28اپریل، حیدرآباد: سندھ میں جبری گمشدگیوں کے خلاف ریلی

6مئی، سکھر: 'عزت' کے نام قتل کے خلاف ریلی

7مئی، حیدرآباد: 14 سالہ ہندو لڑکی لیلن جوگی کی بازیابی کے لیے دھرنا

11مئی، اسلام آباد: انسانی حقوق کے کارکن خرم ذکی کی یاد میں شمعیں روشن کی گئیں۔

7جون، حیدرآباد: انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متاثرین کو انصاف دلانے کے لیے بھوک ہڑتال

21جون، حیدرآباد: جے وانتی نامی لڑکی کی بازیابی کے لیے ریلی

26جون، پشاور: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یک جہتی کے عالمی دن پر ریلی

27جون، اسلام آباد: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی

27جون، حیدرآباد: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی

27جون، ملتان: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی

27جون، گلگت: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی

27جون، سکھر: ایذارسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی

29جولائی، حیدرآباد: کسان رہنما ویرو کولہی کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے دھرنا

9اگست، حیدرآباد: مقامی لوگوں کے عالمی دن کی یاد میں ریلی

12اگست: حیدرآباد: کوئٹہ میں وکیلوں کے قتل عام کے خلاف ریلی

30اگست، سکھر: جبری گمشدگیوں کے خلاف عالمی دن پر ریلی

30اگست، لاہور: جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے ریلی

30اگست، لاہور: جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے ریلی

30اگست، حیدرآباد: جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے عالمی دن پر مظاہرہ

30اگست، اسلام آباد: جبری و غیر رضا کارانہ گمشدگیوں کے متاثرین کے عالمی دن کو

منانے کے لیے احتجاجی مظاہرہ

30 اگست، پشاور: جبری وغیر رضا کارانہ گمشدگیوں کے متاثرین کے عالمی دن کو منانے کے لیے احتجاجی مظاہرہ

10 اکتوبر، اسلام آباد: سزائے موت کے خلاف ریلی

10 اکتوبر، لاہور: سزائے موت کے خاتمے کے لیے ریلی

10 اکتوبر، ملتان: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر ریلی

10 اکتوبر، حیدرآباد: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے لیے ریلی

17 اکتوبر، گلگت: سفید چھڑی کے تحفظ کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی

16 نومبر، حیدرآباد: گڈانی شپ یارڈ میں آگ کے واقعے سے متاثر ہونے والوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے ریلی۔

9 دسمبر، اسلام آباد: انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی

10 دسمبر، ملتان: انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی

10 دسمبر، پشاور: انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی

12 دسمبر، حیدرآباد: انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی۔

شکایات مرکز

ایچ آر سی پی کو 2016ء کے دوران پولیس/انتظامیہ کی زیادتیوں، خواتین کے حقوق کی خلاف ورزیوں اور گھریلو تشدد کی 1500 شکایات موصول ہوئیں۔ شکایات کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان پاکستانیوں کی تھی جو بیرون ممالک میں مقیم تھے۔

انٹرن شپ پروگرام

پاکستان سے اور بیرون ممالک سے 9 انٹرن نے 2016 کے موسم گرما میں ایچ آر سی پی کے انٹرن شپ پروگرام میں شرکت کی۔ انٹرن، ان کے ادارے اور ان کی تحقیق کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

☆ جمال علی مگسی: یونیورسٹی آف اوزنبروک، جرمنی۔ 'جعفرآباد، بلوچستان میں غیر رسمی قانونی نظام اور ''غیرت کے نام پر قتل''۔

☆ عاصمہ پراچہ: نیویارک یونیورسٹی۔'پاکستان میں انسداد دہشت گردی نظام کے مسائل'

☆ خدیجہ طاہر: لاہور گرامر سکول: ایچ آر سی پی نے پاکستان کے جن 60 اضلاع میں 2015،2014 اور 2016ء میں انسانی حقوق کی جن خلاف ورزیوں کو قلمبند کیا، ان کے اعداد وشمار کا اندراج

☆ امیرہ محمود: کنیئرڈ کالج: احمدیوں، مسیحیوں، ہندوؤں، پارسیوں، سکھوں، شیعوں اور دیگر اقلیتی گروہوں کے مزارات، جائے عبادات، املاک اور زندگیوں پر حملوں کی نوعیت اور تواتر کے متعلق ذرائع ابلاغ میں نشر ہونے/ چھپنے والی اطلاعات کی مانیٹرنگ۔

☆ تسکین زہرہ: کنیئرڈ کالج: نفرت انگیز تقریر کے حوالے سے ذرائع ابلاغ کے رویے کی مانیٹرنگ

☆ ہبہ عاصم، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز: ہندوؤں، مسیحیوں اور دیگر اقلیتی گروہوں کے لوگوں خاص طور پر خواتین کے مذہب کی جبری تبدیلی کی نوعیت اور تواتر کے متعلق ذرائع ابلاغ میں نشر ہونے/ چھپنے والی اطلاعات کی مانیٹرنگ

☆ محمد غازی عابد: لاہور سکول آف اکنامکس: ملک بھر کے مرکزی پرنٹ والیکٹرانک میڈیا میں تمام زبانوں میں تکفیری فکر، مذہبی رواداری اور بین العقائد ہم آہنگی کی مثالوں کی میڈیا مانیٹرنگ

☆ حسن مسعود، لاہور سکول آف اکنامکس: نفرت انگیز تقریر کے متعلق ذرائع ابلاغ کے رویے کی مانیٹرنگ

☆ مصباح اسلام، ایف سی کالج: ایچ آر سی پی کے سالانہ عمومی اجلاس کے سیمینار کی تحریری رپورٹ کی تیاری

اشاعتیں

ایچ آر سی پی نے 2016ء میں درج ذیل رپورٹس شائع کیں۔

☆ ایچ آر سی پی کی سالانہ رپورٹ: 2015ء میں انسانی حقوق کی صورتحال (انگریزی/اردو)

☆ جہدِ حق: 12 ماہانہ شمارے (انگریزی/اردو)

☆ انسانی حقوق کا عالمی نظام (اردو)

☆ اقلیتیں حملوں کی زد میں (اردو)

☆ گلگت بلتستان: ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ (انگریزی)

☆ گڈانی کا سانحہ: ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ (انگریزی)

ریڈیو نشریات

ایچ آر سی پی نے 2015ء میں پاکستان کے 9 ریڈیو اسٹیشنوں سے اپنی نشریات کا آغاز کیا تھا۔ جنوری 2016ء میں یہ دائرہ ملک بھر میں 25 ریڈیو اسٹیشنوں تک پھیل گیا۔ ایچ آر سی پی نے 2016ء میں انسانی حقوق، امن، رواداری، ماحول اور جمہوریت پر ایک ڈرامہ، 40 کہانیاں، 24 پروگرام، 5 ڈاکومنٹریاں، مکالمے کے دس پروگرام اور دو سنگیت نشر کر کے سماج میں شعور پھیلانے اور انسانی حقوق کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ویب ٹی وی

ایچ آر سی پی نے مئی 2016ء میں ویب ٹی وی کی بنیاد رکھی۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ فیلڈ میں کام کرنے والے ایچ آر سی پی کے رضا کار کارکنوں کی مدد سے انسانی حقوق کی ایڈووکیسی کی جائے، انسانی حقوق کی تعلیم عام کی جائے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو اجاگر کیا جائے۔ ایچ آر سی پی نے 102 ویڈیو ڈاکومنٹریاں اور رپورٹس تیار کیں۔ یہ ڈاکومنٹریاں/رپورٹس دو زبانوں میں دستیاب ہیں اور hrcpforrights .tv پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

اہم مسائل پر کمیشن کا مؤقف

ضمیمہ - 2

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 2016ء میں ایسے واقعات اور معاملات پر تبصروں اور آراء کا سلسلہ جاری رکھا جو عوام کے حقوق پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ 2016ء کے دوران کمیشن نے اہم مسائل پر جو مؤقف اختیار کیے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

قانون کی حکمرانی

30 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر عاصم حسین کی ذہنی صحت کی خرابی اور کراچی میں پیراملٹری فورسز کی حراست میں ان کے علاج سے متعلق رپورٹ پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔

کمیشن نے کہا کہ ''ڈاکٹر حسین کی ذہنی حالت کا سبب دوران تحویل ان کے ساتھ کیا جانے والا سلوک ہے......ایچ آر سی پی کے خیال میں اس امر کی شفاف انکوائری کی جائے کہ ڈاکٹر حسین کی ذہنی حالت اس حد تک کیسے پہنچی، اور ایذا رسانی کے خلاف میثاق (کیٹ) کے تحت پاکستان پر عائد فرائض کی تعمیل کو یقینی بنانے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں''۔

13 دسمبر: اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی کی جانب سے حال ہی میں ایک دستاویز کی منظوری کے بعد، جس میں اس نے پاکستان کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کے بارے میں متعدد تحفظات کا اظہار کیا ہے، ماہرین قانون کے بین الاقوامی کمیشن (آئی سی جے) اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے آج پاکستانی حکام پر زور دیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی کے سوالوں کا جامع طور پر جواب دیتے ہوئے اس کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی نے نومبر 2016ء میں اپنے 118ویں اجلاس میں ''معاملات کی فہرست'' نامی دستاویز کی منظوری دی تھی جو پاکستان کی جانب سے شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی میثاق (آئی سی سی پی آر) پر عملدرآمد سے متعلق تھی۔ اس دستاویز میں کمیٹی نے ملک کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کے بارے میں متعدد سوالات پوچھے تھے جو درج ذیل ہیں:

☆ اکیسویں آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد فوجی عدالتوں کے توسیعی دائرہ اختیار کے نتیجے میں شفاف قانونی کارروائی سے متعلق پائے جانے والے تحفظات، بشمول فوجی عدالتوں میں چلنے والے مقدمات کے انتخاب کا معیار اور طریقہ، ان عدالتوں اور ان کی کارروائیوں کی سربراہی کرنے والے ججوں کی اہلیت کا معیار؛

☆ سزائے موت کا دوبارہ آغاز اور اس کے اطلاق کے دائرہ کار میں اضافہ، بشمول ''توہین مذہب'' کے لیے سزائے موت کو لازمی قرار دینا؛

☆ ''توہین مذہب'' سے متعلق جرائم کی وسیع اور مبہم تعریف، مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف ان کا غیر متناسب استعمال؛ غلط الزامات کی بنیاد پر ''توہین مذہب'' کے بڑی تعداد میں درج کیے گئے مقدمات؛ اور ''توہین مذہب'' کے مقدمات کی سماعت کرنے والے ججوں اور توہین مذہب کے ملزمان کو دھمکیوں اور خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے طریق ہائے کار کا فقدان؛

☆ احمدیوں کے حقوق، بشمول ان کا کسی مداخلت کے بغیر اپنے مذہب پر یقین رکھنے، عمل کرنے اور اسے مشتہر کرنے کا حق؛

☆ افغان مہاجرین کی وطن واپسی، بشمول مہاجرین سے متعلق مجوزہ قانون کی منظوری سے متعلق معلومات اور افغان شہریوں کی رضاکارانہ وطن واپسی اور انصرام سے متعلق جامع پالیسی؛

☆ خواتین کے حقوق، بشمول خواتین کے خلاف متواتر تشدد (جنسی اور دیگر) اور نام نہاد غیرت کے نام پر ہونے والی ہلاکتوں کی روک تھام اور مجرموں کو سزائیں دینے کے لیے حکومت کی جانب سے کئے گئے اقدامات؛

☆ ایذارسانی اور دیگر ناروا سلوک، ماورائے عدالت ہلاکتیں، اور جبری گمشدگیاں، بشمول محبت شاہ کیس، جس میں سپریم کورٹ نے فوجی حکام کو مالاکنڈ کے ایک حراستی

مرکز سے کم از کم 28 افراد کی جبری گمشدگی کا ذمہ دار قرار دیا تھا، اس بارے میں سپریم کورٹ کی جانب سے دیے گئے فیصلے پر عملدرآمد کے لیے حکومت کی جانب سے کئے گئے اقدامات۔

قانون کا نفاذ

21 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے چارسدہ میں دہشت گردوں کے حملے کی شدید مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جاری آپریشن پر نظرثانی کی جائے اور نیشنل ایکشن پلان، خاص طور پر دہشت گرد گروہوں کو تربیت اور معاونت فراہم کرنے والے مراکز اور تنظیموں کے خلاف کارروائی سے متعلق ایجنڈے پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے۔

کمیشن نے کہا ''تمام جماعتوں کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کھلے دل کے ساتھ شریک ہونا چاہیے...... اگرچہ چارسدہ حملے پر سکیورٹی فورسز کا فوری ردعمل حوصلہ افزا ہے، دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن پر سنجیدہ نظرثانی کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔

28 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے لاہور کے گلشن اقبال پارک میں ہونے والے بہیمانہ بم دھماکے کی شدید مذمت کی ہے اور اس امر پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جاری آپریشن کے باجود وہ اب بھی بڑے حملے کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایچ آر سی پی نے اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ایک پرتشدد ہجوم بغیر کسی مزاحمت کے راولپنڈی سے اسلام آباد پہنچ گیا اور اس نے پارلیمنٹ کے قریب ایک انتہائی حساس علاقے میں دھرنا دیا۔

کمیشن نے کہا: ''حکومت کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جنگ کی ناقص حکمت عملی پر نظرثانی کرنی چاہیے جو لاہور میں خوفناک حملے اور اسلام آباد میں مشتعل یلغار کا سبب بنی ہے۔

مظاہرین کے اقدامات اور بعض مطالبات چند برس قبل لال مسجد والے واقعے کی یاد دلاتے ہیں۔ بروز اتوار لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں پیش آنے والے قابل مذمت واقعات تقاضا کرتے ہیں کہ احمقانہ تشدد اور معصوم شہریوں کے قتل عام کے ذریعے ریاست کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کے لیے جو اقدامات کئے جارہے ہیں ان پر سنجیدہ توجہ دی جائے''۔

12 اپریل: قلات کے علاقے جوہان، اور مستونگ کے علاقے اِسپلنگی سے موصول

ہونے والی یہ خبریں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے لئے تشویش کا باعث ہیں کہ ان علاقوں میں مبینہ فوجی آپریشن کے نتیجے میں بڑی تعداد میں عام شہری ہلاک ہوئے ہیں۔ایچ آر سی پی تمام حکام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ طاقت کا اندھا دھنداور حد سے زیادہ استعمال نہ کیا جائے۔

18 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے انتظامیہ کی جانب سے انجمن مزارعین پنجاب (اے ایم پی) سے وابستہ کسانوں کو پرامن احتجاج اور ایک کنونشن کے انعقاد کا حق نہ دیے جانے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔اس کنونشن کا مقصد ان کے اس زمین کی ملکیت کے حق کے لئے کی گئی طویل جدوجہد کی جانب توجہ دلانا تھا جس پر وہ کئی دہائیوں سے کاشت کرتے آرہے ہیں۔

’’ایچ آر سی پی کا حکومت کومشورہ ہے کہ یہ کسانوں کے خلاف سخت اور استبدانہ کارروائی کرنے اور ان کے خلاف مقدمات پر مقدمات بنانے سے گریز کرے۔ یہ حکام پر زور دیتا ہے کہ وہ کسانوں کے ساتھ بامقصد مذاکرات کریں تاکہ انجمن مزارعین پنجاب سے وابستہ کسانوں اور فوج کے درمیان ایک طویل عرصے سے جاری تکرار کا حل تلاش کیا جاسکے۔فوج اس زمین کی ملکیت کا دعویٰ کررہی ہے جس پر انجمن مزارعین کے کسان کئی نسلوں سے کاشت کرتے آرہے ہیں۔ایچ آر سی پی حکام سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ کسانوں پر انسداد دہشت گردی فریم ورک کا اطلاق نہ کیا جائے اور ان کے پرامن احتجاج اور اجتماع کی آزادی کے حق کا احترام کیا جائے۔

06 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جرگہ کے حکم پر ایک سولہ سالہ لڑکی کے قتل کی شدید مذمت کی ہے۔اس فیصلے کا مقصد لڑکی کو ایک جوڑے کو پسند کی شادی میں مبینہ طور پر مدد فراہم کرنے کی سزا دینا تھا۔

کمیشن نے کہا: ’’ایسی سنگدلانہ کارروائیاں ایک ایسے معاشرے میں ہی وقوع پذیر ہوسکتی ہیں جو خواتین کو نہ صرف خاندان کی بلکہ معاشرے کی بھی جاگیر سمجھتے ہیں......حکام کا کوئی بھی اقدام جواں سالہ مقتولہ کو واپس نہیں لاسکتا،لیکن انہیں کم ازکم اس مقدمے میں انصاف فراہم کرکے اپنی غفلت کی تلافی کرنی چاہیے اور ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے جن کی وجہ سے یہ واقعات پیش آتے ہیں۔

22 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ایک اسسٹنٹ

پولیٹیکل ایجنٹ کی جانب سے جرگے کے حکم پران دوافراد کو بری کرنے کے فیصلے کی شدید مذمت کی ہے جنھوں نے نام نہاد غیرت کے نام پر اپنے ماموں اور اپنی بھابی کو قتل کرنے کا اعتراف کیا تھا۔

کمیشن نے کہا: ''ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ قبائلی علاقوں کے عدالتی ونیم عدالتی عہدیداران کو واضح ہدایات جاری کریں کہ وہ فوجداری مقدمات کے ٹرائل کرتے وقت 'رواج' کو مکمل طور پر نظرانداز کیا کریں......ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ اس نظام کی فوری جانچ پڑتال کی جائے جو انصاف کا مذاق اڑانے اور فاٹا کے مظلوم عوام کو امتیازی سلوک کا نشانہ بنانے کی اجازت دیتا ہے۔فاٹا کے لیے ایک 'قانونی' معیار جبکہ ملک کے دوسرے علاقوں کے لیے اس سے مختلف 'قانونی' معیار رکھنا بلاجواز ہے''۔

24 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ریاست کی جانب سے ایذارسانی کے خلاف معاہدے، جس کی توثیق پاکستان نے 2010ء میں کی تھی، پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لئے ایذارسانی کے خلاف عالمی تنظیم (اوایم سی ٹی) کے اشتراک سے ایک مشاورت کا اہتمام کیا۔

مشاورت کا مقصد شراکت داروں، بشمول سول سوسائٹی کی تنظیموں، قانونی برادری، پالیسی سازوں، انسانی حقوق کے قومی اداروں، میڈیا اور ریاستی حکام کو متحرک کرنا اور ایذارسانی کے خلاف اصلاحات سفارشات تیار کرنا اور سیاسی عزم پیدا کرنا تھا۔

شرکاء نے حکومت، پارلیمان، سول سوسائٹی اور ذرائع ابلاغ سے درج ذیل سفارشات کیں۔

حکومت کے لیے سفارشات

☆ ایذارسانی کے خلاف مسودہ قانون پر عوامی بحث کا انعقاد کیا جائے۔

☆ انتظامیہ کے تحت ایک نیا پینل تشکیل دینے کی بجائے پہلے سے قائم قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کو مکمل طور پر بااختیار بنایا جائے اور اسے مضبوط کیا جائے۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل میں اصلاحات کی جائیں۔

☆ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور عدلیہ کو تربیت فراہم کی جائے اور انہیں تفتیش کے جدید اور سائنسی طریق ہائے کار تک رسائی فراہم کی جائے اور تفتیش اور اقبال جرم کرانے کے غیرانسانی طریق ہائے کار ترک کیے جائیں۔

- ☆ ایذا رسانی کے متاثرین کے لیے بحالی مراکز قائم کیے جائیں۔
- ☆ ریاست کی جانب سے ایک طریقہ کار کے ذریعے ایذا رسانی کے متاثرین کے لئے معاوضے کو یقینی بنایا جائے۔
- ☆ ایک جامع ریاستی رپورٹ کے لئے شراکت داروں کے ساتھ گول میز کانفرنسیں منعقد کر کے سول سوسائٹی کو ریاست کے رپورٹنگ کے عمل میں شامل کیا جائے۔
- ☆ ایذا رسانی میں ملوث ریاستی اہلکاروں کے لئے جمہوری احتساب کا نظام متعارف کرایا جائے۔
- ☆ ایذا رسانی کے خلاف اختیاری معاہدے کی توثیق کی جائے۔
- ☆ ایک آزاد ادارہ تشکیل دیا جائے جو ان پولیس افسروں سے تفتیش کرے جن پر ایذا رسانی اور نارواسلوک کی دیگر اقسام میں ملوث ہونے کا الزام ہو۔
- ☆ جسمانی اور طبی معائنے کی بنیاد پر بحالی نو تک رسائی کو یقینی بنایا جائے اور ضروری نہیں کہ ایسا عدالتی حکم پر ہی کیا جائے۔
- ☆ پولیس کے نظام میں ترمیم اور اصلاح کی جائے۔
- ☆ جیل اصلاحات متعارف کرائی جائیں اور جیلوں میں قید خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے اراکین کو نارواسلوک اور ایذا رسانی سے تحفظ فراہم کیا جائے اور مرد اور خواتین قیدیوں کے لیے الگ الگ انتظامیہ کو یقینی بنایا جائے۔
- ☆ سیاسی مخالفین کے خلاف انسداد دہشت گردی قوانین کے غلط استعمال کو روکا جائے۔
- ☆ مقامی حکومت کو پولیس کو کنٹرول کرنے کی اجازت دی جائے۔

پارلیمان کے لیے سفارشات

- ☆ ایذا رسانی کے خلاف میثاق کی روشنی میں ایذا رسانی کو جرم قرار دیا جائے۔
- ☆ ایذا رسانی سے آزادی کے حق پر قانون منظور کیا جائے۔ قانون میں ایذا رسانی کے خلاف میثاق کی مطابقت میں ایذا رسانی کی واضح تعریف شامل ہونی چاہیے۔ مذکورہ میثاق ایذا رسانی کو جرم قرار دیتا ہے، ایذا رسانی کے متاثرین کو تلافی خاص طور طبی ونفسیاتی بحالی نو فراہم کرتا اور غیر ریاستی عناصر کو جوابدہ ٹھہراتا ہے۔
- ☆ گواہ کے تحفظ کا قانون منظور کیا جائے۔

سول سوسائٹی اور ذرائع ابلاغ کے لیے سفارشات

- ☆ ایک مشترکہ حکمت عملی پر مبنی ایذا رسانی مخالف وسیع اتحاد تشکیل دیا جائے تاکہ اذیت رسانی کے خلاف میثاق کے نفاذ کے لیے مہم چلائی جا سکے۔
- ☆ ایذا رسانی کی بہتر تصویر کشی کے لیے ذرائع ابلاغ کے افراد کی صلاحیت سازی کی جائے۔
- ☆ فلموں اور ڈراموں میں ایذا رسانی کی تصویر کشی کو کنٹرول کیا جائے۔
- ☆ سکولوں اور مجموعی طور پر پورے معاشرے میں ایذا رسانی کے خاتمے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے سماجی آگہی مہموں پر وسائل صرف کئے جائیں۔
- ☆ ایذا رسانی کے اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں اور لوگوں کو ان سے آگاہ کیا جائے تاکہ ایڈووکیسی کی سرگرمیوں میں انہیں بروئے کار لایا جا سکے۔
- ☆ ایڈووکیسی کے تمام مراحل میں قانون سازوں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا جائے تاکہ پارلیمان اور سیاسی جماعتوں میں رواداراور جمہوری معاشرے کے فروغ کی آواز کو بلند کیا جا سکے۔
- ☆ ایذا رسانی کے مکمل خاتمے کی اہمیت پر معاشرتی بحث و مباحثے اور سیاسی مذاکرے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس عمومی خیال کو رد کیا جا سکے کہ ایذا رسانی قابل قبول اور موثر چیز ہے۔
- ☆ ذرائع ابلاغ کے ساتھ تعلقات استوار کئے جائیں تاکہ مشترکہ حکمت عملی تشکیل دی جا سکے اور سوشل میڈیا، ویب سائٹس اور ای میلنگ گروپس کے ذریعے سرگرم جدوجہد کی جا سکے۔۔
- ☆ ایذا رسانی کے خلاف پرنٹ، آن لائن اور نشریاتی مہمیں چلانے کے لیے پیمرا کے پبلک سروسز پیغامات کے لیے مختص فنڈ و استعمال کی جائیں۔
- ☆ خواتین اور بچوں کے خلاف ایذا رسانی اور دور دراز کے علاقوں میں واقعات سمیت ایذا رسانی کے تمام واقعات کو رپورٹ کیا جائے۔
- ☆ بار کے اراکین کو شعور دیا جائے اور بار کونسل کی سطح پر قانونی امداد کا موثر نظام تشکیل دیا جائے۔

☆ ایذا رسانی کی روک تھام پر پولیس کے ساتھ مشاورتوں کا اہتمام کیا جائے۔

22 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے تحفظ پاکستان ایکٹ (POPA) کی توسیع کے اقدامات پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ ایکٹ 15 جولائی سے قابل اطلاق نہیں رہا۔ کمیشن نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آئین میں درج بنیادی حقوق کی پامالی کا سبب بننے والے قوانین کی طرف رجوع کرنے سے گریز کرے۔

کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ اس استبدادی قانون کو توسیع دینے کا خیال ترک کردے اور اس کی بجائے ایسے اقدامات کرے جو کہ آئین میں درج بنیادی حقوق کی پامالی کا سبب نہ بنیں۔ ہمارا یہ بھی مطالبہ ہے کہ POPA پر غوروفکر بند دروازوں کے پیچھے نہیں ہونا چاہیے اور تمام متعلقہ فریقین کے خدشات پر توجہ دی جائے اور ان کا احاطہ کیا جائے۔ ایچ آر سی پی کا قانون سازوں، خاص طور پر اراکین سینٹ سے بھی مطالبہ ہے کہ وہ قانون اور لوگوں کے حقوق کو تحفظ دینے کا اپنا فریضہ سرانجام دیں۔

06 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سماجی کارکن عبدالواحد بلوچ کی مبینہ جبری گمشدگی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جو 26 جولائی کو میر پور خاص سے کراچی جا رہے تھے۔

کمیشن کی جانب سے جاری کیے گئے ایک بیان میں کہا گیا: ''عبدالواحد ایک سماجی کارکن ہیں جو متعدد بلوچی ادبی، میوزیکل اور ثقافتی تقریبات منعقد کر چکے ہیں۔ ایچ آر سی پی کو ان کی سلامتی کے حوالے سے سخت تشویش لاحق ہے اور یہ ان کی فوری بازیابی پر زور دیتا ہے۔ اگر عبدالواحد یا کسی بھی شہری کے خلاف قانونی کارروائی کا کوئی جواز موجود ہے تو ایسا قانون کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ اگر ان کے خلاف کسی جرم کا کوئی ثبوت موجود ہے تو اسے عدالت میں پیش کیا جائے اور معین طریقہ کار کو یقینی بنایا جائے۔

''قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے شہریوں کو اٹھائے جانے کی مسلسل اطلاعات لوگوں کے لیے انتہائی پریشان کن ہیں۔ ایسی کارروائیاں فوری طور پر روکی جائیں۔ ایچ آر سی پی کا یہ ماننا ہے کہ اس قابل مذمت سرگرمی کا خاتمہ صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ مجرموں کو حاصل سزا سے استثنا کا خاتمہ کیا جائے۔

08 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے پیر کو کوئٹہ میں وکلاء کے خلاف دو حملوں

کی شدید مذمت کی ہے۔ جن میں کم از کم 53 افراد جاں بحق ہوئے۔ کمیشن نے حکومت کی جانب سے شہریوں کے تحفظ کے لیے دہشت گردی اور منظّم جرائم کے انسداد کے لیے موثر اقدامات نہ کرنے پر بھی شدید افسوس کا اظہار کیا ہے۔

کمیشن نے کہا: کہ عوامی مسائل تمام شہریوں کی زندگی کے تحفظ پر صرف کیے جائیں۔

11 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے کوئٹہ میں ہونے والے بم دھماکے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جس میں وفاقی شرعی عدالت کے ایک جج کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ کمیشن نے ججوں اور وکلاء کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے فوری کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔

کمیشن نے کہا: ''بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت میں جج اور وکلاء تشدد کے بڑھتے ہوئے خوف میں اپنے فرائض آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر انجام نہیں دے سکتے اور حتیٰ کہ وہ آزادانہ طور پر نقل وحرکت بھی نہیں کر سکتے''۔

بنیادی آزادیاں

5 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے سابق گورنر پنجاب کے قاتل کی پھانسی کے خلاف احتجاج کرنے والے ہجوم کی جانب سے ذرائع ابلاغ کی تنظیموں اور صحافیوں پر حملے کو نہایت تشویشناک قرار دیا ہے۔

کمیشن نے مطالبہ کیا کہ ذرائع ابلاغ کو خوف زدہ کرنے کے لئے تشدد کا پرچار اور ارتکاب کرنے والوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ ایچ آرسی پی ریاستی یا غیر ریاستی عناصر کی طرف سے ہراس کوشش کا شدید مخالف ہے جس کا مقصد ذرائع ابلاغ کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے اسے اثر ورسوخ یا خوف کا نشانہ بنانا ہو...... ذرائع ابلاغ کو اس قسم کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے درکار اقدامات بھی ذرائع ابلاغ اور صحافیوں کی تنظیموں کی مشاورت سے کیے جائیں۔

04 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کی جانب سے نوشہرو فیروز سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی کارکن کو بغیر وارنٹ کے حراست میں رکھے جانے اور متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے کارکن آفتاب احمد کی ہلاکت پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے جو رینجرز کی حراست میں تھے۔

کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی ان لوگوں کی جانب سے ایسی کارروائیوں کی مذمت کرتا ہے جن کا کام قانون کا تحفظ اور بحالی ہے۔ حکام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ ذمہ داروں کی شناخت کریں اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لائیں۔

''اس بات کی تحقیقات کی جانی چاہئیں کہ آفتاب احمد کی موت کن حالات میں ہوئی اور کیا وجہ ہے کہ رینجرز کی حراست میں بظاہر صحت مند لوگوں کی صحت خراب ہوجاتی ہے اور حتیٰ کہ ان کی موت بھی واقع ہوجاتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ لاقانونیت پر قابو پانے کے لئے شروع کی گئی کارروائی ان عناصر کے حربوں کی نقالی نہ کرے جنہیں انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لئے اس کا آغاز کیا گیا تھا''۔

30 اگست: عالمی کمیشن برائے ماہرین قانون (آئی سی جے) اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جبری گمشدگی کے متاثرین کے عالمی دن پر ایک کانفرنس منعقد کی جس میں بنگلہ دیش، ہندوستان، نیپال، پاکستان اور سری لنکا سے وکلاء اور کارکنوں نے شرکت کی جن کا کہنا تھا کہ جنوبی ایشیاء میں وسیع پیانے پر ہونے والی جبری گمشدگیوں پر صرف اس صورت میں قابو پایا جاسکتا ہے کہ خطے کی حکومتیں انسانی حقوق کی اس سنگین خلاف ورزی کو فوری طور پر جرم قرار دیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے سیکرٹری جنرل آئی اے رحمان نے کہا کہ ''سری لنکا کی جانب سے جبری گمشدگی کے میثاق کی توثیق اور اس عمل کو جرم قرار دینے کا عہد خوش آئند امر ہے۔ خطے کی دیگر ریاستوں کو اس اقدام کی پیروی کرنی چاہیے اور ملکی قانون میں جبری گمشدگی کو خاص جرم قرار دے کر انسانی حقوق کے تحفظ کے حوالے سے اپنی سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے''۔

آئی سی جے ایشیا کے ڈائریکٹر سام ظریفی کا کہنا ہے کہ: ''جنوبی ایشیا میں جبری گمشدگیوں کے ہزاروں واقعات کے باوجود حکومتیں اپنی اس قانونی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں کہ وہ ان جرائم کو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کے طور پر دیکھیں''۔ جنوبی ایشیائی حکومتوں نے جبری گمشدگی کے متاثرین کو معاونت فراہم کرنے یا ان کے خاندانوں کے سچائی، انصاف اور تلافی کے حق کو یقینی بنانے کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے''۔

آئی سی جے اور ایچ آر سی پی کا کہنا ہے کہ علاقے میں جبری گمشدگیوں کے حوالے سے سزا سے استثنا کے خاتمے کے لیے قانون اور پالیسی میں جامع اصلاحات کی ضرورت ہے۔

جبری گمشدگی کو الگ اور واضح جرم قرار دینا اس جانب پہلا قدم ہوگا۔

15 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جبری یا غیر رضا کارانہ گمشدگیوں سے متعلق اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ کی سفارشات پر عملدرآمد کرے۔ کمیشن نے متعلقہ حکام سے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ ورکنگ گروپ کی جانب سے اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کو پیش کی گئی تازہ ترین رپورٹ پر توجہ دیں۔

07 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے حکام اور سیاسی و مذہبی جماعتوں پر زور دیا ہے کہ وہ بلوچستان میں عقیدے کی بنیاد پر ہونے والے تشدد اور خون ریزی کو روکنے کے لئے موثر اقدامات کریں۔

کمیشن نے کہا کہ ''ایچ آر سی پی نے کوئٹہ میں خواتین پر کئے جانے والے حالیہ حملے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ یاد رہے کہ ہزارہ قبیلے کی خواتین پر اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ بس میں سوار کہیں جا رہی تھیں۔ اس حملے میں چار خواتین جاں بحق ہوئیں۔ اس کے علاوہ کمیشن نے پنجگور میں ذکری فرقے کی متعدد عبادت گاہوں پر حملہ کر کے انہیں جلا دینے کے واقعہ پر بھی سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔

''یہ خونی واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ حکام انتہا پسند عناصر کی طرف سے کی جانے والی خونریزی پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔

''یہ شدت پسند عناصر عوام کو عقیدے کی بنیاد پر تقسیم کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس کو سختی اور پوری طاقت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان عناصر نے بلوچستان کی برداشت کی روایت کو بھی تباہ کر دیا ہے حالانکہ برسوں کے دوران بلوچستان میں خصوصاً ہزارہ شیعہ برادری کے خلاف ہونے والے انتہا پسندانہ تشدد کے مرتکب افراد کی اخلاقیات کے بارے میں جو فریب نظر تھا، وہ اور زیادہ مضبوط ہوا ہے۔ ہزارہ خواتین کی بس پر حملے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ قاتل اور ان کو اس بہیمانہ فعل کے لئے تیار کرنے والے لوگوں کی کوئی اخلاقیات ہے ہی نہیں۔

''ایچ آر سی پی نے سیاسی اور مذہبی جماعتوں پر بھی زور دیا ہے کہ وہ اس ظلم اور خونریزی کی واضح الفاظ میں مذمت کریں تاکہ عرصہ دراز سے ظلم و تشدد کا شکار ہونے والے لوگوں کو یہ احساس ہو سکے کہ ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ اس پاگل پن اور جنونیت کے خلاف ان کے ساتھ ہے۔ ان سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو فرقہ وارانہ اور مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ انہیں حکومت پر بھی اپنا دباؤ برقرار رکھنا چاہیے تاکہ

حکومت لوگوں کی جانوں اوران کی مذہبی آزادیوں کا بھرپور طریقے سے تحفظ کرے''۔

11اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے مطالبہ کیا ہے کہ صحافی سرل المیڈ ہ کے بیرون ملک سفر پر عائد تمام پابندیاں فوری طور پر ختم کی جائیں اوراگر حکام کوان سے کوئی شکایات ہیں توان کا ازالہ قانون میں معین طریقہ کار کے حق اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اظہاررائے کی آزادی کے تناظر میں کیا جائے۔

کمیشن نے کہا ''سرل المیڈ ہ کو بیرون ملک سفر سے روکنا اور انتہائی معتبر اخبار ڈان کے مالکان پر دباؤ ڈالنا ملک کے اندر اور باہر ان لوگوں کے لیے تشویش کا باعث بنے گا جو آزادی رائے اور صحافیوں کے حقوق پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی صحافی برادری کو پاکستان پر تنقید کا موقع دینے کا وقت نہیں ہے۔

''ایچ آرسی پی حکام سے مطالبہ کرتا ہے کہ سرل کا نام فی الفور ای سی ایل سے خارج اور انہیں ہراساں کرنے اور اخبار کے مالکان کو دھمکانے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ ہم اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ کوان سے جو بھی شکایات ہیں انہیں قانون کے مطابق نمٹا جائے اور ان کی آزادی اظہار اور دیگر حقوق، بالخصوص وہ جن کا تعلق معین قانونی طریقہ کار سے ہے، کا خیال رکھا جائے''۔

25اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے کوئٹہ میں پولیس اکیڈمی پر ہونے والے حملے کی شدید مذمت کی ہے اور انسداد دہشت گردی کی حکمت عملی پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا ہے تا کہ اس خونریزی کا خاتمہ کیا جا سکے۔

کمیشن نے کہا: ''ایچ آرسی پی کا یہ موقف ہے کہ صرف سکیورٹی آپریشنوں پر انحصار کرتے ہوئے دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ کوئی بھی ریاست، چاہے وہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، لوگوں کی حمایت کے بغیر دہشت گردی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس جنگ میں لوگوں کا احساس بے گانگی ختم کرنا اور ان کا اعتماد جیتنا نہایت اہم ہے۔ اگرچہ معاشرے میں امن کی بحالی سے متعلق متبادل بیانیے کی تشکیل کے حوالے سے بہت کچھ کہا گیا ہے تاہم اس جانب بہت کم اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس بیانیے میں بلا تاخیر تبدیلی کی ضرورت ہے''۔

27اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ سزائے موت کے ایک ذہنی معذور قیدی کی پھانسی پر عملدرآمد روکا جائے جسے وہاڑی میں 02 نومبر کو پھانسی دیے جانے کا نوٹیفکیشن جاری ہوا ہے۔

ایچ آر سی پی نے ایک مراسلے کے ذریعے صدر ممنون حسین کی توجہ عدالتِ عظمیٰ کے ایک آرڈر کی جانب مبذول کروائی ہے جس میں عدالت نے سزائے موت کے قیدی امداد حسین جو کہ شیزوفرینیا کا مریض ہے کی درخواست کو یہ کہتے ہوئے خارج کر دیا کہ چونکہ شیزوفرینیا ایک "قابل علاج" مرض ہے، اس لیے اسے ذہنی صحت آرڈیننس، 2001 کے تحت "ذہنی مرض" کے زمرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

ایچ آر سی پی نے کہا کہ سپریم کورٹ نے اس کیس کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ذہنی امراض کے تشخیصی و شماریاتی کتابچے (ڈی ایس ایم-5) سمیت عالمی سطح پر تسلیم شدہ تشخیصی آلات اور ذہنی صحت پر پاکستانی عدالتوں کے فیصلوں کی نظائر کو نظر انداز کیا ہے اور ہندوستانی نظائر، خاص طور پر شادی کی تنسیخ سے متعلقہ ہندو ازدواج ایکٹ پر ہندوستانی عدالت عظمیٰ کے ایک فیصلے کا سہارا لیا ہے۔

کمیشن نے صدر پاکستان سے اس معاملے میں فوری مداخلت کا مطالبہ کیا ہے تا کہ امداد حسین کی پھانسی پر عملدرآمد روکا جا سکے اور ذہنی معذور افراد کو سزائے موت کا نشانہ بننے سے بچایا جا سکے۔

04 نومبر: انسانی حقوق سے متعلق سینیٹ کی قائمہ کمیٹی نے عبدالواحد بلوچ کی مبینہ جبری گمشدگی کا معاملہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) کے سپرد کر دیا ہے۔ سینیٹ کمیٹی نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی ٹیم سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے ایچ آر سی پی کے سندھ چیپٹر کی جانب سے اس معاملے پر کی گئی فیکٹ فائنڈنگ سے متعلق بریفنگ دے۔

07 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے روایتی الیکٹرانک و سوشل میڈیا پر معروف مصنفہ اور تجزیہ کار ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کے خلاف چلنے والی مہم کو شرمناک قرار دیتے ہوئے اسے جمہوری و رواداری معاشرے کی اقدار کے منافی قرار دیا ہے۔

کمیشن نے کہا: "مانا کہ پاکستان مشکل حالات سے گزر رہا ہے اور اسے کئی محاذوں پر چیلنجز کا سامنا ہے لیکن اس کو جواز بنا کر نہ تو رواداری اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہیے اور نہ ہی شہریوں کو ان کی اظہار رائے اور فکر کی آزادی سے محروم کرنا چاہیے۔ حکام جو آج کل سائبر سپیس کے استعمال کے بارے میں کچھ زیادہ ہی فکر مند ہیں انہیں اس معاملے کا نوٹس لینا چاہیے۔ ایسے حربوں کی عوامی مذمت بھی نہایت ضروری ہے تا کہ عقل و دانش اور اظہار رائے کی آزادی پر ہونے والے اس حملے کی مزاحمت کی جا سکے"۔

30 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی سی) نے کہا ہے کہ جبری تبدیلی مذہب کے خلاف سندھ اسمبلی میں ہونے والی قانون سازی قابل تحسین اقدام ہے اور

حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قانون کے نفاذ کو یقینی بنائیں۔

کمیشن نے کہا: ''سندھ فوجداری قانون (اقلیتوں کا تحفظ) منظور کر کے سندھ واسمبلی نے صوبے میں جبری تبدیلی، خاص طور پر لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کی جبری تبدیلی مذہب کے حوالے سے مذہبی اقلیتوں، خصوصاً ہندوؤں کے ان تحفظات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کو وہ اکثر اجاگر کرتے رہتے ہیں۔

''ہم امید اور توقع کرتے ہیں کہ نہ صرف سول سوسائٹی بلکہ مذہبی گروہ اور جماعتیں بھی اس قانون کا خیر مقدم کریں گی کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ جب موخرالذکر کو معلوم ہو کہ کسی شخص کو اس کی خواہش کے خلاف اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا ہے تو اسے بھی اس کے اسلام قبول کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی''۔

''ہم صوبائی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ چند عناصر کے دباؤ کے آگے سر نہ جھکائے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ اس قانون کا نفاذ کیا جائے اور شہریوں کو جبری تبدیلی مذہب کی سرگرمی سے تحفظ فراہم کیا جائے''۔

10 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر پریس کلب لاہور میں ''حق معلومات کے بغیر اظہار کا حق بے معنی ہے'' کے عنوان پر ایک کانفرنس منعقد کی جس کے مقررین میں محترمہ عاصمہ جہانگیر، ڈاکٹر مہدی حسن، مسٹر احمد رشید، مسٹر سروپ اعجاز اور مسٹر آئی اے رحمان شامل تھے۔ کانفرنس کے بعد پریس کلب کے باہر ایک احتجاجی مظاہرہ بھی کیا گیا۔ صحافیوں میں تقسیم کی گئی ایک تحریر میں ایچ آر سی پی نے کہا: آج پاکستان میں میڈیا اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے خلاف دھمکیاں اور ان پر پابندیوں کے باعث ایک جمہوری معاشرہ ان فوائد سے محروم ہوسکتا ہے جو ان کے اقدامات کی بدولت شفافیت، احتساب اور بدعنوانی کے خاتمے کی شکل میں حاصل ہوسکتے ہیں۔ یہ دھمکیاں صرف غیر ریاستی عناصر کی جانب سے ہی نہیں دی جاتیں بلکہ کئی دفعہ ریاست کے کارندوں کی جانب سے بھی دھمکیاں موصول ہوتی ہیں۔

صحافیوں، میڈیا کی تنظیموں اور انسانی حقوق کے محافظین کے خلاف تشدد کے مجرموں کو بدستور سزا سے استثنیٰ حاصل ہے۔ صحافیوں اور حقوق کے محافظین کے خلاف تشدد، جس کا مقصد لوگوں کو خوفزدہ کر کے انہیں خاموش رکھنا اور میڈیا کو خودساختہ سنسرشپ عائد کرنے پر مجبور کرنا ہے، کی مناسب طور پر تحقیقات نہیں کی جارہیں۔ حکام کو چاہیے کہ وہ صحافیوں اور انسانی حقوق کے

محافظین کو تشدد اور ان کے کام سے متعلق خطرات سے تحفظ فراہم کرنے کی ریاستی ذمہ داری کو پورا کریں، تشدد کے متاثرین کو معقول معاوضہ فراہم کریں اور ہدف شدہ حملوں، جبری گمشدگیوں، ماورائے عدالت ہلاکتوں جیسی کارروائیوں کے مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں۔

غیر سرکاری تنظیموں کو بدنام کرنے اور ان کی سرگرمیوں اور اجلاسوں پر من مانی اور انتہائی غیر ضروری پابندیاں انتہائی تشویش کا باعث ہیں۔ ایسی کارروائیوں کا مقصد ان کی آواز بند کرنا اور انہیں لوگوں کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے اور سرکاری کارروائیوں کے مبہم پہلوؤں کی نشاندہی کرنے سے روکنا ہے۔

یہ بات افسوس ناک اور قابل ملامت ہے کہ پاکستان کے بہت سے حصوں میں شہریوں کو انسانی حقوق اور دیگر متعلقہ معاملات پر بحث کی غرض سے اپنے پرامن اجتماع کے حق کو استعمال کرنے کے لیے حکام سے این او سی حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ آزادی اظہار کی بھی سنگین خلاف ورزی ہے۔ اگرچہ ایسے رویے شاید ایک آمریت پسند حکومت میں غیر مناسب نہ سمجھے جاتے ہوں تاہم جمہوری معاشرے اس طرح سے کام نہیں کرتے۔

سائبر کرائم جیسے قوانین، جو خلوت میں مداخلت کو جائز قرار دیتے ہیں، اور صحافیوں کا پاکستان کے متعدد علاقوں میں آزادانہ کام یا رپورٹنگ نہ کر پانا آزادی اظہار، جاننے کے حق، اور معلومات تک رسائی اور تشہیر کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

پیمرا جیسے نگران اداروں کی جانب سے بے قاعدہ اور بے ربط اقدامات اور عدلیہ کی جانب سے توہین عدالت سے متعلق کارروائیاں آزادی اظہار سے متعلق بین الاقوامی معیارات کے مطابق ہونی چاہئیں۔

ایچ آر سی پی اس بات سے آگاہ ہے کہ تناؤ اور غیر مددگار ماحول میں میڈیا بھی اپنے راستے سے بھٹک سکتا ہے اور سنسر شپ اور ایذا رسانی کا فریق بن سکتا ہے۔ اگر میڈیا اتحاد، ایمانداری اور معقولیت کے اعلیٰ معیار برقرار نہیں رکھتا تو یہ اپنا مقدمہ ہار جائے گا۔

انسانی حقوق کے دن کے موقع پر ایچ آر سی پی معلومات کے حق سے متعلق قوانین کی اہمیت کو بھی اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ کمیشن سول سوسائٹی پر زور دیتا ہے کہ وہ اس عہد کے ساتھ اس دن کو منائیں کہ وہ اس حق کے حصول کو یقینی بنائیں گے اور ان قوانین کے موثر استعمال کے ذریعے ان قوانین کی آزمائش اور ان کی فراہم کردہ بنیاد کا دائرہ وسیع کریں گے۔

اقتدار میں موجود لوگوں میں ان نظریات کے حوالے سے عدم رواداری پائی جاتی ہے

جن سے وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ آج پاکستان کو، پہلے سے کہیں زیادہ، میکارتھی ازم سے تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

14 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سکیورٹی اہلکاروں اور پرتشدد مذہبی عناصر دونوں کی جانب سے احمدیوں کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ کمیشن نے ربوہ میں پولیس کے چھاپے اور چکوال میں احمدیوں کی عبادت گاہ پر حملے کی مکمل تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''یہ دونوں واقعات آئین اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کے تحت شہریوں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے میں حکام کی ناکامی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مایوس کن بات یہ ہے کہ ایسی عدم تعلق کا مظاہرہ ریاست کے کارندے کرتے ہیں''۔

جمہوری عمل

06 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ پاکستان کی پارلیمان میں آج کے جدید دور میں بھی خواتین کی کم نمائندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں صنفی مساوات کو یقینی بنانے کے عہد کو پورا نہیں کیا جارہا ہے اور کمیشن نے حکومت اور تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس عدم توازن سے نبٹنے کی ذمہ داری کا ادراک کریں۔

کمیشن کا کہنا ہے کہ ''خواتین کو سماجی اور سیاسی زندگی اور سرکاری شعبوں میں شمولیت کے حوالے سے مسلسل امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ حکومت اور فیصلہ سازی میں خواتین کی کم نمائندگی کی وجوہات کے نہ صرف کئی پہلو ہیں بلکہ یہ پیچیدہ بھی ہیں، جن میں معاشی، سماجی اور ثقافتی مسائل کے علاوہ خواتین کے بارے میں پائے جانی والی رجعت پسندی اور متعین شدہ غیر مساویانہ صنفی کردار شامل ہیں۔

ایچ آر سی پی نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ سرکاری شعبے میں خواتین کی مکمل اور موثر نمائندگی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے خاتمے کے حوالے سے پاکستان پر عائد ذمہ داریوں کو پورا کرے اور خواتین کی برابری اور موثر نمائندگی کی جانب پیش قدمی کرے اور خاص طور پر اعلیٰ سرکاری عہدوں کے حصول میں حائل رکاوٹوں کو دور کرے۔

03 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ سویلین

کنٹرول میں آنے والے تمام اداروں کی ملٹرائزیشن جمہوری نظام کو تباہ کررہی ہے اور یہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کو بری طرح متاثر کررہی ہے۔ ایچ آرسی پی کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان آزادیوں کو سکیورٹی کے نام پر محدود کیا جارہا ہے۔

ایچ آرسی پی کی ایگزیکٹیو کونسل اور سالانہ عام اجلاس کے اختتام پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''اظہار رائے، میڈیا، احتجاج، تحریک اور اجتماع کی آزادی کی 'نیشنل سکیورٹی' اور ''قومی مفاد' کے نام پر نہ صرف خلاف ورزی کی جارہی ہے بلکہ انہیں محدود بھی کیا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت کے ترقیاتی منصوبوں پر حقیقی خدشات کے اظہار کو بھی 'قومی مفاد' کے خلاف قرار دیا جارہا ہے۔

''خاص طور پر چین پاک اقتصادی راہداری (سی پیک) حکومت کی نظر میں اتنا مقدس ہے کہ اس کی تفصیلات کے بارے میں کسی معلومات کا تقاضہ کرنا یا اس کے نفاذ کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنا بھی وطن پرستی کے خلاف سمجھا جارہا ہے۔ چھوٹے صوبوں اور گلگت بلتستان نے ملک کی مختلف وفاقی اکائیوں میں سی پیک کے اثرات اور اس کے امتیازی اطلاق کے حوالے سے متعدد تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ ایچ آرسی پی سی پیک منصوبے کے ماحولیاتی اثرات کے فوری اور مکمل جائزے کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اس منصوبے کے بے دخل ہونے والے افراد پر اثرات اور مقامی لوگوں کو اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا بھی اندازہ لگایا جائے۔

بلوچستان میں گوادر بندرگاہ کی تعمیر کی وجہ سے ہزاروں ماہی گیر روزگار اور رہائش سے محروم ہوگئے ہیں۔ جب مقامی آبادی گوادر میں ترقیاتی پالیسی سے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کرتی ہے تو اسے دھمکایا جاتا ہے۔

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) میں اطلاعات کے مطابق سکیورٹی فورسز نے سزا سے استثنا کے ساتھ لوگوں کی املاک پر قبضہ کرلیا ہے۔ کچھ دیہات میں طاقت کے حد سے زیادہ استعمال کی دلخراش اطلاعات موصول ہوئی ہیں جہاں کوئی بھی گھر سلامت نہیں رہا اور مقامی آبادی کو اس حملے سے بچنے کے لئے محفوظ مقامات پر پناہ لینا پڑی۔

''یہ بات انتہائی اہم ہے کہ سکیورٹی فورسز کو کھلی چھوٹ نہ دی جائے اور حدود سے تجاوز کی روک تھام اور احتساب کو یقینی بنانے کے لئے ان کے آپریشنز کی سخت نگرانی کی جائے۔ حراست میں موت، نام نہاد پولیس مقابلوں اور سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ہونے والی ہلاکتوں کے تمام واقعات کی نگران کمیٹیوں کے ذریعے تحقیقات کرائی جائیں۔ یہ کمیٹیاں سول سوسائٹی کے

اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہئیں۔

''دسمبر 2014ء میں آرمی پبلک اسکول پر حملے کے بعد انسداد دہشت گردی کے لئے بنائی گئی حکمت عملی پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ نیکٹا کو فعال بنانے اور پولیس، عدلیہ اور مدارس میں اصلاحات لانے کے لئے کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ اب تک نصاب پر کسی قسم کی معنی خیز نظر ثانی نہیں کی گئی۔ نفرت انگیز تقریر پر محض چند افراد کے خلاف کارروائی کی گئی۔

''عدالتی فورمز کو ایذا رسانی کے تمام الزامات کی تحقیقات کرنی چاہئیں اور جب قیدیوں کو ججوں کے سامنے پیش کیا جائے تو انہیں ان کا معائنہ کرنا چاہیے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ سکیورٹی فورسز نے انہیں تشدد کا نشانہ نہیں بنایا۔

''ایچ آر سی پی کو اقلیتوں اور خواتین کے لئے مخصوص نشستوں پر انتخابات کے انعقاد کے طریقہ کار پر شدید تحفظات ہیں۔ نمائندگی کی موجودہ سکیم منتخب افراد اور ان رائے دہندگان کے ساتھ ناانصافی ہے جن کی وہ اصولی طور پر نمائندگی کرتے ہیں۔ اراکین پارلیمنٹ کو قانون میں ترمیم کر کے ایک مخصوص نشستوں کے لئے ایک ایسا فارمولا تشکیل دینا چاہیے جو کردار کے اعتبار سے نمائندہ ہو اور جو سیاسی جماعتوں کی بجائے رائے دہندہ کی پسند پر مبنی ہو۔

''ایچ آر سی پی مطالبہ کرتا ہے کہ فاٹا میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ امتیاز کا بلا تاخیر خاتمہ کیا جائے۔ اعلیٰ عدالتوں کا دائرہ اختیار فاٹا تک وسیع کیا جائے اور اس کے شہریوں کو اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کے قابل بنایا جائے۔

''ایچ آر سی پی نیوز میڈیا پر بڑھتی ہوئی اعلانیہ اور خفیہ پابندیوں کی مذمت کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ میڈیا کے ادارے اور صحافی اپنے پیشہ ورانہ وقار اور آزادی کا تحفظ کریں گے اور میڈیا کے خلاف ساز باز کرنے کی تمام کوششوں کی مزاحمت کریں گے۔

''متشدد رجعت پسند عناصر کو طلباء یونینز کے نام پر تعلیمی اداروں میں بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے اور وہاں انہیں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ دوسروں کو اجتماع کی آزادی نہیں دی گئی۔ طلباء یونین بحال کی جائیں اور تعلیمی اداروں میں تشدد کا خاتمہ کیا جائے۔

''سول سوسائٹی کی تنظیموں کو بدنام کرنے اور حکام کی جانب سے اصلاحی اقدامات نہ کئے جانے کی وجہ سے انسانی حقوق کے محافظین کے لئے کام کا ماحول انتہائی غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ پاکستان میں سول سوسائٹی کی تنظیمیں حکام کی کارروائیوں کے باوجود کام کر رہی ہیں۔ اندراج کی نئی شرائط کے علاوہ سول سوسائٹی کی تنظیموں کو ہراساں کرنا اور انہیں دھمکیاں دینا معمول بن چکا ہے۔

''ملک میں اندرونی طور پر بے دخل ہونے والے افراد کی حالت زار کو مکمل طور پر بھلا دیا گیا ہے۔ اندرونی بے دخلی کے حوالے سے درپیش چیلنجوں کے ازالے کے لئے ایک طویل المدت موثر پالیسی اپنانے کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے۔

''ایچ آر سی پی اس بات کی مذمت کرتا ہے کہ حکومت نے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے کہ خواتین کو ووٹ ڈالنے سے نہ روکا جائے، حالانکہ بعض اوقات حکومت کو اس بات کا پہلے سے علم تھا۔ وہ خواتین جو مختلف خطرات اور خوف کے باعث ووٹ دینے کی جرأت نہیں کرتیں انہیں اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرنے کو کہنا توقعات کا تضاد ہے۔ ریاست کو اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے اور اسے اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ لوگوں کی جانب سے پٹیشن درج کرائے جانے کا انتظار کئے بغیر اس کھلم کھلا امتیاز کی روک تھام کی جائے۔

''آخر میں ایچ آر سی پی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کو مطلوبہ وسائل فراہم کرے تاکہ یہ اپنا کام موثر طور پر سرانجام دے سکے''۔

03 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سول سوسائٹی کی تنظیموں کو دھمکانے اور اس بات کو افسوس ناک قرار دیا ہے کہ سولین حکومت نے اہم معاملات کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے کی اجازت دی ہے جس سے ملک کے جمہوری مستقبل کے لیے شدید مشکلات پیدا ہوں گی۔

ایچ آر سی پی کی ایگزیکٹیو کونسل نے ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کراچی میں ایک اجلاس منعقد کیا اور جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا: ''انٹیلی جنس اور سکیورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کے سول سوسائٹی تنظیموں کے دفاتر کے دوروں اور دیگر چالوں کے ذریعے ایچ آر سی پی، سول سوسائٹی کی دیگر تنظیموں اور تعلیمی اداروں کو ہراساں کرنے کی منظّم کوششوں کے باعث خوف اور دہشت کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایجنسیاں سول سوسائٹی کی تنظیموں اور انسانی حقوق کے محافظین کو ہراساں کرنے کی بجائے اپنی توانائیاں شہریوں کی سلامتی اور تحفظ پر صرف کریں۔

''ایچ آر سی پی کو شمالی وزیرستان سے نقل مکانی کے معاملے پر سامنے آنے والے خدشات پر بھی شدید تشویش لاحق ہے۔ شہریوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی متعدد اطلاعات سامنے آئی ہیں۔ خاص طور پر ایسی پامالیاں جن کا تعلق بے دخل شہریوں کا اپنے علاقوں میں واپسی

کے معاملے سے ہے۔ان کی گھر واپسی کے عمل کو جس غیر حساس طریقے سے نبٹایا جارہا ہے، اس سے عوام کی ناامیدی اور غم وغصے کو تقویت پہنچی ہے۔ان معاملات کی تحقیقات کرنے اور چیزوں کو ان کی درست سمت میں واپس لانے کی ضرورت ہے۔

''فاٹا اصلاحات شہریوں کا دیرینہ مطالبہ ہے۔تاہم، یہ افسوس ناک امر ہے کہ ان اصلاحات پر غور کرنے والی کمیٹی میں نہ تو فاٹا کی اور نہ ہی خواتین کی نمائندگی ہے۔'رواج' کو فوقیت دینے اور جرگہ کو بااختیار کرنے کی کوششیں قانون کی حکمرانی اور حقوق کے تحفظ کے لیے نیک شگون نہیں ہیں۔ایچ آر سی پی ہر اس کوشش کی شدید مذمت کرتا ہے جس میں ملک کے شہریوں کی علاقائی شناخت کی بنیاد پر ان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی گئی ہو'۔

گلگت بلتستان کا دورہ کرنے والے ایچ آر سی پی کے مشن نے مشاہدہ کیا کہ وہاں پر جابرانہ فیصلے کئے جارہے تھے اور کارکنوں وصحافیوں کو ہراساں کیا جارہا تھا۔انسداد دہشت گردی قوانین کا وسیع پیمانے پر ناجائز استعمال بھی کیا جارہا تھا۔لوگ اس بات پر انتہائی مایوس تھے کہ ان کے اس مطالبے کو پورا نہیں کیا جارہا کہ گلگت بلتستان کو آئینی ترامیم کے ذریعے پاکستان کا حصہ تسلیم کیا جائے یا ایک خاص رتبے کا حامل علاقہ قرار دیا جائے۔

''مذکورہ بالا معاملات فوری توجہ طلب ہیں۔ہم پر امید ہیں کہ حکومت ان معاملات کے ازالے کی سنجیدہ کوشش کے حوالے سے مزید وقت ضائع نہیں کرے گی''۔

پسماندہ طبقوں کے حقوق

15 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے مذہبی امور کی جانب سے لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی شادی کی عمر کو اٹھارہ سال تک بڑھانے کی تجویز مسترد کئے جانے پر مایوسی اور تشویش کا اظہار کیا ہے۔کمیٹی کے متعدد اراکین نے اسے ''غیر اسلامی'' قرار دیا ہے۔

کمیشن نے کہا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1929ء کے قانون کے ذریعے قائداعظم نے مسلمان لڑکیوں کی شادی کی کم از کم عمر مقرر کروانے کے لئے جو جدوجہد کی تھی وہ ان لوگوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو قائد کے نظریے کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس اقدام سے انسانی حقوق کے ان اہم معاہدات پر پاکستان کے موقف کو بھی ٹھیس پہنچی ہے جن کا پاکستان فریق ہے جو مردوں، عورتوں اور بچوں کے حقوق اور شادی کے معاملے

میں مساوی حقوق پر زور دیتے ہیں۔

قائمہ کمیٹی کے فیصلے سے پاکستان کی خواتین اور ان کے انصاف پسند حامیوں کو صرف یہ پیغام ہی ملنا چاہیے کہ وہ اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور سندھ کی مثال کو اپنے لئے نمونہ بنائیں جس نے قانون کے ذریعے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے شادی کی کم از کم عمر 18 برس مقرر کی تھی''۔

02 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے تشدد کے نتیجے میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن (پی آئی اے) کے ایک ملازم کی ہلاکت اور دیگر چار افراد کے زخمی ہونے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے جو پی آئی کی نجکاری کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

کمیشن نے کہا: ''ہر شہری کو پرامن احتجاج کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ ایچ آر سی پی ہلاکت کے نتیجے میں پھوٹنے والے تشدد کی شدید مذمت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ذمہ داران کا سراغ لگانے اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے اعلیٰ عدلیہ کے جج کے ذریعے فوری اور قابل بھروسہ تحقیقات کی جائیں۔ ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ اس معاملے کو فوری اور پرامن انداز سے حل کرنے کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کئے جائیں اور پی آئی اے کے ملازمین کے تحفظات کا ازالہ کیا جائے۔ ایئر لائن اور دیگر سرکاری اداروں کی بلاسوچے سمجھے نجکاری کے عمل کی صرف متعلقہ ملازمین ہی نہیں بلکہ نامور خودمختار ماہرین معیشت بھی کر رہے ہیں۔ بہرحال، یہ یقینی بنانے کی تمام کوششیں کی جائیں کہ اختلافات مزید تشدد یا کشیدگی کا سبب نہ بنیں''۔

25 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پنجاب اسمبلی کی جانب سے خواتین کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے کے بل 2015ء کی منظوری کا خیر مقدم کیا ہے اور اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کے موثر نفاذ سے خواتین کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی کہ مجرم انصاف کے کٹہرے سے نہ بچ سکیں۔

کمیشن نے کہا: ''ان حالات میں ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی مثبت تبدیلی، چاہے وہ معمولی سی ہی کیوں نہ ہو، سے چشم پوشی نہ کرے، اور لوگوں کو مذکورہ قانون سازی سے متعلق آگہی فراہم کرے۔'' سول سوسائٹی کی تنظیموں اور میڈیا پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس قانون، اس پر عمل درآمد کی رفتار، اور اس کے خواتین کے تحفظ پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ حالیہ اقدام کی بدولت ملک بھر کی خواتین کو تشدد

سے محفوظ رکھنے کے لئے قانون کے نفاذ میں مدد ملے گی اور وفاقی دارالحکومت کی خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے اس مرکزی بل کی منظوری کے لئے بھی اقدامات کئے جائیں گے جو طویل عرصے سے التوا کا شکار ہے''۔

04 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ میں خواتین کی انتہائی کم نمائندگی پر فوری توجہ دی جائے۔

خواتین کے عالمی دن (8 مارچ) سے قبل بروز جمعہ کمیشن نے پاکستان کے قانونی شعبے، خاص طور پر اعلیٰ عدلیہ میں خواتین کی کم نمائندگی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ کمیشن نے مشاہدہ کیا کہ خواتین ملک کی ہائی کورٹ ججز کا صرف 5.8 فیصد ہیں اور آج تک کسی خاتون کو سپریم کورٹ کا جج یا کسی ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر نہیں کیا گیا۔ خواتین بار ایسوسی ایشن اور اٹارنی جنرل کے عہدے سمیت قانون کے شعبے کے دیگر میدانوں میں بھی باحیثیت اور اثرورسوخ والے عہدوں پر انتہائی کم تعداد میں ہیں۔ 1947ء سے اب تک صرف ایک خاتون سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدر بن سکی ہے۔ ایچ آرسی پی کا کہنا ہے کہ یہ تعداد اگر دنیا مین نہیں تو خطے میں کم ترین ہے۔

ایچ آرسی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ عوامی زندگی میں خواتین کی مکمل اور موثر شمولیت کو درپیش رکاوٹیں دور کرنے کا فریضہ انجام دے اور شعبہ قانون، خاص طور پر عدلیہ میں خواتین کی مساوی اور موثر نمائندگی کو فروغ دے۔

19 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے چائلڈ لیبر پر ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ جس میں بچوں کے حقوق پر کام کرنے والی سول سوسائٹی کی معروف تنظیموں، کارکنوں اور چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر بیورو (سی پی ڈبلیو بی) کے نمائندوں نے شرکت کی۔

شرکاء کے مطابق حکومت کو درج ذیل معاملات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

☆ چائلڈ لیبر سے متعلق ایک جامع سروے کرنے کی ضرورت ہے۔ سابقہ سروے کے برعکس، ان میں ذرعی اور گھریلو ملازمین کو بھی شامل کیا جانا چاہیے جن کی ایک بڑی تعداد چائلڈ لیبر میں مصروف ہے۔ یہ سروے گھرانوں کے بنیادی اعدادوشمار تک محدود نہیں رہنا چاہیے تاکہ ان جگہوں کا تعین کیا جاسکے جو چائلڈ لیبر کا گڑھ ہیں۔

☆ تعلیم کے حق سے متعلق آئین کے آرٹیکل 25 کا من وعن نفاذ کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ بے گھر بچوں کے اندراج کے لئے قانون سازی کی جائے اور ان کے تحفظ کے لئے

سہولیات فراہم کی جائیں۔

☆ حکومت کو سرکاری تعلیم کی موجودہ صورتحال، خاص طور پر اسکولوں کی خراب صورتحال پر توجہ دینی چاہیے۔ سرکاری تعلیم کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ یہ کم عمری کی ملازمت کا مناسب متبادل فراہم کرے۔

☆ حکومت کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ چائلڈ لیبر جی ایس پی پلس کا ایک بنیادی جزو ہے اور یورپی یونین کے ساتھ تجارت کے معاشی فوائد کے حصول کے لئے چائلڈ لیبر کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔

20 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جی ایس پی پلس نظام پر ایک مشاورت منعقد کی۔

مشاورت کے شرکاء نے درج ذیل سفارشات پیش کیں:

☆ تجارتی حلقوں، حکومت اور مزدوروں سمیت تمام متعلقہ فریقین کو مستحکم معاشی ترقی میں جی ایس پی پلس کی اہمیت کا ادراک کرنا چاہیے۔

☆ جی ایس پی پلس سے متعلقہ معاہدات جن میں سے بیشتر پر پاکستان نے دستخط کرر کھے ہیں، نیز موجودہ قوانین خاص طور پر تجارت سے متعلقہ قوانین پر عملدرآمد کے لیے حکومت کی سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

☆ اگرچہ اس وقت برآمدات کا بنیادی محرک ٹیکسٹائل کی صنعت ہی ہے، تاہم جی ایس پی پلس کے دائرہ میں آنے والی دیگر صنعتوں کو بھی برآمدات کے متبادل ذرائع کے طور پر مستحکم کرنا چاہیے۔

☆ صنعت کے نظم وضبط اور ٹیکس سے متعلقہ نظام جو کہ صنعت کو غیر رسمی بنیادوں پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے، کی نظر ثانی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

☆ قابل اطلاق قانونی باقاعدگیاں، خاص طور پر پہلے سے موجود اسٹامپ پیپرز کا اندراج ہونا چاہیے اور غیر اندراج شدہ اسٹاپ پیپرز کو کالعدم قرار دیا جائے۔

☆ تمام صنعتوں میں ٹریڈ یونینوں کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ مزدوروں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

☆ برآمدات کی مجموعی طور پر انحطاط پذیر صورتحال اور تجارتی عدم توازن کے معاملے سے نبٹنے کی ضرورت ہے۔

27 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی آئی) کی ان سفارشات کی مذمت کی ہے جن میں خواتین کے خلاف تشدد اور دیگر رجعت پسند، غیر قانونی اور فضول تجاویز کو اس ''ماڈل'' قانون کا حصہ بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کا بظاہر مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ ہے۔

کمیشن نے کہا: ''ماڈل قانون میں یہ قرار دیتے ہوئے کہ خواتین کو غیرت کے نام پر قتل نہیں کیا جانا چاہیے، بظاہر چیزوں کو متوازن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ قانون انہیں شادی سے متعلق اپنی رائے دینے، جائیداد رکھنے اور اسے دوسروں کو منتقل کرنے کی ''اجازت'' بھی دیتا ہے۔ یہ انہیں سیاست میں حصہ لینے کی ''اجازت'' بھی دیتا ہے۔ ان دفعات کو پہلے ہی غیر ضروری قرار دیا جا چکا ہے کیونکہ یہ کئی دہائیوں سے فوجداری قانون اور آئینی طور پر تسلیم شدہ انسانی حقوق کی دفعات کا حصہ ہیں۔ پاکستان کی خواتین کو شکر کرنا چاہیے کہ انہیں ان حقوق کے حصول کی لئے سی آئی آئی کی جانب نہیں دیکھنا پڑا۔ اس مسودہ قانون میں ایسی کئی اور دفعات بھی ہیں جو کم مضحکہ خیز نہیں ہیں۔

''یہ مسودہ قانون بظاہر پنجاب اسمبلی کے منظور کردہ 'خواتین تحفظ بل' کا ردّعمل ہے۔ سفارشات سی آئی آئی پر قابض جنونیوں کے ذہن کی عکاسی کرتی ہیں جنہیں فوری طور پر اُن کے عہدوں سے برطرف کرنا چاہیے۔ درحقیقت ملک میں اسلام کے منافی قانون سازی کی ممانعت کرنے والی مؤثر آئینی دفعات کی موجودگی میں یہ ادارہ بذات خود متروک اور بے سود ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اسے ختم کردیا جائے۔

30 ستمبر: پاکستان کے تمام علاقوں میں کان کنی کی صنعت کو باضابطہ بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ کان کنوں کی زندگیوں کو درپیش خطرات پر قابو پایا جاسکے ماحولیاتی آلودگی کو کم کیا جاسکے اور کان کنی سے متعلقہ نقل مکانی اور اس کے اثرات کو روکا جاسکے۔ اس متفقہ رائے کا اظہار کان کنی کے شعبہ سے متعلقہ تحفظات پر منعقد ہونے والی دوروزہ قومی مشاورت کے شرکاء نے کیا جس کا اہتمام پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کیا تھا۔

کان کنی، ماحول اور مزدوروں کے حقوق پر ایچ آر سی پی کی منعقد کردہ قومی مشاورت میں گلگت بلتستان اور وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) سمیت تمام صوبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شریک تھے۔ شعبہ تعلیم، سول سوسائٹی، قانونی برادری، ذرائع ابلاغ کے نمائندگان اور سماجی کارکنان مشاورت میں شریک تھے۔

مشاورت اس اتفاق رائے کے ساتھ ختم ہوئی کہ مندرجہ ذیل سفارشات پر عملدرآمد کیا جانا ضروری ہے:

☆ کان کنی کے شعبے میں محنت کشوں کی اصل تعداد کا فوری طور پر تخمینہ لگایا جائے اور ان کی رجسٹریشن کی جائے۔

☆ ملک بھر میں انضباطی نظام کا دائرہ اس صنعت اور چھوٹے درجے کی کان کنی سے وابستہ ملازمین تک وسیع کیا جائے اور اس کا موثر طور پر نفاذ کیا جائے۔

☆ کان کنی کے شعبے میں معاوضہ اور فوائد، کام کے حوالے سے پیش آنے والی مشکلات اور خطرات کی مناسبت سے مقرر کیے جائیں اور اسی طرح ان خطرات کو باقاعدہ طور پر کم کرنے کے لیے مزدوروں کی مشاورت سے معنی خیز اقدامات کیے جائیں۔

☆ سرکاری معائنے اور انضباطی کردار کو مستحکم کرنے اور بہتر شفافیت، جوابدہی اور معلومات کی باقاعدگی سے فراہمی کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔

☆ کان کے مالکان / آپریٹروں کی جانب سے مقررہ معیارات پر عملدرآمد میں ناکامی یا دیگر جرائم پر عائد موجودہ سزاؤں کو مزید سخت بنایا جائے تاکہ ان جرائم کو دوبارہ وقوع پذیر ہونے سے روکا جاسکے۔

☆ ماحولیاتی اثرات کا آزادانہ اور شفاف طریقے سے تخمینہ لگایا جائے اور خلاف ورزی پر سزائیں دی جائیں۔

☆ اہم وسائل، خاص طور پر پانی کے تحفظ اور ان کی ری سائیکلنگ لازمی قرار دی جائے اور اس پر عملدرآمد بھی کرایا جائے۔

☆ آبادیوں کی بے دخلی کو کم سے کم کیا جائے اور انہیں محض زمین کی قیمت ہی ادا نہ کی جائے بلکہ انہیں مناسب معاوضہ دیا جائے تاکہ انہیں مالی نقصانات سے بچایا جاسکے۔

☆ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کان کنی سے متعلق سرگرمیوں سے آثار قدیمہ اور ثقافتی ورثے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

سماجی و معاشی حقوق

19 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) ملک کے سب سے بڑے ریئل اسٹیٹ ڈویلپرز کی جانب سے کراچی میں زمین کے حصول سے متعلق طریقہ کار کی

فوری اور مکمل تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے اوران اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ریاستی عناصر حقیقی مالکان کوان کی زمینوں سے محروم کرنے کے لئے جابرانہ اختیارات استعمال کر رہے ہیں۔

''غریبوں کی رہائشی ضروریات کو پورا کرنے میں ریاست کی نااہلی اورعدم دلچسپی سے سب واقف ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو کہ یہ مقامی رہائشیوں کی تباہی اور بے دخلی کی قیمت پر با اثر لوگوں کی رہائش کے لئے زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی طاقت کا استعمال کر رہی ہے تو یہ اس سے بھی بڑا المیہ ہوگا۔

''یہ سکینڈل اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ ریاست کا کردار ایک نگران کا ہونا چاہیے جسے اپنے شہریوں کے مفاد کا خیال رکھنا چاہیے۔ شکایت اور تلافی کے موجودہ نظام کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے تا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان غیر قانونی سرگرمیوں کو کیوں نہیں روکا گیا جو کہ ایک اخبار کی جانب سے شائع ہونے والی خبر سے پہلے بھی کوئی راز نہیں تھیں۔

23 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے مردم شماری پر ایک قومی مشاورت کا اہتمام کیا۔

اجلاس کے شرکاء نے مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیں:

☆ حکومت کو چاہیے کہ وہ جتنا جلد ممکن ہو سکے مردم شماری کے ایک حتمی شیڈول کا اعلان کرے۔

☆ مردم شماری کے انعقاد میں رکاوٹ بننے والے سیاسی بحران کو اعلیٰ ترین آئینی فورم یعنی مشترکہ مفادات کی کونسل (سی سی آئی) میں حل کیا جائے۔

☆ مردم شماری کے طریقہ کار میں بہتری کے لیے جدید ٹیکنالوجی، طریقہ کار اور دیگر ممالک کے تجربے سے استفادہ کیا جائے۔

☆ مردم شماری کا انعقاد باقاعدگی سے کیا جائے۔

☆ مردم شماری میں سیاست کو ملوث نہ کیا جائے۔

☆ اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیے کہ اندرونی طور پر بے دخل ہونے والے افراد (آئی ڈی پیز) کو مردم شماری کے لیے اختیار کردہ فارم سے خارج نہ کیا جائے۔

01 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں انسانی

حقوق کی موجودہ صورتحال کے بارے میں سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔حالیہ مہینوں میں جنم لینے والے مسائل کے باعث یہ صورتحال مزید ابتر ہوگئی ہے۔کمیشن کی ایگزیکیٹو کونسل نے کہا: ''اس ماہ کراچی میں رینجرز کے آپریشن کے تین سال مکمل ہو گئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹارگٹ کلنگ اور بھتے کے واقعات میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔تاہم ماورائے عدالت ہلاکتوں اور ایذا رسانی کے واقعات مسلسل سننے میں آ رہے ہیں۔

''شہر میں جبری گمشدگی کی شکایات بڑھ گئی ہیں اور بہت سے لوگوں کو ان کی سیاسی وابستگی کی بنا پر نشانہ بنایا گیا ہے۔حتیٰ کہ سرکاری طور پر قائم کیے گئے تحقیقاتی کمیشن کی جانب سے جبری گمشدگیوں کے حوالے سے جاری کردہ اعداد و شمار بھی ملک کے اس حصے میں اس مسئلے کی وسعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جبری اور غیر اختیاری گمشدگی سے متعلق اقوام متحدہ کے ورکنگ گروہ کی رپورٹ میں بھی جبری گمشدگیوں، بالخصوص ان لوگوں کی جبری گمشدگی کا ذکر کیا گیا ہے جن کی وابستگی متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) سے بتائی جاتی ہے۔

''شہر کے سیاسی امور میں رینجرز کے بڑھتے ہوئے کردار، بالخصوص ایم کیو ایم کو دیوار سے لگانے کے لیے استعمال کیے جانے والے حربوں سے متعلق خدشات بہت بڑھ گئے ہیں۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں، بالخصوص ایم کیو ایم کے عسکری گروہوں کو وقتی طور پر تو خاموش کر دیا گیا ہے مگر انہیں انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا۔کراچی میں بڑے پیمانے پر تشدد کے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ گروہی لڑائی کے اگلے مرحلے کا آغاز کیسے اور کب ہوگا۔

''لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کراچی آپریشن کے ثمرات کو کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔اس حوالے سے یہ بات نہایت اہم ہے کہ مشتبہ افراد اور سزاؤں کی شرح سے متعلق تفصیلات فراہم کی جائیں۔ ایچ آر سی پی کو افسوس ہے کہ شہر میں پولیس کی استعداد کو بڑھانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ہم حکام سے التجا کرتے ہیں کہ وہ کم از کم اب ہی اس جانب توجہ دینا شروع کریں۔

''ملک کے دیگر بڑے شہروں کی طرح کراچی میں نمائندہ اور ذمہ دار نظم و نسق کے فقدان کے باعث لوگوں کے بنیادی استحقاق پر سنگین اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔نظم و نسق کی اس

صورتحال نے شہر میں مقامی حکومت کی کارکردگی کو بھی متاثر کیا ہے۔صفائی کے انتظامات کو مکمل طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ٹریفک کا نظام دن بدن بدتر ہوتا جارہا ہے۔عین اسی وقت لوگوں کے روزگار،خوراک،صحت اورسکیورٹی کے مسائل شدید تر ہو گئے ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کراچی کی صورتحال ہولناک اور مخدوش ہو چکی ہے۔

”مجموعی طور پر ایک مؤثر نظم ونسق کا اظہار اور مقامی حکومت کو موثر طور پر کام کرنے کے قابل بنانا نہایت ضروری ہے تاکہ اس بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پایا جاسکے اور لوگوں کے مسائل حل کیے جاسکیں“۔